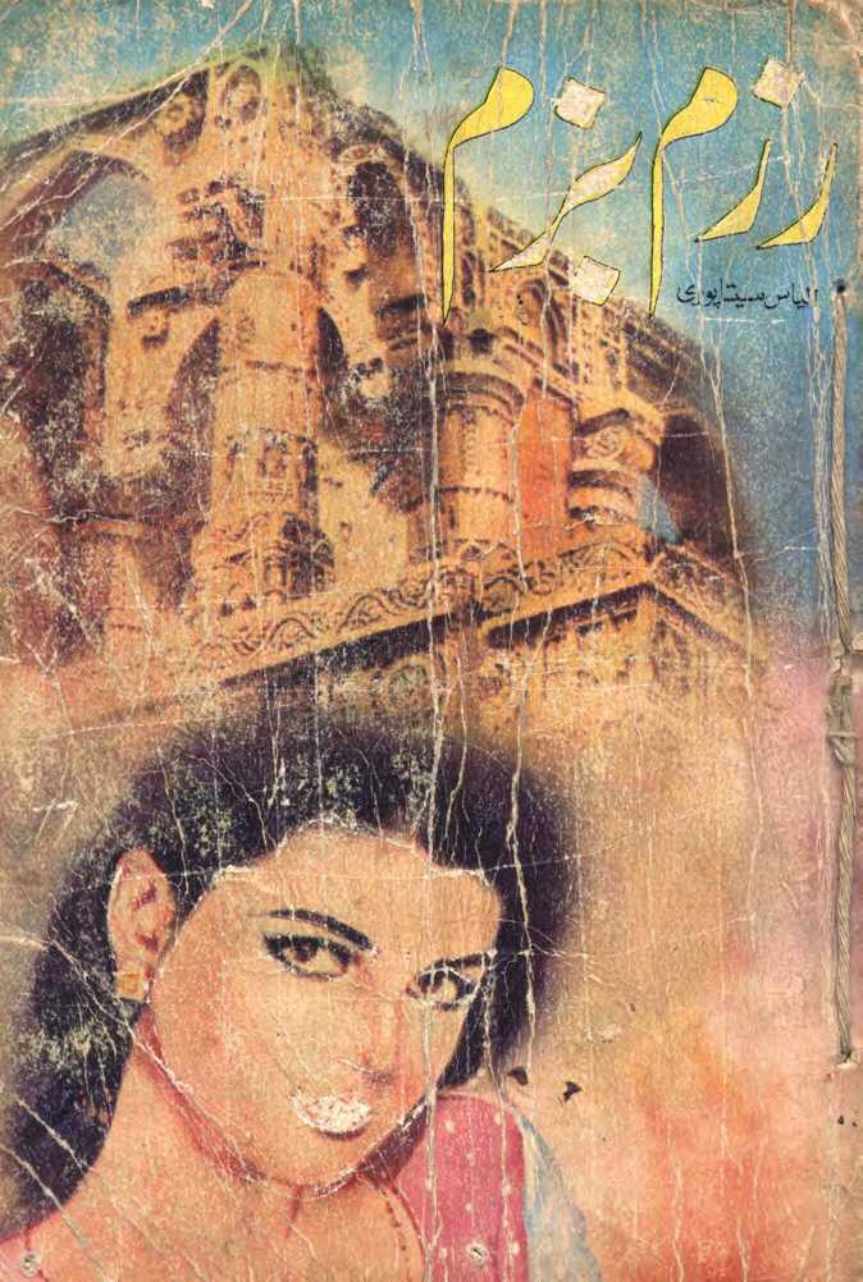


# زمزم

الحیاس سیتاپوری







# رزم بزم

جب ترکی کے نامور فاتح مراد ثانی نے وفات پائی تو بدقسمتی سے اس سالہ بڑا محمد خاں وطن سے دور ایشیا کے کوچک کی مہمات میں الجھا ہوا تھا۔ فاصروں اور تیز رفتار ہرکاروں نے نوجوان ولی عہد کو اس کے باپ کے ساتھ اس کی افسوسناک خبر پہنچا کہ وطن فوراً واپس چلنے کی درخواست کی، محمد خاں نے رونا دینا لے کر کہا اور اڈیا نوپل میں داخل ہو گیا۔

اڈیا نوپل میں بڑے بڑے فوجی عہدہ ہیلہ اور نوجوان ولی عہد کے ساتھ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ سب یہاں اس لئے تھیں جمع ہو رہے تھے عہدہ کی رسم تاج پوشی کی تقریب میں حصہ لے سکیں بلکہ یہ لوگ تھے بادشاہ کی سی اور مصاحبت کی فاطر بڑی بڑی قربانیاں اور کاملاً انجام دے کر اس پر کاد سلطان کے مزاج میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

مرحوم سلطان کی بیوی بھی اپنے آٹھ دس ماہ کے بیٹے کو سینے سے لگائے شاہ کا انتظار کر رہی تھی، یہ ولی عہد کی سوتیلی ماں تھی اور مذہباً عیسائی تھی۔ دیا نے اپنی شرمناک اور فرقت آمیز شکست کے موقع پر اپنی بیٹی کی شادی اوراد ثانی سے کر دی تھی اور اب شاہ سروریا کی بیٹی بڑہ ہو چکی تھی۔ اسے جیسے سلطان کے قریب آنے کی خبریں مل رہی تھیں، خوف سے اس کا دل بیٹھا جا۔ وہ اپنے معصوم بیٹے کو باہر اپنے سینے سے لگا کر بچھڑ لیتی اور پھر خوب پیار کرتی۔ پھر اس کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اپنے مدبر و مددگار لیتی۔ ایت ایت ایت سے کہتی؟ افسوس کہ تو لڑکا ہے، کاش تو بیٹی ہوتا۔ تیرا باپ سر اور تیرا سوتیلی بھائی تاج و تخت منجھالتے اڈیا نوپل میں داخل ہو چکا ہے نئی اہوں کہ تیرا کیا حشر ہو گا؟

بچہ ماں کے درخ و غم سے نا آشنا مسکراتے لگایاں کی آنکھیں سمجھ آئیں۔ اس نے بے اختیار بچے کے گالوں کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ بچے کا دم گھٹا تو وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسی وقت ایک کینز بھاگتی ہوئی آئی اور سروین شہزادی کو مطلع کیا۔

”شہزادی صاحبہ اپنی چہری سرور آپ سے ملنا چاہتا ہے“

شہزادی نے خوفزدہ ہو کر بچے کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں

ڈر سے آبل پڑی تھیں۔ پوچھا: ”یہ چہری سرور آپ کے والد سے کیسے ملے گی؟“

کینز نے جواب دیا: ”والدے اچھے ہوتے تو وہ جبر و زیادتی سے کام نہ لیتا۔ جب آپ کے خدام اور محافظین نے اسے روکنا چاہا تو اس نے دھکی دیا کہ اگر اس کی راہ میں مزاحم ہونے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے سنی چہری دستانے کی مدد سے آپ کے خدام اور محافظین کو قتل کر کے اندر چلا جائے گا۔“

سرو دیا کی بیوہ شہزادی زلمہ و قطار روئے لگی: ”میں جانتی ہوں کہ یہی چہری سرور مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“ اس کے بعد اس نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”وہ مجھ سے نہیں اس بچے سے ملنا چاہتا ہے۔“ پھر کینز سے مواخذہ لے کر بچے میں پوچھا: ”کیا تو اسے چھپا نہیں سکتی؟ تو اگر اسے کہیں چھپا دے تو میں بعد میں تجھے مارا مال کر دوں گی۔“

کینز نے بے بسی سے جواب دیا: ”محضود ملکہ صاحبہ! اگر میری کوئی اطلاع ہوتی تو میں اس وقت اسے آپ کے بیٹے پر قربان کر دیتا، آپ کا بیٹا میں نے یقینی اور اپنا آپ کو دے دیتی۔ آپ میرے بیٹے کو شوق سے اپنی چہری سرور آپ کے حوالے کر دیتیں۔“

شہزادی نے بالورسی سے پوچھا: ”پھر اب میں کیا کروں، میری عقل تو کام نہیں کر رہی، سمجھ تو ہی بتا۔“

کینز نے جواب دیا: ”کسی بھی طرح اس وقت تک اپنے بچے کو بن چہری سرور یا اسی نوز کے دوسرے نوز خواروں سے محفوظ رکھیے جب تک نیا بادشاہ درمہنہ تاج پوشی نہیں ادا کرتا۔“

”پھر پھر کیا ہوگا؟ پھر میں کیا کروں گی؟“

کینز نے جواب دیا: ”جشن تاج پوشی میں آپ بھی شریک ہوں گی آپ اپنے بچے کو سینے سے لگاتے تے بادشاہ کے قریب پہنچ جاتے گا اور اسے تاج و تخت کی مبارکباد دے کر روتے ہوئے اپنا بچہ اس کے حوالے کر دیجئے گا اور کہیں گے کہ اسے

سلطان! یہ تیرے باپ کی امانت ہے اور تجھے پورا اختیار ہے کہ چاہے تو اس امانت کو ایک امین کی طرح محفوظ کر دے ورنہ ماضی کے دوسرے ترک بادشاہوں کی طرح تو بھی اسے ہلاک کر دے کیونکہ ہر نیا ترک حکمران فتنہ و فساد کے قد سے اپنے بقیہ بھائیوں کو قتل کرنا چلا آیا ہے۔“

شہزادی نے سو گوارا آنکھیں اور ہر اٹھا دیں اور سوال کیا: ”تیرا کیا خیال ہے کیا اس طرح سلطان محمد خان اسے معاف کر دے گا؟“

شہزادی صاحبہ، بامکینز نے نکتے کی بات سمجھائی: ”الانسانی مزاج کا اعتبار ہو یا نہ ہو، لیکن بادشاہوں کے مزاج کا واقعی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ بڑی سے بڑی بات کو سن کر گوارا کر لیتے ہیں اور بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی معمولی سی بات پر زندہ کیاں چھین لیتے ہیں۔“

”میں تیری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرنے کو تیار تو ہوں، مگر اس وقت یہی چہری سرحد سے اپنے بیٹے کو کس طرح بچاؤں؟“

کینز نے خدا کے نام پر اطمینان دیا، اب میرے پاس اتنا فالتو دارغ نہیں ہے کہ جو بات میرے بس کی نہیں ہے اس میں بھی بلاوجہ سرکھپاؤں۔ یہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے اس پر جس درد مندی اور قلق سے آپ سوچیں گی، میں نہیں سوچ سکتی۔“

شہزادی سہم کر چپ ہو گئی۔ وہ اسی نے قید گئی کہ اگر اب وہ زیادہ اصرار کرے گی تو کہیں یہ کینز اس جہی چری سرحد کو لے کر ہی نہ آجائے کیونکہ جس ذات سے ان خدام اور کینزوں پر اس کا اعتماد اور تعجب قائم تھا وہ نہ محنت ہو چکا تھا اور اب وہ مرتا پا انہی کمرہ داروں کے رحم و کرم پر زندہ تھی۔

شہزادی نے اپنے بچے کو غمزدگی میں چھپایا اور محل میں اس گوشے کی تلاش میں نکل گئی جہاں وہ اپنے معصوم کو میں چری سرحد سے بچا سکتی تھی۔ ابھی وہ چہرہ کرے بھی نہ طے کر سکی تھی کہ میں چری سرحد اس لیے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے شہزادی کو ڈانٹ دیا: ”کہاں جاتی ہے اندامراد عورت! میں کہتا ہوں بٹھہر جا۔“

شہزادی سہم کر ترک گئی اور اس نے اپنے بچے کو مضبوطی سے بھینچ لیا اور شاہد کرتی ہوئی بولی: ”میں چری سرحد! میں تمہارے قدموں میں گر جانے کو تیار ہوں خدا کے لئے تم مجھ سے میرے معصوم کو قتل چھینو۔“

جہی چری سرحد شہزادی کے سر پر پہنچ چکا تھا، اس کے گول سر تنگ پٹائی

کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں سفاکی اور بے رحمی اس طرح عیاں تھی جیسے کسی حبشی کے سیاہ چہرے پر دوڑتے موٹے ہونٹوں کے درمیان سفید سفید دانت۔ اس نے شہزادی کو محکم دیا۔ سرویا کی شہزادی! مجھے معلوم ہے کہ تو مرحوم بادشاہ کی بیوی رہ چکی ہے لیکن اب وہ بادشاہ چہرہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہے اس لئے اب ہم سب کی وفاداریاں نئے سلطان محمد خان کی طرف منتقل ہو جائیں گی اور اگر خدا نے تجھے خدا سی بھی عقل دی ہے تو تجھے بھی اپنے نئے بادشاہ کے لئے قربانی دینی چاہیے۔“

شہزادی کی آنکھیں برسے لگی تھیں اس نے ٹیڈیائی آنکھوں سے بنی چری سردار کی طرف دیکھا مادر کہا: ”بنی چری سردار! میں اپنے نئے سلطان پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں لیکن اپنے معصوم بے گناہ کو کوئی گزندہہ گزندہہ پہنچے دون کی؟ بنی چری سردار کے بچے کی گردن پکڑ لی۔ بولا: ”اے چھوڑ دے ورنہ یہ تیری گردن ہی میں ہلاک ہو جائے گا۔“

اس شور و غل اور دوا دوا میں محل کے خدام اور محافظ بھی پہنچ گئے ان میں شاہی قربان دار بھی تھے۔ بنی چری سردار نے ان سب کو ڈانٹ دیا: ”تم سب اپنی اپنی جگہوں پر چلے جاؤ۔ نیا بادشاہ کسی بھی قیمت پر اپنی حکومت کے اسی رقیب کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس لئے ایک وفادار ملک خوار کی حیثیت سے یہ میرا فرض ہے کہ میں کسی فرمان سے پہلے ہی یہ رعایتی اور رسمی قانون یا فرض بجالاؤں۔“

ایک محافظ آگے بڑھا اور اس نے بنی چری سردار کو دھکا دے کر بچے کی گردن اس کی گرفت سے پکڑ لی، بولا: ”بنی چری سردار! میں جانتا ہوں کہ تم لوگ بادشاہ کے کتنے وفادار اور جاں نثار ہوتے ہو، لیکن شہزادی کی طرف سے میں تم سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ تم اس معصوم بچے کو کم از کم اسی وقت تک زندہ رہنے دو جب تک کہ نیا سلطان خود اس سلسلے میں اپنا کوئی فیصلہ نہ صادر کر دے۔“

شہزادی نے شکریہ ادا کرنے سے اپنے حمایتی کا فطرتاً دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

بنی چری سردار ایک دم مشتعل ہو گیا۔ بولا: ”حق! کم حیثیت چرکیا تیری یہ مجال کہ تو میرے رفیق منصبی کی راہی میں میری مخالفت کرے یا اس میں ٹانگ اڑاتے ہیں شے یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“

حافظ نے کہا: "میں بھی اس عمل کا محافظ ہوں اور میرے ذمے بھی کچھ فرائض منصبی ہیں۔ تیرا کیا یہ خیال ہے کہ میں ان کی بجا آوری میں غفلت یا کوتاہی برتوں گا یا تجھ سے مرعوب ہو کر بتدریج دیکھا جاؤں گا؟"

بنی چمری سردار نے ایک نادر دار سیٹی بجاتی اور محافظ کو حکم دیا: "تو مجھ سے دس قدم دھڑھٹ جا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی۔"

حافظ نے بھی اپنی تلوار ٹھونٹ لی اور بنی چمری سردار کو لکلا: "آہا اور لاہی شکر حرام، میرے اندر سے دل یہ گواہی دے رہا ہے کہ میں تیرے حق میں قصاصت مبرا ثابت ہوں گا۔"

بنی چمری سردار ہسکرایا اور بولا: "ہو سکتا ہے تو بہاوری میں کچھ زیادہ ہو، احد میں تیرا ہم پلہ نہ لکوں، لیکن یہ طے ہے کہ میں اپنے تجربوں میں بہت آگے ہوں اور اس کا فوری ثبوت تجھے اسی رقت اسی جگہ مل جائے گا۔"

حافظ نے حکم دیا: "تم ٹھا ہی عمل سے نکل جاؤ، اس کے بعد عزم ہو گا دیکھا جائے گا۔"

بنی چمری سردار نے تعجب سے کہا: "یہ تیری اہمیت کہ تو مجھے عمل سے نکل جانے کا حکم دے، خوب خوب؟"

حافظ نے اچانک اپنی تلوار کی نوک بنی چمری سردار کے پیٹ میں چبھادی، بولا: "بس اب تم یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ یاد رکھو کہ جو تلوار تمہارے پیٹ کی جلد پر دک گئی ہے وہ اندر بھی باسکتی تھی لیکن نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔"

بنی چمری سردار بولا: "بس خدا ویر اور میرے مہربان دوست اس کے بعد تم جو کچھ بھی کہو گے میں اس کی حرفہ بہ حرفہ تعمیل کروں گا۔"

حافظ کو بنی چمری سردار کی خوشامد سے رحم آگیا۔ بولا: "بہتر ہے میں تجھے چند بیس بیس دیتا ہوں، تو ان لمحات میں یہاں سے چلا جا ورنہ میں اس کے بعد جو قدم اٹھاؤں گلشاہ تو اس کے لئے ابھی سوچ بھی نہ سکے۔"

شہزادی اپنے بچے کو لے کر جانے لگی۔ بنی چمری سردار چیخا: "اسے روکو، یہ ابھی نہیں دے گا۔"

حافظ نے جواب دیا: "اب ان کی یہاں کوئی سندسوت نہیں انہیں ہم دونوں کے حاضے سے جٹ ہی جانا چاہیے۔"



اچانک محل کے مختلف گوشوں سے شدید غل بلند ہونے لگا۔ اور بھاگ دھڑکتے  
 گئی۔ چیخ پکارا آگہا دہکا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لوگ کسی مصیبت سے بچنے کے لئے اپنی  
 اپنی جانیں بچا کر بھاگتے پھر رہے ہیں، محافظ کی توجہ چیخ پکار کی طرف منعطف ہو گئی  
 یعنی چری سردار نے اس کی اس غفلت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور پیچھے سے تلوار کا ایک  
 بھر پورا ہاتھ دھری کر دیا۔ اسی وقت حلف حاصل سے بہت سارے یعنی چری اپنی  
 خون آلود تلواریں اٹھاتے یعنی چری سردار کے پاس پہنچ گئے۔ ایک یعنی چری سے زبردور  
 سے پہنچے ہوئے تھا۔

”سردار! تمہاری سیٹی کی آواز سنتے ہی میں کسی روک ٹوک یا مزاحمت کی پرواہ  
 کرتے بغیر محل میں داخل ہو گیا۔ اور جس محافظ یا نگراں نے ہمارا استدھار کرنے کی کوشش  
 کی کہ ہم حب اندر نہ داخل ہو سکیں لیکن ہم نے ان کا محاصرہ توڑ کر اندر نہیں قتل اور  
 زخمی کرتے آہستہ تمہارے پاس آئے“

یعنی چری سردار نے زخمی محافظ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی کام اس  
 نے بھی کیا تھا لیکن اسے میں نے تقریباً دوسری دنیا میں پہنچا دیا ہے“ پھر اچانک شہزادی  
 کی طرف دیکھا اور جاچکی تھی۔ یعنی چری اس سمت بھاگا جہاں شہزادی تیر تیز قدم اٹھاتی  
 حمام کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یعنی چری سردار نے شہزادی کو گدس کے بالوں سے پکڑ لیا  
 ”کھڑ جاؤ نا پہنچا بہت عورت! میں تجھے حکم کچھ دیتا ہوں اور تو عمل کچھ اور کرتا ہے  
 کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ اس محل کی مورتی دیواریں مضبوط دیواروں سے اور تنگ یا کشادہ  
 کمرے تیرے بچے کو چھپا لیں گے؟ کبھی نہیں کبھی نہیں“

شہزادی رونے لگی۔ ”یعنی چری سردار! خدا کے لئے رحم کرو“

یعنی چری سردار نے بالوں کو ایک زبرد کا جھکا دے کمرہ میں پکڑ کر ادیا اور بچے کو  
 زبردستی اس کی گودے چھین لیا۔ شہزادی اتنی زبرد سے چینی کہ گویا اسے زنجیر کر دیا  
 گیا ہے، اس نے بے بسی میں اپنا سر تکی بار زمین پر دے دیا، جس سے اس کی پیشانی  
 ہونہان ہو گئی۔

یعنی چری سردار بچے کو لے کر حمام میں گھس گیا۔ پتہ بھی زبرد زبرد سے مدد تھا  
 ہونہان ان دونوں کے پیچھے دوڑی لیکن جب وہ حمام کے دروازے پر پہنچی تو وہ بند  
 ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا سر دروازے سے جھکنا شروع کر دیا۔

یعنی چری سردار نے پانی کے حوض میں بچے کو ڈال کر کہا اٹھو کی مدد سے تمہ

سے لگا دیا اندر پھر دہانے ہاتھ سے اس کے پیٹ کو دبا کر اسے تہہ سے لگاتے رکھا۔ بچے نے ہاتھ پیرا دنا شروع کر دیئے۔ مدد کرنے کے لئے منہ کھولا تو ناک کے ساتھ ساتھ منہ سے بھی پانی اندر جانے لگا۔ حوض کی سطح پر پانی کے بلبلے نمودار ہوتے جو ہندوستان کم ہوتے چلے گئے۔ ادھر بچے کی قوتِ مدافعت بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ یعنی چہری سردار کو جب بچے کی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے اسے حوض سے باہر نکال لیا۔ بچے کا پیٹ پھول چکا تھا۔ دونوں آنکھیں بند تھیں۔ لیکن اس پاس کمریہ کے آثار اس رقت بھی پلٹے جاتے تھے۔ منہ میں جمع پانی دونوں ہاتھوں سے بہہ نکلا۔ وہ حمام سے باہر نکلا تو سپردِ جودوں پر نیم ہندویش شہزادی کو بٹھا ہوا دیکھا۔ اس نے مردہ بچے کو شہزادی کے جسم پر پھینک دیا۔ اندر کہا: "تو منہ نکال اپنے بچے کو، دیکھ اس میں کوئی شے تو نہیں رہی۔ اس کے سارے اعضا موجود ہیں نا؟"

ادھر سے ملے پرنگے کی درجہ سے بچے کا پیٹ دب گیا۔ جس سے منہ سے پانی بہہ نکلا۔ شہزادی کو کچھ ہوش نہ تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ اس نے اس مردہ ہوشی میں بھی محبت کی گیم جوشی سے بچے کو سینے سے لگالیا۔ وہ جیسے جیسے اسے پھینچ رہی تھی پیٹ کا پانی منہ سے اسے ٹکلیوں کی طرح ابل ابل کر باہر نکل رہا تھا۔

\*

\*

\*

شہزادہ محمد خان انڈیا انپل کے محل میں داخل ہوا تو لڑکے سلطنت اندر فوجی عہدے دار اسی نے گمردہ پیش جمع ہو گئے۔ ان سب کا خیال تھا کہ شہزادہ ابھی تو عمر افنا تجربہ کا ہے اس لئے اس پر قابو پا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یعنی چہری سردار نے سب سے پہلے نان و سخت کے دارلث کو خوش آمدید کہا اور دعاؤں دیتا ہوا بوللا۔ شہزادے: "آپ کتنے خوش قسمت ہیں کہ اس نو عمری امی میں آپ کو وہ شے مل گئی جس کی تمنا میں لوگ اپنی پوری زندگی گزارا، بحسرت دیا اس چلے جاتے ہیں۔"

شہزادے نے ترشی سے جواب دیا: "بے ادب، موقع ناشناس سردار! سب سے پہلے تجھے دالہ مرحوم کی مجھ سے تعزیت کرنی تھی، اس کے بعد جشنِ راجپوتی پر یہ مبارکباد بھی پیش کر دیتا!"

یعنی چہری سردار ڈر مرخا ہوش ہو گیا۔

جشنِ راج پوتی کے موقع پر محل اور شہر کے دروازے سجا دیئے گئے لوگوں

کے چہروں پر شگفتگی اور مسرت کھیلنے لگی۔ یہ شہزادہ اپنے باپ کی زندگی میں بھی دو بار تخت نشین ہو چکا تھا۔ اس کا باپ مروثانی کا مددگار سلطنت سے اکتا کر دو بار گوشہ نشین ہوا اور حکومت اپنے بیٹے کے حوالے کر دی ان دنوں شہزادے کی عمر سولہ سال کی تھی، جب پڑوس کی عیسائی حکمرانوں کو مروثانی کی گوشہ نشینی اور نا تجربہ کار اور نوجوان شہزادے کی سلطانی کی خبریں ملیں تو انہوں نے مراٹھا نانا شروع کر دیا۔ مروثانی بدرجہ جمہور کی گوشہ سے باہر آگیا اور سرکش قندہ جو، اور بد عہدہ عیسائی حکمرانوں کو سزائیں دے کر پھر خلعت گزین ہو گیا، اور اقتدار ایک بار پھر شہزادہ محمد کے ہاتھ میں چلا گیا۔ دشمنوں نے پھر سراٹھایا اور مروثانی نے انہیں ایک نابہ پھر عبرت ناک حجازی شہزادے نے دونوں ہی مرتبہ کا مددگار سلطنت جس طرح انجام دیا تھا اس سے دوست اور دشمن بھی سمجھ بیٹھے تھے کہ بیٹے میں باپ جیسی صلاحیتیں نہیں ہیں اور اس کی ذات سے عمال سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جاتے گا۔

اگرچہ نرپل میں شہزادے کے خود اپنے آدمی بھی کچھ اسی قسم کی رتے رکھتے تھے۔ ایک امیر نے جب لفظوں میں یہاں تک کہہ دیا کہ ”اب ہمیں کسی اور مددگار کا رخ کرنا چاہیے کیونکہ ایک کس سالہ نوجوان تجربہ کار بادشاہ کی چاکری میں آئے ہوئے کا بوجھ حملہ کے لئے عزت و آبرو کی بات نہیں رہ گئی ہے“

دوسرے تیس بیٹیس مرالہ امیر نے کہا ”حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہمیں کسی اور مددگار میں جانے کے بجائے ہمیں قسمت آزمائی کرنا چاہیے چاکری چاکری اسی ہے وہ کسی عمر رسیدہ بادشاہ کی چاکری ہو، یا چھ ماہ کے انگوٹھا چوستے معصوم حکمران کی چاکری ہو۔ آدمی کی انا اور غمخواری تو دونوں ہی جگہ تباہ دہر باد ہو جاتی ہے“

کسی تیسرے تجربہ کار نے کہا ”اگرچہ بوجھ تو اس نوجوان سلطان کی چاکری میں زیادہ فائدے ہیں کیونکہ ہمارا تجربہ اس کی نا تجربہ کاری پر ہمیشہ حادی رہے گا اور ہم اس سے مفید طلب فائدے اٹھا سکیں گے“

کسی اور نے تیسرے کی تائید میں کہا ”میں اپنے ان بھائی کا ہم خیال ہوں، ہمیں نا تجربہ کار سلطان کی بیعت میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے“

محمد خان کے مشن تاج پوشی کے موقع پر سب کا ودیہ والوں کا ہجوم لگ گیا۔ نذرانے پیش کئے گئے۔ دعاؤں کی گنتیں، قصیدے پڑھے گئے اور شہزادے تک کو نرپل دتلیات بجالائے۔

شام کے وقت مردوں کو حصہ خاص سے باہر نکال دیا گیا، اور عورتوں کو مشرف باہر باہی بخشا گیا، باہری عورتیں نئے بادشاہ کے مدبر و جاتیں اور چند دعا تیبہ مبارکبادی کے کلمات ادا کر کے بادشاہ کے دلہنے ہاتھ کی ہتھیلی کی پشت کو پوس کر دوسری کے لئے راستہ چھوڑ دیتیں اور لئے پاؤں دالیں چلی جاتیں۔ انہی میں مردیا کی شہزادی اپنے خود مرد سالہ بیٹے کے غم کو سینے سے لگاتے آگے بڑھی اور بادشاہ کو تاج و تخت سنبھالنے کی مبارکباد پیش کی اس وقت اس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور کپڑوں میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور آواز میں اندھا دلی کے ساتھ ساتھ بھرا ہٹ بھی شامل تھی۔ اس نے نئے بادشاہ سے کیا کہہ کر انہیں خود اسے بھی پوس دیا تھا۔

سلطان محمد نے پوچھا کہ تم غم کی باتیں کر رہی ہو، مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اتنی آدہ روہ کیوں ہو؟

شہزادی نے اصل غم کو چھپانا چاہا، بولی: "نورجان بادشاہ! کیا مجھے اپنے باپ کی وفات کا غم نہیں ہے اور میں تو اس کی بیوی تھی اس کی موت کا غم جتنا مجھے ہے بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو اتنا درد نہ ہو گزرتا تھا نا پڑا ہو گا؟"

سلطان نے اس کی خالی آغوش کو دیکھ کر سوال کیا: "تمہارا بیٹا کہاں ہے؟"

شہزادی تڑپ گئی۔ بولی: "بادشاہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ یہاں جب ایک شہزادہ برسرِ افتاد آتا ہے تو اس کے بقیہ بچائی میں دنیا سے رخصت کر دیئے جاتے ہیں۔ میرا بیٹا بیٹا بھی نے بادشاہ پر قربان ہو گیا؟"

اتنا کہہ کر شہزادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سلطان محمد نے بے چینی سے پوچھا: "لیکن اسے ملا کیس نے؟ میں نے تو اس بات کا کسی کو حکم ہی نہ دیا تھا؟"

شہزادی نے نیکیوں میں جواب دیا: "میری چری سرور کہتا تھا کہ وہ تم کی کے عثمانی بادشاہوں کی یہ رسم اس لئے ادا کر رہا ہے کہ مہربان بادشاہ یہ خبر سنے گا تو بہت خوش ہو گا؟"

سلطان محمد حیران: "وہ سرور کہاں ہے؟"

"اپنے بیرک میں"

بادشاہ نے زور زدہ سے تالی بجائی اور حکم دیا: "میری چری سرور کو فوراً حاضر کیا جائے؟"

خادم واپس چلا گیا اور بادشاہ مدعی ہوئی اپنی سوتیلی ماں کو تسلیاں دینے لگا۔ بلکہ میں اس بچے کو کس طرح قتل کر سکتا تھا وہ ابھی آٹھ دس ماہ سے زیادہ عمر کا تو نہیں تھا، پھر میں اس سے کیوں ڈرتا، وہ میری حکومت کے لئے وبال و جان بنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا تھا؟

شہزادی کی چیخ نکل گئی۔ "بادشاہ! ان تسلیوں سے میرے زخم ہرے ہوتے جاتے ہیں، خدا کے لئے مجھے تسلیاں نہ دیجئے؟"

کچھ دیر بعد مینی چری سرور بھی آگیا، سلطان محمد نے خشمناک لہجے میں پوچھا۔ "تجھے یہ حکم کس نے دیا تھا کہ نو آٹھ دس ماہ کے معصوم کو بے دردی اور سفاکی سے ہلاک کر دے؟"

مینی چری سرور نے کہا: "کسی نے بھی نہیں، بلکہ عثمانی حکمرانوں میں یہ قانون ایک عرصے سے چلا آ رہا ہے کہ ہر سر اقتدار شہزادے کے علاوہ سبھی شہزادوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ میں نے اس قانون پر عمل کیا ہے اور یہ جو کچھ بھی میں نے کیا ہے بے بادشاہ کی فلاح و بہبود میں کیا ہے؟"

بادشاہ نے پوچھا: "اور تو اس غیر معمولی کا دنائے کی انجام دہی پر انعام و اکرام کا شہناشمنہ نہ بھی ہو گا؟"

"بجا طور پر اگر مزاج عالی میں آجاتے۔"

بادشاہ نے ایک بار پھر تالی بجائی اور حجب خدام حاضر ہوئے تو انہیں حکم دیا: "مینی چری سرور کو فوراً قتل کر دیا جائے۔"

مینی چری سرور چیخا: "حضرت والا رحم!"

بادشاہ نے غصے میں کہا: "رحم ان پر کیا جاتا ہے جو خود بھی رحم کرتے ہیں؟" مینی چری سرور چیختا چلا تا اور دھواں دھواں تار شاہی خدام اسے پکڑ کر باہر لے گئے جہاں جلاد نے اسی وقت اس کی گردن اڑا دی اور خدام نے اس کا سر طشت میں رکھ کر سلطان محمد کے مدبر و رئیس کو دیا اس کے نفرت سے سر کی طرف دیکھا اور حکم دیا اس کے سر اور جسم کو بیکر مار موند میں پھینک دیا جائے۔

شہزادی کی آنکھوں میں اس وقت خوشی کے آنسو بھی تھے اور غم کے بھی۔ بادشاہ نے اس زخمی محافظ کو وہیں طلب کر لیا، جس نے مینی چری سرور کا مدبر مقابل کیا کہ نہ زخم کھایا تھا بادشاہ نے اسے شاہنشاہی دی اور انعام و اکرام سے بھی نوازا۔ آخر میں پوچھا

”تو ادا کیا چاہتا ہے؟ بتانا کہ تیری وہ خواہش بھی پوری کر دی جائے!“  
محافظ نے درویدہ نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھا، سلطان محمد نے  
اس کی چھری پکڑ لی، لیکن شہزادی نے نظروں ہی نظروں میں اس سے کیا کہا۔ بادشاہ یہ  
نہیں سمجھ سکا۔

محافظ نے خوفامرد عرض کیا: ”حضور دالا! میں سر دیا کا رہنے والا ایک غریب  
الہیاد شخص ہوں، مجھے شہزادی صاحبہ کے ساتھ یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ایک عرصے  
سے میں نے اپنے دطن اندر اپنے اغتراء کی شکلیں نہیں دیکھیں۔ اب اگر حضور اجازت  
مرحمت فرمادیں گے تو بڑی مہربانی اور بادی نوازی ہوگی۔ ورنہ تیرے لیے کچھ  
قناعت کر لوں گا۔“

ہوشیار بادشاہ نے شہزادی سے پوچھا: ”اور تم کیا چاہتی ہو؟“  
شہزادی نے جواب دیا: ”میں بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے دطن کی آب و ہوا میں  
سانس لینا چاہتی ہوں۔“

بادشاہ نے محافظ کو حکم دے دیا: ”تم ایک سال کے لیے سر دیا جاسکتے ہو۔ اور  
سر دیا کی شہزادی تم اتم ابھی۔۔۔ یہیں بھی نہیں جاسکتیں انہوں نے کہ تمہیں علامات کا  
چہارہ دیواریوں ہی میں رہنا پڑے گا۔“

اس حکم سے دونوں ہی کے چہرے لٹی ہو گئے۔ سلطان محمد کو کچھ ایسا محسوس  
ہوا گویا کہ ان دونوں میں کوئی ایسا معاہدہ ضرور ہو چکا ہے جس کی مدد سے ان دونوں کو  
ایک ساتھ سر دیا پہنچنا چاہیے۔

بادشاہ نے پوچھا: ”تم دونوں کو میرا یہ فیصلہ منظور ہے یا نہیں؟“  
شہزادی نے جواب لیا: ”مجھے منظور ہے۔“ اس کی آواز میں بڑی بڑی غصہ تھا،  
بے بسی تھی اور حالات سے سمجھوتہ کر لینے کا ایک ایسا سلسلہ انداز پایا جاتا تھا اس کے بعد  
بادشاہ نے محافظ کی طرف دیکھا۔ اس عرصے میں شہزادی نے نہایت ہوشیارانہ سے اپنا  
سرفی میں ایک طرف اٹھا کر شاہ سے محافظ سے کہہ دیا کہ، تم بھی بادشاہ کی تجویز  
مان لو۔

محافظ نے کہہ دیا: ”حضور والا! مجھے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“  
میں سر دیا جانا چاہتا ہوں۔“

بادشاہ نے اسی وقت اسے چلے جانے کی اجازت دے دی۔

محافظ دس بار سے باہر نکلا تو بادشاہ نے اسے ایک بار پھر بلوایا اور کہا: "اور ہاں  
دیکھنا اندازہ اور سفر کا خرچہ تم شاہی خزانے سے لو گے؟"  
محافظ نے بادشاہ کو دعائیں دیں اور الٹے قدموں واپس ہوا۔

\*

\*

\*

رات کے سناٹے میں محل کے موٹے موٹے ستونوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے  
کی مشہورادی تک پہنچ جانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جبکہ جگہ قد آدم شمع دانوں میں روشنی  
اور یہی شخصیں جس سے محل کے تمام گونے مندر تھے۔ سچے عورتوں میں غلام گمشتوں میں مندر  
یہی شخصیں ایک ستون کے سہارے مرد بہرے طرہ عورتیں اپنی اپنی پشتیں پر کیا سے مگر شیشوں  
میں باتیں کر رہی تھیں۔ اسی عالم میں ایک طرف سے ان کی انصر محافظ مندر ہوتی ان  
کے ساتھ ایک اور عورت تھی، جب یہ دونوں بالترقی عورتوں کے سر پہ پہنچ گئیں تب ان  
دونوں کو ہوش آیا اور وہ ایک دم کھڑی ہو کر مختلف سمتوں میں بھاگنے لگیں۔ انصر  
خاتون نے ان دونوں کو لگا کر کہاں بھاگ رہی ہو، ٹھہرنا تو یہ تم بہرہ دے رہی تھیں یا  
ستون کے سہارے آرام کر رہی تھیں؟

لیکن دونوں میں سے کسی ایک نے بھی جواب نہ دیا۔ اور کچھ پہنہ چلا کہ وہ دونوں  
بھاگ کر گئیں کہاں۔ انصر خاتون نے اپنی ساتھی عورت سے کہا: اب تم نہایت خاموشی سے  
مشہورادی کے درپردہ تک دے کر اندر جا سکتی ہو۔

اس عورت نے سر در خاتون کا شکریہ ادا کیا اور اس کی پہلی ہی دستک پر مشہورادی  
کے محل کا دروازہ کھل گیا یہ دروازہ مشہورادی نے خود کھولا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو  
دیکھ کر مسکرا رہے مشہورادی کو بہت زیادہ ہنسی آرہی تھی۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا: "انجیل! میں حیران ہوں کہ تم خواتین کا لباس پہن کر  
محل کے وہ محافظ نظر ہی نہیں آتے ہو جس نے چند دن پہلے بی چری سر در کو سراہا  
کہ دیا بھلا تم تو بالکل عورت نظر آ رہے ہو؟"

انجیل نے محافظوں کی سر در خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: یہ سب کچھ  
ان کی مہربانی سے ہو رہا ہے یہ اگر نہ چاہیں تو میں یہاں تک کبھی بھی نہ آ سکتا تھا۔ اور خاص  
کمران حالت میں کہ میں اب محافظ کا منصب بھی نہیں رکھتا اور رات کے اندھیرے میں تو  
محافظ کی حیثیت سے بھی میں آپ کے محل میں نہیں داخل ہو سکتا تھا؟

سرور خاتون نے دریافت کیا: "حضور شہزادی صاحبہ! میں کتنی دیر بعد واپس آیاؤں؟"

شہزادی نے جواب دیا: "دو گھنٹے بعد۔"

سرور خاتون نے عاجزی سے کہا: "خدا کے لئے احتیاط سے کام لیجئے گا ورنہ میرا خاندان تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔"

شہزادی نے کہا: "تو بے فکر رہ۔"

سرور خاتون چلی گئی۔ شہزادی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور واپس آتی ہوئی بولی: "ایجنل! میں نے تمہیں یہاں تک لانے کے عوض اس سرور خاتون کو ایک معقول رقم دی ہے۔ یہ بہت لاپرواہی لوگ ہیں۔ میں تو اس ماحول سے تنگ آ گئی ہوں۔"

ایجنل شہزادی کو بڑی حیرانہ نظر دے دیکھ رہا تھا۔ شہزادی نے اسے اپنی خوب گاہ سے دھندہ ہی رکھا اور ایک ایسے کمرے میں لے چلی گئی جہاں رقص و سرود کی محفل جاگ رہی تھی۔ شہزادی خود توجہ نہ لینے نہ تے پر بیٹھ گئی، وہیں پر دیزینکین نرم و ملائم گتہ اور گتے پر خوبصورت لٹھی چادر بھی تھی۔ شہزادی گتے میں دھنس سی گئی۔

ایجنل نے شہزادی کے قریب بیٹھنے کا جسارت کی تو وہ بھڑک اٹھی، اسے جینے سے کھڑی ہو گئی، بولی: "خبردار، ایسی جسارت بھی نہ کرنا کچھ بھی سہی، لیکن میں نرکی کے نامور فاتح مراد شاہی کی بیوی رہ چکی ہوں اور سوچو وہ تو جوان بادشاہ میرا سوتیلایا ہے۔ جب تک میں اس محل اندر نہ نرکی کی سزا میں پرہیزوں ان کی عزت و آبرو کا خاص خیال رکھوں گی۔" ایجنل کھسکا گیا، سامنے کی منقش کمرے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"کہا میں اس پر بیٹھ سکتا ہوں؟"

"ہاں اس پر بیٹھ جاؤ،" شہزادی دوبارہ گتے میں دھنس گئی۔

ایجنل کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی طبیعت میں تلک نہ پیدا ہو گیا ہے۔ شہزادی نے بھی اس کی یہ کیفیت محسوس کر لی لیکن ایسی ہی نہی گریا کچھ جانتی ہی نہ تھی۔ ایجنل نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا: "میں سرور خاتون سے جا رہا ہوں، وہاں کے لئے کوئی خاص پیغام؟"

شہزادی نے جواب دیا: "ہاں وہاں بتا دینا کہ شہزادی کی گورہ حیرا اجاڑ دی گئی اور نرک قوم کی مہار ایک نابالغ بچے لے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ عینرت مند مسیحی چاہیں تو باہم متحد ہو کر اپنی سابقہ بے عزتیوں کا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ایسے موقع بار بار



نہیں ملے۔“

اینجیل نے شہزادی کے کسے ہوئے جسم پر لباس کی سلوٹوں کے نیچے نشیب و فراز کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن انہیں ایک جھلک سے زیادہ نہیں دیکھ سکا۔ اس وقت وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ اتفاق اور وقت کے ہاتھوں سے یہ شرف حاصل ہو گیا کہ شہزادی کی خلوت اور رات کی تاریکی میں اسے شہزادی کا قرب ملا اور باتیں کرنے کی آزادی ہاتھ آگئی۔ اس نے شہزادی سے سوال کیا: ”محترم شہزادی صاحبہ! کیا آپ کو سروریا نہیں یاد آتا؟“

شہزادی نے جواب دیا: ”یاد کیوں نہیں آتا لیکن یاد آنے سے کیا ہوتا ہے، میں وہاں پہنچ تو نہیں سکتی۔“  
اینجیل نے کہا: ”فدا ہمت کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو سروریا پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہوں۔“  
شہزادی نے کہا: ”ہاں، لیکن ہدایت خود میں جو دی سے بھاگنا پسند نہیں کرتی۔“

اینجیل کسی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بار بار شہزادی کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کمرے کی اشیاء اور شہزادی کے معطر لباس کی بھینٹی بھینٹی خوشبو اینجیل کی آتشِ شوق کو بھڑکاتے دے رہی تھی۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔  
شہزادی نے کہا: ”سروریا والوں سے کہنا کہ ان کی بیٹیوں کا ایک قرض ان کے ذمے واجب الادا چلا آ رہا ہے، اب وقت آ گیا ہے کہ وہ یہ قرض ادا کریں۔“  
اینجیل نے نظریں شہزادی کی طرف اٹھا دیں، بولا: ”لیکن شہزادی!“  
شہزادی نے بات کاٹ دی۔ بولی: ”وہ قرض یہ ہے کہ اب تک فاتح ترکوں کو انہوں نے اپنی لڑکیاں دی ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ وہ ترکوں کی لڑکیاں اپنے گھروں میں لے جائیں۔“

اینجیل نے شہزادی کے سرخ و سفید رخساروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”آخر سروریا والوں نے ان سرخ و سفید رخساروں کو ترکوں کے لہڑھے سلطان کے حوالے کیوں کر دیا، ایک ایسا شخص، جس کے جسم سے کافور کی بو آ رہی تھی ان گلاب کے پھولوں جیسے رخساروں کا کسی طرح حقدار ٹھہر سکتا تھا۔“  
شہزادی تنگی سے بولی: ”تم پھر پہنے لگے۔ ہوش میں آؤ اینجیل اور سوچو کہ تم

کس سے مخاطب ہو؟  
ایجنل نے کہا: ”ادریہ پنکھڑیوں جیسے لب بعلین، سر دیا والوں نے ان کا بھی کوئی خیال نہ کیا؟“

شہزادی نے ڈیپٹ کر کہا: ”اگر تم نے اپنی بات چیت کا موضوع نہ بدلا تو یقین کر لو کہ میں تمہیں یہاں سے اسی وقت نکال باہر کر دوں گی۔“  
ایجنل اتنا دلفرت ہو رہا تھا کہ عقل کی مصلحت بیٹی مغلوب ہو گئی تھی اس نے عالم سوائزی میں کہا: ”میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شہزادی صاحبہ جب آپ خود سر دیا جانے پر آمادہ نہیں تو پھر میں کیوں جا رہا ہوں؟“  
شہزادی ایجنل کی باتوں سے خوف زدہ ہو رہی تھی پوچھا: ”کیا تم نے میری باتیں سن لیں؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”جس لیکن یہ قسمتی سے وہ سب یاد نہیں رہا۔“  
شہزادی نے ایک بار پھر اپنی سابقہ باتیں دہرا دیں لیکن ایجنل شاید بھڑکھڑ نہیں سن سکا تھا۔  
شہزادی کھڑی ہو گئی، بولی: ”میں تالی بجا کر سرسرا خانوں کو بلانے لیتی ہوں تا کہ وہ تمہیں بحفاظت باہر پہنچا دے۔“

”ابھی نہیں شہزادی صاحبہ ابھی نہیں،“ ایجنل بھڑکی کی طرح گڑبڑانے لگا: ”میں ابھی یہاں سے نہیں جاؤں گا۔“  
شہزادی نے جواب دیا: ”تب پھر تم آؤش میں رہ کر بائیں کمرہ میں منتہا یہ طریقہ مخاطب برداشت نہیں کر سکتی۔“

ایجنل نے عاجزی سے کہا: ”اچھا اب میں خیال رکھوں گا اور احتیاط سے کام لوں گا۔“

شہزادی نے اپنا پیغام پھر سے سنا دیا۔ ایجنل بغیر ہمتا رہا اس کے بعد بے ساختہ بول اٹھا: ”کیسا پیلا پیغام ہے سر دیا والوں کے لئے خدا کی قسم میں آپ کا یہ پیغام سر دیا والوں کے گھروں پر دستگیر نہیں دے دے کہ پہنچا دوں گا آپ مطمئن رہیں۔“  
”اور میری حکومت سے کہنا۔ شہزادی کو اگر لے جانا چاہئے ہو تو فاسے بن کر آؤ اور با ذریعہ سے لے جاؤ۔“

ایجنل نے کہا: ”شہزادی صاحبہ! آپ کو ایک اعلان کر دینا چاہیئے؟“

”کیسا اعلان؟ کس لئے اور کہاں؟“  
 اینجل نے جواب دیا: ”آپ کسی طرح بھی اگر یہ اعلان کرادیں کہ جو ترکوں کے بادشاہ کو قتل کر دے گا آپ اسے اپنے شوہر کے طور پر قبول کر لیں گی۔“  
 شہزادی نے تڑپ کر مدنی سے کہا: ”اینجل! تمہاری باتیں میرے لئے ب بالکل ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں۔“

اینجل نے دواہانہ انداز میں کہا: ”اور شاید وہ شخص جس خود ہوں گا جو ترکوں کے نوجوان بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے گا۔“ پھر شہزادی کی طرف اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا دیا۔ ”لایئے اپنا ہاتھ لاتیے اور مجھ سے یہ وعدہ کیجئے کہ اگر میں ترکوں کے بادشاہ کا کام تمام کر دوں گا تو آپ مجھے اپنا ہمراہی میں قبول فرمائیں گی۔“  
 شہزادی نے کہا: ”میں نہ تو اس نزع کا کوئی اعلان کر دوں گی اور نہ کوئی عہد و پیمان اتم خواہ خواہ بہک سہے ہوا۔“

اینجل دواہانہ دار کرسی سے اٹھا اور شہزادی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ”یوہا! میں قندگی پھر ان قدموں میں رہ سکتا ہوں۔“ اس نے شہزادی کا دامن پیر پیر لیا۔ شہزادی نے اسے چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئی، پھر کچھ سوچ کر بولی: ”اینجل! میں ابھی آتی ہوں، تم میرا انتظار کر دو۔“

وہ چلی گئی اور اینجل نہ مین پر بیٹھا اس کی راہ ٹکے لگا۔ وہ کافی دیر تک شہزادی کا منتظر رہا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ شہزادی اس کی دیوالی سے خوفزدہ ہو کر اپنا خواب گاہ میں چلی گئی تھی، اور وہیں دروازہ بند کر کے بڑبڑاتی تھی۔ کافی دیر بعد سردار خاتون نے اینجل کی تصویق دی اور کہا: ”سردارین محافظہ وقت لے لو اور چوکا اب بھر کے ساتھ واپس چلو۔“

اینجل نے پوچھا: ”لیکن شہزادی کہاں ہے؟“

”اپنی خواب گاہ میں۔“

”لیکن میں ان سے ملے بغیر ہرگز نہ جاؤں گا۔“

”تم پھنساؤ گے، اس وقت وہ آرام فرما رہی ہیں، انہیں یہ سارا نہیں

سنا جاسکتا۔“

اینجل نے اصرار کیا: ”مجھ پر بھی ہو۔ میں ان سے ملے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں

گا، انہوں نے واپس آنے کا وعدہ کیا ہے۔“

سردار خاتون نے کہا: "میرے پاس زیادہ دقت نہیں ہے خواہ مہما اپنا اور میرا وقت نہ ضائع کرو۔"

انجیل نے ہمدردی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "اس دقت چلاؤ چلوں گا لیکن تم اپنی شہزادی سے کہہ دینا کہ انہوں نے مجھ سے غلط وعدہ کر کے سمجھ اچھا نہیں کیا۔"

"کہہ دوں گی۔" سردار خاتون نے تسلی دی۔

انجیل اس کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔ جب وہ محل سے باہر نکل گیا تو سردار خاتون کی جان میں جان آئی۔

\*

\*

\*

انجیل نے شاہی خزانے سے سفر خرچ لیا اور اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ اسے راستے بھر یہ دکھ دھیمی دھیمی آنکھ کی طرح جھلساتا رہا کہ شہزادی نے اس کی قدر نہیں کی اور آخری ملاقات میں اسے دھوکا دیا۔

دوسری طرف شہزادی کو انجیل کی سرکردگی بہت پسند آئی لیکن وہ جس قدر ہی صاف پروردہ ہی تھی وہاں اس قسم کی سرکردگی دلوں ہی کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے انجیل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھنے کے باوجود دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ لگتا انجیل نے حاقمی یہ کارنامہ انجام دے دیا تو وہ اسے ضرور قبول کر لے گا۔ انجیل کے دل میں تو آگ لگی تھی۔ اس نے مرید پتھر کر یا قاعدہ ایک تحریک چلائی اور سردیا کی شہزادی کے بچے کے قتل کا قہقہہ خوب ننگ مرچ لگا کر لوگوں کو سنانا شروع کر دیا۔ لوگ اس کی باتوں اور تقریروں سے بہت متاثر ہوئے، پھر وہ قسطنطنیہ چلا آیا اور یہاں کے مسیحی حکمران کو بھی خوب خوب درد دلایا اور اسے یقین دلایا کہ ترکوں کی عظیم طاقت پر بھروسہ صرف لگائے گا اس سے بہتر نہ ہو پھر کبھی بھی نہ ملے گا۔ اس نے یہاں بھی بچے کے قتل کا واقعہ بتائے پر اثر انداز نہیں آیا۔ قسطنطنیہ کے فرماں روا قسطنطین نے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میں یہ موقع ہرگز نہ لے گا۔" انجیل نے ہر مسرت لیے میں کہا: "میں میں میں کس طرح مفید ثابت ہو سکتا ہوں اس کا فیصلہ آپ لوگ خود فرمائیں گے، مجھے جلد از جلد میری خدمات سے آگاہ فرما دیا جائے تاکہ میں اپنا کام شروع کر دوں۔"

قسطنطین نے کہا: ”تم ترکوں میں واپس جاؤ، ناخبر ہے کہ اسے سلطان نے تم پر اعتبار کیا ہے اور غالباً اس کا یہ اعتبار تم میں بہت زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ کیا تم اس پر نیا رہ کر نئے سلطان کی ملازمت میں واپس جاؤ اور وہاں میری ہدایات کے منتظر رہو؟“

انجیل بھی یہی چاہتا تھا، اس کے قسطنطین کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے اسٹیم کر سینٹ ابا صوفیہ چلا گیا۔ یہ مشہور زمانہ گرجا برہمنوں سے نائرسین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ دیر تک یہاں گھومتا پھر قایم۔ یہاں لوگوں نے اس سے ترکوں کے بارے میں بہت حارسے سوالات کر ڈلے اور آخر میں پوچھا: کیا ترک یہاں آنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں؟“

انجیل نے جواب دیا: ”ترک ہمیں ذلیل اور کمزور سمجھتے ہیں، وہ ایک قسطنطنیہ تو کیا پوری مسیحی دنیا کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔ کیا تم ان کا مقابلہ کر سکتے ہو؟“  
لوگوں نے خوف سے اپنے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور خدا کی پستیا مانگنے لگے۔

انجیل سر دیا پھر واپس گیا اور وہاں کے حکمران کو یہ خوشخبری سنائی کہ قسطنطین نے عثمانیوں پر تباہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔  
سرویا کے بوڑھے حکمران نے پوچھا: ”تیرے ذمے بھی کوئی خدمت کی گئی یا نہیں؟“

انجیل نے جواب دیا: ”مجھے حکم ملا ہے کہ میں ترکوں میں واپس جاؤں اور قسطنطین کی ہدایتوں اور اشاروں پر کام کرتا رہوں؟“ پھر فوراً سر چپ رہ کر بولا: ”حالانکہ یہ کام بڑے جان جو کھوں کا ہے اور میں کسی وقت بھی قتل کیا جاسکتا ہوں؟“

سرویا کے حکمران نے کہا: ”میں بھی یہی چاہتا تھا کہ تم اور یا انجیل واپس جاؤ اور ہم سب کے لئے کوئی بڑا کام انجام دو۔ مگر پھر یہ کہ میری عمر وہ بیٹی اب بھی وہیں رہ رہی ہے اور اسے ایک ایسے شخص کی کسی اہستہ ہی محسوس ہوگی، جو اس کا ہم فریب اور ہمدرد ہو اور تم میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہیں؟“

انجیل نے تشویش ناک لہجے میں کہا: ”اب میں محض شہزادی کے لئے اٹھ رہا ہوں۔ جاؤں گا اور وہاں میں یا تو کوئی بڑا کا دن نامہ انجام دے دوں گا یا پھر اپنے ہزاروں مایوس کی طرح مردوں میں دب کر ہمیشہ کے لئے اپنا منہ چھپا لوں گا۔“

اس مردِ شام کو شاہِ سرویلے ایجنل کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت دی۔ اس ضیافت کی سب سے زیادہ شاندار یہ بات تھی کہ اس میں ایجنل کے علاوہ باہر کے کسی بھی آدمی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ کھانے کی لمبی میز کے چاروں طرف سرویا کے حکمران کا خاندان بیٹھ گیا اس میں عورتیں مرد اور بچے سبھی شامل تھے۔ اس موقع پر سردارِ با کے حکمران نے ایجنل کا اہلِ خاندان سے تعارف کرایا یا بھی تعارف جاری ہی تھا کہ ایک نوجوان لڑکی بھی گنتی ہوئی آئی اور منظر کے گرد گھٹی ہوئی کرسیوں میں خالی جگہ تلاش کرنے لگی۔ ایجنل کے برابر کی کرسی خالی تھی۔ وہ بے تکلف اسی پر بیٹھ گئی۔ شاہِ سرویلے اس لڑکی کی طرف ہنستے ہوئے اشارہ کیا۔ اور یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ایلین ہے نہایت شہرِ حد و بھر خبریں یہ خود وقت کی پابند نہیں ہے بلکہ وقت کو اپنا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے یہ میری بیٹی ماری سے چار سال چھوٹی ہے، اُمی ماریہ جو اس وقت بھی مڑکوں میں پھنسی افسوسناک اور پُر اذیت زندگی گزار رہی ہے۔

ایجنل تو اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں چونک گیا تھا۔ یہ بالکل ماریہ تھی اویسی ہی پیشانی، اسی کی طرح زلفیں، ناک، کان، ہاتھ، پیر، حال ڈھال، غرضیکہ کسی بات میں بھی دونوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا، بس فرق صرف اتنا تھا کہ ماریہ کو غموں کے دہانے کچھ اُداس اور سوگوار بنا دیا تھا۔ اور اس کے برعکس ایلین میں تیزی، چستی اور پھرتی پائی جاتی تھی، اس کے کانوں میں پڑ سے ہوتے آویزوں میں دو گول گول قیمتی موتی لٹک رہے تھے اور ان میں اتنی چمک تھی کہ رخساروں کی آب و رنگ کو اس میں دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے دیکھ کر ایجنل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

ایلین نے شوخی سے کہا: کیوں جناب آپ وہاں سے اکیلے ہی بھاگ کر چلے آئے؟ حالانکہ وہاں ابھی تک میری بہن ماریہ موجود ہیں۔ انہیں یقیناً تمہاری ضرورت ہوگی۔

ایجنل نے جواب دیا: "ایلین تمہاری یہ خیال غلط ہے کہ میں تمہاری قابلِ عزت بہن اریہ کو تنہا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا ہوں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں یہاں ایک خاص مقصد سے آیا ہوں، جس سے تمہارے والدِ خوب اچھی طرح حائف ہیں۔"

شاہِ سرویلے نے شرمندگی سے کہا: "مغزوہ مان ائم اس نادان اور شرمیلے لڑکی کے باتوں کا خیال نہ کرنا۔ ابھی اسے اپنی زبان کے صحیح مصرف کا علم نہیں ہے۔"

ایجنل نے ہنستے ہوئے کہا: "جنابِ والا اب میں اتنا سمجھ بھی نہیں کہ شہزادی

ہیلن کی معصومانہ باتوں کا برامان جاذب!

ہیلن نے ٹھٹھکتی اور ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ سردیا کے حکمران نے منہ ملتے ہوئے کہا: یہ روٹھتی بھی بہت جلد ہے، یہ اتنی زیادہ حساس اور نازک طبع ذات ہے کہ اپنے خلات ایک لفظ بھی مشتتا گوارا نہیں کرتی۔“

ہیلن کھانا کھلتے بغیر ہی اٹھ کر پہلی گئی، اس کا باپ لے پکادتا ہی رہ گیا لیکن وہ واپس نہیں آئی۔ اس حلقے نے کھانے میں بد مزگی پیدا کر دی۔ سردیا کے حکمران نے افسردگی سے کہا: ”حضرات! آپ سب کھانا شروع کر دیں۔ ہیلن بعد میں کھلے گی، اسے شاید کھانے کی زیادہ اشتہا نہیں ہے۔“

ان سب نے کھانے کا آغاز تو کر دیا لیکن ان میں سے کسی ایک میں بھی پہلی جیسی سرگرمی اور جوش و خروش نہیں پایا جانا تھا۔

ایبجل نے شرمندگی سے کہا: ”مخصوص کہ میرا دل دھڑکنے لگا ہے، ہیلن پہلے سے چلی گئیں، مجھ پر تو یہ فرض عائد ہونا تھا کہ میں انہیں جلتے دیکھ کر روک لیتا اور کھانا کھلتے بغیر ہرگز نہ چلنے دیتا۔“

شاہ سردیا نے نزالہ منہ میں رکھتے ہوئے حاضرین طعام سے کہلا صاحبان کھانا شروع کر دیجئے کیونکہ کھانے کا وقت ہو چکا ہے اور اب صبر کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔“

سبھی نے سردیا کے حکمران کی اتباع میں کھانا شروع کر دیا۔

اسی کے بعد ایبجل ہیلن کی تاک میں رہا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی جیسے جیسے اس کی واپسی کا دن قریب آ رہا تھا، وہ پریشان ہند رہا تھا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ واپس جلتے لیکن جانا بھی بہت ضروری تھا۔ اس نے اکثر ہیلن اور ماریہ کو ایک ساتھ کھڑا کر کے یہ اندازہ لگانا چاہا کہ اسے کون زیادہ اچھی لگتی ہے تو یہی جواب ملا کہ ہیلن کی بات ہی کچھ اور ہے ماریہ کی طرف سے اس کا دل ہٹتا چلا گیا۔ اور انہی خیالوں میں جب اسے ماریہ کا وہ مات عالا سلیک یاد آیا، جب وہ اسے تنہا چھو کر اپنی خواہش گاہ پر چلی گئی تھی تو ماریہ پر ہر اعتراض آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی نہیں ماریہ کی اس بد اخلاق کی اسے سزا ضرور دیا جائے گی۔

واپسی سے ایک دن پہلے سردیا کے حکمران نے ایبجل کو شاہی باغیچے میں طلب کیا۔ یہاں وہ ایک بارہ دہری میں بیٹھا چند سرکاری کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا اس کے

سلنے ایک وسیع درختوں کے حوض میں دفنار سے چھوٹ رہے تھے اور حوض کے تین طرف پھول دار درخت جھرم جھرم تھے ان کی شاخیں، مختلف رنگ اور قسم کے پھولوں سے لڑی ہوئی تھیں، اور ان میں سے بعض پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پتھر کی سی تھیں، پھولوں پر تیلیاں بٹھکر رہی تھیں اور سیدنگ برنگی خوشنما تیلیاں جب پھولوں پر بیٹھ جاتیں تو یہ خود بھی پھول ہی معلوم دینے لگتیں۔

ایجنل بادشاہ کے معبود ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ نے اسے ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور کہا: "میں ابھی بات کرتا ہوں بس چند سطریں پڑھ لوں؟" ایجنل نے جواب دیا: "بندہ اس وقت تک متوجہ کھڑا رہے گا جب تک حوضہ دلا اپنے نہایت اہم اور قیمتی مشغلے سے فارغ نہیں ہو جاتے؟"

بادشاہ نے کہا: "اگر تم پسند کر دو حوض کے قریب یا پھول وار درختوں کی مددشوں میں چل پھر کر اپنی مشام جاں کر تو تازہ کر لوں میں اپنے کام سے فارغ ہونے ہی تمہیں بلاؤں گا؟"

ایجنل نے کہا: "بہتر ہے"

اور حوض کے پاس چلا گیا۔ پھر وہاں سے گل پوش روشنیوں میں داخل ہو گیا۔ خوبصورت تیلیاں اس کے کمر میں سے ٹھکڑا ٹھکڑا کر پھولوں کی طرف جانے لگیں اور پھر دھڑکنا شروع کیا۔ ایک ایسی ناک اور چھوٹے کانوں والا گدہ بڑا اہمیت کا داس کے پاس آیا اور پوچھا: "کیا تم نے بادشاہ سے ملاقات کر لی؟"

ایجنل نے جواب دیا: "ایک بار مل چکا ہوں، دوبارہ پھر ملنا ہے۔ کیوں؟" خدمت گار نے جواب دیا: "دالچی میں شہزادی ہیلین سے طرہ دل لینا وہ یہاں کے صدرہ مددگار سے لمحہ سبزہ تار بہہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

ایجنل کی عمر مٹی کی حد نہ رہی ماس کے جی میں آتی کہ وہ اسی وقت بھاگ کر ہیلین کے پاس پہنچ جاتے لیکن سردیا کے باوجود وہ خوف غالب آیا اور اس نے پوچھا: "لیکن خدمت گار تم کے ایک بات تو بتاؤ؟"

خدمت گار نے پوچھا: "وہ کیا ہے پوچھو؟"

ایجنل نے جواب دیا: "شہزادی مجھ سے چوری چھپے مل رہی ہے یا اس کی اپنے باپ سے اجازت ملے لی ہے؟"

خدمت گار نے کہا: "یہ سب میں نہیں دانتا، شہزادی سے یہ باتیں ہم لوگ



کس طرح پوچھ سکتے ہیں؟“

اینگل نے کہا: ”پھر اس طرح اس سے ملنے میں مجھ پر کوئی افتاد تو نہیں نازل ہوگی؟“

خدمت گاہ سے چڑھ کر کہا: ”میرے ذمے یہ کام تھا کہ شہزادی کا پیغام تم تک پہنچا دوں، سو پہنچا دیا۔ اس کے سوا تمہاری کسی بات کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں“۔  
اینگل نے جلدی جلدی کہا: ”لیکن شہزادی جناب ایک بات اور“۔  
خدمت گاہ نے اس کی بات کا ردی، ایک طرف جانا ہوا بولا: ”اب مسیبن یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ بادشاہ سلامت اسی طرف تشریف لائے ہیں۔ تم شہزادی سے مل ضرور لینا“۔

اینگل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی شاہ سر دیا اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ بادشاہ کے جونوں کی آواز قریب سے قریب تر آتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بادشاہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”ہاں تو اے میرے عزیز! بادشاہ نے اے مخاطب کیا۔“  
”کل تم داہیں چلے جاؤ گے؟“

اینگل نے جواب دیا: ”جی حضور والا، درندہ جیسا حکم ہو سادام اس کی بجا آوری میں فخر و تیساطر محسوس کرے گا۔“

بادشاہ نے اس کا ہاتھ پٹے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے دباتا ہوا بولا: ”اینگل! تم جانتے ہو کہ دشمنوں سے جنگیں کئی طرح لڑی جاتی ہیں۔ ایک طریقہ جنگ تو یہ ہے کہ دشمن کا کھلے میدان میں گردانہ دار مقابلہ کیا جائے۔ دوسرا طریقہ ہے کہ اسے خافل رکھ کر شب خون مار دیا جائے اور تیسرا طریقہ ہے کہ یہ کہتے کہتے بادشاہ نے پتے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور پوچھا: ”ہمارے آس پاس کوئی موجود تو نہیں ہے؟“ پھر خود ہی جواب دیا: ”غایہ نہیں۔ ہاں تو میں تیسرے طریقے کی بات کر رہا تھا۔ جب دشمن ناقابل شکست ہو اور دوسری طرف ناقابل اختیار ہوں تب پھر کم ہیں سے کسی ایک جوان لڑکر کوا پنی سیان خطر میں ڈال کر تیسرے طریقے پر عمل کرنا چاہیے۔ وہ دشمن کی سب سے بڑی شخصیت کو اعتماد میں لے کر دھوکے سے ہلاک کر دے اور خود فرار ہو کر اپنی تلوار میں پناہ لے جائے۔“

اتفاقہ کر کے بادشاہ اینگل کی صورت دیکھنے لگا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت کا پتہ چلانا چاہتا تھا۔

اینگل نے پوچھا: ”جیبا حضور والا یہ پتا ہے ہیں کہ میں تو جہان سلطان محمد کو دھوکا

سے ہلاک کر کے مروا داپس آجاؤں گا۔“

”ہاں“ بادشاہ نے کہا۔ ”اس کے علاوہ میری باتوں کا دوسرا کوئی مطلب نہیں۔ تم شاید نہیں جانتے کہ دشمن کے سب سے بڑے آدمی کے تنہا مار دیئے جانے سے آخری فتح حاصل ہو جاتی ہے۔“

ایجنل خاموش ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے مصروف عمل تھا۔

بادشاہ نے اسے بہت زیادہ سمجھنے ہی نہ دیا۔ بولا: ”میں نے تجھے اپنا عزیز کہا ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تیرا نسب نامہ بہت اچھا ہے اور تجھ سے رشتہ قائم کر لینے میں عائد نہیں محسوس ہوگی۔“

ایجنل کو ان لفظوں کے معنی میں چھپٹا ہوا سنہرے مستقبل اس طرح نظر آنے لگا جس طرح بادشاہ کی ادرٹ سے درخشاں چاند دکھائی دے رہا تھا، اسی نے رک رک کر سر پوچھا: ”کیا حضور والا جو کچھ فرما رہے ہیں، میری کامیابی کے بعد اس پر فی الفور عمل کیا جائے گا؟“

بادشاہ نے کہا: ”بادشاہ سے سوز قطعی بچ رہا ہے ناقابلِ معافی جرم۔“

ایجنل نے کہا: ”تب پھر میں آج ہی روانہ ہو جاؤں گا اور اسی ناخبریکہ سلطان کا کام تمام کر کے بہت جلد واپس آجاؤں گا۔“

”نہیں!“ بادشاہ نے کہا: ”تم کل ہی روانہ ہو گے، اپنا کام پورا کر کے جب تم واپس آؤ گے تو سلطان کا خنجر، بیٹی اور اس کا نبی تم اپنے ساتھ لاؤ گے، سلطان کی ان چیزوں کے عوض تمہیں قترے مانگا انعام عطا کر دیا جائے گا۔“

ایجنل نے بات صاف کر لینی چاہی، بولا: ”خادم کی خواہش ہے کہ جب یہی سلطان کی مذکورہ بالا چیزیں ملے کر حاضر ہو جاؤں تو حضور والا مجھے اپنی فرزندہ میں قبول فرمالیں۔“

بادشاہ نے گرجا مارا اور میں پوچھا: ”تمہارے ذہن میں کس کا نام ہے؟ تم نے کس کو پسند کیا ہے؟ یہ کہہ کر یہاں سے ہٹیں کوہ۔“

ایجنل نے ڈھٹے ڈھٹے جواب دیا: ”ہے ہے، ہے لکھو۔“

بادشاہ نے کہا: ”تم ملن کے بدلے دولت کیوں نہیں مانگ لیتے، جاگیر کیوں نہیں طلب کرتے؟“

”حضور والا صرف یہاں!“ وہ بادشاہ کے قدموں میں گھٹنوں کے بل بیٹھ

گیا۔ اور بادشاہ کی پندلیوں کو بوسہ دیا۔

بادشاہ نے کہا: ”اگر ہیلن نے تجھے ناپسند کر دیا تو؟“

ایجنل نے کہا: ”اِس معاملے میں ہیلن کی پسند اور مرضی کو اتنا ہی دخل ہونا چاہیے جتنے دروازے، جتنا وعل مشہزادی ادب کو بوسہ دے سلطان مراد کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں تھا۔“

بادشاہ مسکرایا، بولا: ”تو اب تم خود کو مراد ثانی جتنا بڑا آدمی سمجھتے ہو؟ عجب عجب! انچھا ابھی میں عمر دہیلن سے بھی بات کروں گا تم کل مدد لگی سے پہلے مجھ سے اس کا جواب لے لینا۔“

ایجنل نے بادشاہ کی پندلی کو ایک نذر نامہ بوسہ دیا اور بادشاہ نے اسے پکڑ کر اٹھالیا، ادھر کہا: ”اب تم جا سکتے ہو۔“

جب ایجنل جانے لگا تو بادشاہ نے کہا: ”ہیلن صدر دروازے سے ملحوظ سبزہ زار پر خود بھی موجود ہے تم اس سے بات کر کے جانا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرنا کہ کس حد تک وہ تمہاری ہم خیال ہے۔“

ایجنل کی خوشی کی انتہا نہ تھی، خدا اور قسمت، اس پر شاید دونوں ہی مہربان تھے۔ وہ فطرتاً ہی اس سبزہ زار کی طرف بڑھا جہاں ہیلن اس کا انتظار کر رہی تھی۔

\*

\*

\*

کئی خدمت گار خواتین کی ٹکرائی میں ایجنل ہیلن کے پاس پہنچ گیا بشرط ہیلن اسے نہ کر سکی اور وہ خوشی سے موال کیا۔ کیا تم نے واقعی یہی چہرہ سرکار کے چہرے میں اپنی تلوار کا نوک چھبھو دی تھی؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”حضور مشہزادی صاحبہ جب اپنی بری بہن سے ملاقات فرمائی گی تو وہ میرے اس بیان کی تصدیق فرما دیں گی۔“

ہیلن نے لاپرواہی سے کہا: ”مجھے یقین نہیں آتا۔“

”یقین نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ؟“

ہیلن نے خدمت گار کنبزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”عورتوں کا عرصہ تو تو نہیں سکے، پھر مہار مردوں سے تم کیا خاک مقابلہ کر دو گے؟“

ایجنل ہیلن کے اس لطیف مذاق سے بہت خوش ہوا بولا: ”میں مشہزادی ہیلن

کا شکر گزار ہوں کہ مجھ سے مذاق فرما کر لطف اندوز ہو رہی ہیں؟  
 ہیلن نے کہا: ”تم نے ترکوں کے نوجوان سلطان محمد خان کو دیکھا ہے؟“  
 ایجنل نے جواب دیا: ”صرف دیکھا ہی نہیں، اس سے بات چیت بھی کی ہے۔ میں  
 نے اسے اتنا ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا قریب شہزادی ہیلن کو دیکھ رہا ہوں۔“  
 ہیلن نے پوچھا: ”اس کی شکل و صورت کیسی ہے؟“  
 ایجنل نے جواب دیا: ”اس کی شکل و صورت بوجھ کر کیا کیجئے گا، بہر حال اگر آپ میں  
 لا شکل و صورت جانتا ہی چاہتی ہیں تو عرض لیجئے، سلطان کے چہرے بہرہ دونوں شرخ و سپید  
 رخسار اتنے اچھلے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والے کی نظر ان پر ہی جم کر رہ جاتی ہے۔ ناک اور نچی  
 عمر آگے سے جھکی ہوئی ہے اس کی مونچھیں دونوں رخساروں پر اس طرح اٹھی رہتی ہیں گویا  
 گلاب کی کلن کی دو پتیاں رکھ دی گئی ہوتی۔ سلطان کی داڑھی کے بال قدامت ہیں اور طاق  
 مار کی طرح نظر آتے ہیں۔“

ہیلن نے پوچھا: ”سلطان کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟“  
 ”پڑھا لکھا؟“ ایجنل نے جواب دیا: ”اجی سنا، اس نوجوان کے باوجود وہ پانچ زبانیں  
 باتلے ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی، لاطینی اور لونیائی ان پانچوں زبانوں میں وہ کسی مترجم کی مدد کے  
 بغیر باتیں کر لے گا۔“

ہیلن نے کہا: ”خوب، اب تم یہ بتاؤ کہ کیا سلطان ہم عیسائیوں کی متحدہ فوجت کا  
 مقابلہ کرے گا؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”شاید نہیں؟“ اس نے شہزادی کی کیف آمد آنکھوں میں لپٹا  
 جہرہ دیکھا، بولا: ”شہزادی! میں اور کچھ تو جانتا نہیں، بس یہ جانتا ہوں کہ اب جب میں  
 ترکوں کے پاس سے واپس آؤں گا تو میرے سامان میں ترکوں کے نوجوان بادشاہ کا خنجر، اس  
 لاچیٹا اور اس کا لباس بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ آپ کے دالہ نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس  
 کے بعد میں ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہ سکوں گا۔“

ہیلن نے جب بخوبی پوچھا: ”کیا تم ترکوں کے سلطان کی یہ چیزیں چھو رہی کر کے  
 لے آؤ گے؟“

ایجنل کا چہرہ غصے اور شرم سے شرخ ہو گیا۔ بولا: ”مجھ شہزادی صاحبہ! اگر میری  
 کلمات کسی مرد کی زبان سے نکلے تو اس وقت میں اس کے مددگار نہ ہو سکتا ہوں۔ میں ترکوں  
 کے سلطان کا مقابلہ کر کے اسے زیر کر لوں گا، اور اس کے بعد ایک فاتح کی حیثیت سے اس

کی اس چیزوں پر قبضہ کر لوں گا؟“  
 ”خوب! خوب!“ ہیلن دوسرے پہنے لگی! اے کاش اس جگہ میں خود  
 بھی موجود ہوتی!“

ایجنل خوب سمجھ رہا تھا کہ شہزادی اس کا مذاق اڑا رہی ہے اسے غصہ بھی آیا  
 تھا لیکن وہ سولے ضبط اور برداشت کے کر بھی کیا سکتا تھا۔ بولا! آپ اس وقت تک  
 میری باتوں کا یقین نہیں کریں گی جب تک کہ میں یہ غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر دوبارہ  
 آپ کی خدمت میں نہ آ جاؤں۔“  
 شہزادی نے ایجنل کی مونچھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا! انہیں تم  
 ترکوں کے سلطان کی طرح اور پرانا تریارہ اٹھا لو کہ ان کی دونوں مونچھیں ٹہلی پلگوں سے  
 حکمرانے لگیں!“

ایجنل نے حقت سے پوچھا! ”ان کا فائدہ؟“  
 ہیلن نے جواب دیا! ”ان کا فائدہ یہ ہے کہ یہ سلطان کی مونچھوں سے بڑھ  
 جایش گی۔“

وہ پھر دوسرے پہنے لگی۔ ایجنل کو ہیلن سے زیادہ ان عورتوں سے شہز  
 آدمی تھی جو عورت کے فرشتوں کی طرح اس کے سر پر سوار تھیں۔ اس نے ہیلن کو خوب اچھ  
 طرح دیکھ لیا۔ اور اس شیعہ پر مبنی کہ اس کے لئے زندگی کو وادوں پر لگایا جاسکتا ہے!  
 کی چٹائی چٹائی محرومی انگلیاں بتا رہی تھیں کہ شہزادی میں شاعرانہ صلاحیتیں بہت زیادہ  
 پائی جاتی ہیں۔ اس کا چہرہ ایسا تھا کہ کوئی مصوّر اگر وہ دیکھ لینا تو زندگی بھر اس کی شبیہ بنا  
 نہ پاتا۔ انھیں اتنی پرکشش اور خوب متگین تھیں کہ ان سے زیادہ پرکشش اور محمود ہونے  
 خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مگر وہ اور بے در زنج گولائی میں مختصر ہوتی ہوئی پنڈلیوں،  
 ہال آگے ہوتے تھے۔ سفید پنڈلیوں پر کالے بال کسی مرد کے پیر دکھائی دیتے تھے  
 اور بظاہر یہ ایک عیب تھا۔ لیکن ایجنل کو ان میں بھی حسن ہی کی جھلک دکھائی دی۔

ہیلن نے پوچھا! ”تم دیکھ کیا رہے ہو؟ اور کیا سوچ رہے ہو؟“  
 ایجنل نے جواب دیا! ”اس صانع کی کار گیری پر غور کر رہا ہوں جو مادے اور  
 کئے استخراج سے آپ جیسی حسین ترین ہستی کو تخلیق کر رہا ہے میری عقل حیران ہے کہ یہ  
 کس کس عضو کی تعریف کرے، جسم کے کس کس حصے کے حسن کی شناختی کرے!“  
 سر پر مسلط کینڑوں نے اسے جھڑک دیا! ”فضول باتوں میں اپنا وقت نہ

منافع کر۔ اگر گفتگو کے لئے کوئی موضوع نہیں باقی رہا تو اب یہاں سے چلا جا۔  
ہیلین نے کہا: یہ سپاہی سے زیادہ تو شاعر نظر آتا ہے۔ کیا اس کی پھر لطف باتوں  
میں تمہیں کوئی مزہ نہیں مل رہا؟

ایک کینز نے جواب دیا: ”یہ اپنی حس سے بڑھ رہا ہے۔“  
اینگل نے غصے میں کہا: ”ابھی تو گرجتی باتیں کرنا چاہے کہ لے لیکن جب میں  
تیروں کے پاس سے واپس آؤں گا تو اس وقت میں اتنا اختیار ضرور حاصل کر چکیوں گا کہ  
مجھے شہزادی کی ملازمت سے نکلان باہر کر دوں۔“  
کینز نے مسکولے بگیں۔ ہیلین نے کہا: ”افسوس کہ میں شہزادی ہوں۔“ ”شہزادی  
نہ ہوتی تو تمہارے ساتھ چل کر شہزادی بہادری ضرور دیکھتی۔“  
اینگل کو سچی پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے بہت افسوس تھا کہ آخر یہ لوگ اس کی  
بہادری پر یقین کیوں نہیں کر سکتے۔

دوسرے دن جب وہ سروریا سے رخصت ہو رہا تھا تو ہیلین اس سے ملنے  
آئی۔ اس نے ہیلین سے دو ذریعہ جدیات سے پوچھا: ”کیوں شہزادی صاحبہ! ابھی آپ اس  
خاکسار کو یاد بھی فرماتیں گی؟“  
ہیلین نے جواب دیا: ”کیوں نہیں۔ جب بھی کوئی بڑا بولاشیخیاں بکھائے گا مجھے  
تم خود یاد آ جاؤ گے۔“

کینز کھلا کھلا کہہ رہی تھیں۔  
اس وقت ایک اور کینز بھاگتی ہوئی آئی اور ہیلین کو مطلع کیا: ”حضورہ شہزادی  
صاحبہ! شہزادہ مائیکل تشریف لائے ہیں۔“  
ہیلین نے جواب دیا: ”انہیں خود حاضر کر دو۔“ پھر اینگل سے کہا: ”اینگل! تم مائیکل  
سے مل کر یقیناً بہت خوشی محسوس کر دو گے کیونکہ یہ صاحب بھی بزرگ قومیت بہادر  
ہیں اور بہری خاطر دنیا کا مشکل ترین کام انجام دینے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔“  
اینگل کا حسد سے بڑا حال ہونے لگا۔ اس کا خلق خشک ہو گیا۔ مشکل پوچھا۔  
”مائیکل شہزادہ ہے؟“

ہیلین نے جواب دیا: ”ہاں کیونکہ یہ بھی شاہی خاندان ہی کا ایک فرد ہے۔ تو کہ  
دردی دہشتے ہی کا سہی۔“  
اسی دوران چند کینزوں کا معیت میں شہزادہ مائیکل بھی وہیں پہنچ گیا۔ اینگل

نے اسے کنکھریوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر انھیں اس کی بھی بڑی بڑی تھیں اور اس کے سر پر ایک اونچی سا ہیٹ دکھا ہوا تھا، ہاتھ میں پتہ تھا۔ اس بیدار کے خول میں گپتی پڑی ہوئی تھی۔

مائیکل انجیل کو دیکھ کر بھڑک گیا۔ ایلن سے پوچھا: "یہ جانور شاہی سینرہ تار میں گھاس چرے کہاں سے آگیا؟"

انجیل خود کو معزز مہمان تصور کرتے ہوئے بٹھا، ترکی یہ ترکی جواب دیا: "شہزادے کی نگاہ بہت کمزور محسوس ہوتی ہے اور خدا قاتر العقل بھی دکھائی دیتے ہیں، اگر ان میں یہ دو نقص نہ ہوتے تو یقیناً ایک اچھا خاصا معزز مہمان انہیں جانور نہ نظر آتا۔" مائیکل بھڑک اٹھا: "چیرا۔" گستاخ، بے ادب۔ تو ہے کون؟ اور یہاں کہوں آیا؟"

انجیل نے جواب دیا: "یہ سوال تم شہزادی سے کرو۔ ورنہ یوں میری حیثیت بہت جلد تم پر بھی آشکارا ہو جائے گی۔"

مائیکل نے قدر اتریب ہو کر انجیل کی ناک پر پٹلی اور شوخی سے بولا: "ادب سے بات کرو ورنہ وارد انسانہ تم مجھے پہچان لو۔ اور جب پہچان لو تو مجھے میری حیثیت کے مطابق مخاطب کرو۔"

انجیل نے مائیکل کی ناک پر پٹلی بولا: "اے اگرا چا اور تو تمہاری یہ ناک میں تھاپی اخیل پر رکھ دو۔"

ایلن اور اس کی کیزر اس جھگڑے میں غیر جانبدار ہیں اور مزے لیتی رہیں۔ مائیکل نے انجیل کو دھکاتے کر پیچھے ہٹا دیا۔ مائیکل نے ایک منہ در منہ ٹکراؤ کا رخ کیا۔ مائیکل نے اس سے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔" مائیکل نے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔"

مائیکل نے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔" مائیکل نے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔"

مائیکل نے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔" مائیکل نے کہا: "یہاں آؤ۔ اور ہمارے کام کو ختم کر دو۔"

ایجنل نے جواب دیا: "تمہیں شکست دینے کے لئے خدا نے مجھے بھیجا ہے دس پانچ دن خوب اچھی طرح کھا پی لو کہ چونکہ کچھ ہفتہ نہیں کہ تم کتنی زندہ لگا کر لائے ہو؟" مائیکل نے کہا: "یہ موقع مبادت کا نہیں ہے لیکن میں پھر بھی تمہیں ایک موقع مبادت کا عطا کروں گا بشرطیکہ تمہنے خود کو مبادت ثابت کر دیا۔"

ایجنل نے مائیکل کی بات کا کوئی جواب ہی نہ دیا۔  
ہیلن نے چھیڑا: "کیوں جناب آپ خاموش کیوں ہو گئے؟"  
ایجنل نے جواب دیا: "اب میرے پاس بولنے کے لئے کچھ رہا ہی نہیں تو یوں کہ لگ گیا۔ لیکن مائیکل میں جتنی غمخیزیاں یا غمخیزیاں موجود ہیں، میں ان کا بھی مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔"  
مائیکل نے بدستور تمش لہجے میں کہا: "تم حد سے بڑھو رہے ہو کہ شش کرو کہ تمہاری جو حیثیت ہے اس میں کوئی منفی تغیر نہ پیدا ہو جائے؟"

ایجنل نے باتوں میں مائیکل کو مارا دینے کی کوشش کی۔ بولا: "میری حیثیت میں جو غیر معمولی تغیر رہا ہے اس کے واسطے اسی کی چمکا جو نہ تمہاری بقیہ نظر کو بھی کھا جائے گی۔"  
مائیکل نے ہیلن سے شکایت کی: "ہیلن! میں یہ ساری باتیں تم سے کرنا چاہتا تھا، یہ جنگلی معلوم نہیں کہ اس سے شہروں کی طرف بھاگ کر آ گیا ہے۔ میں اس کے گلے میں لالہ قینہ ڈال رہا ہوں گا جس سے لوگوں کو اس کی اصل حیثیت معلوم ہو جائے گی۔"

ایجنل نے جواب دیا: "سر دوست یہی ارادہ اپنا بھی ہے۔"  
ہیلن نے کہا: "اچھا جناب! اب آپ دونوں خاموش ہو جائیں؟" پھر ایجنل سے کہا: "تم مائیکل کو وہ شرط بتا دو جس کی تکمیل کے بعد تم میرے حق دار ہو جاؤ گے؟"  
ایجنل حث پٹایا لیکن ہیلن کے اصرار پر شرط کی ساری تفصیل بتانا ہی بڑھ گئی۔  
آخر میں ہیلن سے شکایت کیا: "افسوس کہ اس بات کو راز ہی میں رہنا تھا لیکن آپ نے اس کا یوں بر ملا کر کر دیا؟"

مائیکل نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا: "میں کسی شرط و طر کا پابند نہیں ہوں تو اس شرط کو پوری کر کے واپس آنا اس وقت میں دیکھ لوں گا کہ تمہیں کس طرح حاصل کرنا ہے؟"

ہیلن ایجنل کو ایک طرف لئے چلی گئی اور سرگوشی میں کہا: "تم اس کی باتوں سے فکر نہ مت ہونا، بھلا کون ایسی لڑکی ہے جو زندہ لگا کر بھر کے لئے اس مجسمہ حماقت کو خود پر مسلط کر لے گی؟"



اینجل کی تشویش دُور ہو گئی، ساری فکر مندری سیاتی تھی، اہلین کا ذرا سا دل اس کے لئے بہت کافی تھا۔

✽

✽

✽

اینجل اٹھ یا نوپل پہنچی تو معلوم ہوا سلطان محمد ایشیائے کوچک کی شہر شہیں دہلے میں مشغول ہے، یہ بغاوتیں بھی عیسائیوں کی سازشوں کا ایک حصہ تھیں۔ مسیحی قوتیں انجوان بادشاہ کو اس کے اپنے ہی ملک کی بغاوتوں میں اٹھجا کر کمزور کر دینا چاہتی تھیں۔ اور جب انہیں یہ یقین ہو جائے گا کہ انجوان بادشاہ بغاوتیں دہانے میں ناکام رہا ہے تو وہ خود بھی ترکی علاقوں میں داخل ہو سائیں گی۔ سادر چاروں طرف سے یلغار کر کے اس قلعے کو جھینٹ کر لئے پاک کر دیں گی۔

شہزادی ملہریلے اینجل کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ اس دن اس نے بطور خاص سیاہ لباس زیب تن کیا اور دو انگلیوں میں نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں پہن لیں۔ اینجل نے بھی شہزادی کے روبرو دھانے سے پہلے بہت اچھے کپڑے پہنے اور انہیں خوشبو سے معطر کر دیا۔ وہ شہزادی کے روبرو پہنچے ہی ادب سے دوڑنا نہ ہو گیا۔ یہاں بھی کمینڈر اس کے سر پر مسلط تھیں۔

شہزادی ماریہ نے یوچھا "سر دیا دلے کیسے ہیں؟"

اینجل نے جواب دیا "کوئی فرق نہیں آیا۔ جیسے پہلے تھے ویسے ہی آج بھی ہیں۔" شہزادی نے اس بے نیکی جواب پر شکایتی انداز میں کہا "اینجل! تمہارا یہ جواب مٹھن کر دیتے والا نہیں ہے۔"

اینجل شہزادی کو اس قیامت خیز لباس میں دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا۔ اس وقت شہزادی کا ہر عضو اینجل کو دغرت نظر آ رہا تھا۔ شہزادی نے بھی قصداً بے نیازی اختیار کر لی تھی۔

اینجل کے ذہن میں یہاں کمزور میں لے رہی تھی مگر کاشن نے اس کا دل بھری دیکھایا تھا۔

شہزادی نے کہا "اینجل! تم کھوٹے کھوٹے کیوں رہنے لگے ہو؟"

اینجل نے جواب دیا "مجھے یہاں جھوٹا آنا پڑا ہے۔ درنہ میں تو سروریا ہی ہیں۔"

رہ جاتا۔

شہزادی نے کینزدوں کو ہاتھ کے اشارے سے چلے جانے کا حکم دیا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو شہزادی نے سوال کیا: ”اسمہ تم یہ کیوں نہیں بتاتے کہ میرے والد کیسے ہیں میری بہن، یہاں کیسی ہے اور دوسرے بہت سے لوگوں کا کیا حال ہے؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”آپ کے والد بڑے اچھے انسان ہیں، اور سب کچھ اچھا ہے۔“

ایجنل نے کہا: ”ہی امیر زادے اور شہزادے اس کی خوشخبری حاصل کرتے کرتے اس کے در پر نا صیہ فرمائی کرتے ہیں۔“

شہزادی نے شرمکے پوچھا: ”کیسی عجیب بھی یاد کیا تم نے؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”آپ کو یاد کیا خاک کرتا۔ وہاں اب وہاں آپ کی شکل و شباہت کی ایک دوسری لڑکی بھی موجود ہے۔“

شہزادی نے پوچھا: ”وہ دوسری لڑکی میری بہن ہیں، ہوگی، کیونکہ وہ مجھ سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔“

ایجنل ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ! آپ کو بہت یاد کر رہی تھی وہ یہاں آپ کے پاس آنے کے لئے یہ ہیں۔“

شہزادی نے پوچھا: ”ایجنل! کیا ان لوگوں کی دنیا وہاں کے لوگ اب بھی سوجاتے ہیں؟“

یاسست ہو گئے ہیں۔“

ایجنل نے کہا: ”شہزادی صاحبہ! یہ بات تو یہ ہے کہ سرور ہائے لوگ غضب کے بے فکر ہیں ان پر شادی دہم کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ میں نے انہیں کئی دیکھ بھری داستانیں سنائیں لیکن ایسے جو فغوں پر وہ رونے نہیں ہنستے ہیں۔“

شہزادی ہاتھ ملنے لگی۔ وہ جو کچھ جانا چاہتی تھی ایجنل اسے بار بار نظر انداز کر رہا تھا۔

شہزادی نے پوچھا: ”میرا شہر مرچکا ہے اور میں ابھی جوان ہوں کیا میرے گھر والوں کو اس کا احساس نہیں ہے کہ میری دوسری شادی بھی ہو سکتی ہے؟“

ایجنل نے جواب دیا: ”میں نے ان ذاتی نوعیت کے سوالوں سے ہمیشہ احتیاط کیا ہے۔“

شہزادی نے غصے میں کہا: ”تم دوسرا شہزادی میری نظروں سے کیونکہ اب تم پہلے چلے آئے ہو۔“

ایجنل نے کہا: ”میرا جاکر خدا جانے تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“

ایجنل اٹھ کر چلا گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جاکر پھر واپس آگیا۔ بولا: ”محترم شہزادی صاحبہ!

مجھے معاف فرما دیجئے میں سر دیا سے واپس آ کر لیتے ہوش و حواس میں نہیں ہوں معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے ؟

شہزادی سے پھر بھڑکا : ”اب تم یہاں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہرو گے۔ اسی دقت چلے جاؤ یہاں سے۔ اب میں تم سے ایک بات بھی نہیں کروں گی۔“  
 انجیل نے نفیاتی چمکا لگایا : ”میں آپ کو یہ بتانا بھول ہی گیا کہ آپ کے والد نے میرے سپرد ایک ایسا کام کر دیا ہے جسے جس دھنچکی انجام دے کہ میں آپ کی چھوٹی بہن ہیلن کا ستحق ہو جاؤں گا۔“

”تم جمع ہوئے ہو، میرا باپ تم سے اس قسم کا وعدہ ہرگز نہیں کر سکتا۔“  
 ”آپ دیکھ لیجئے گا۔“ انجیل کہتے لگا : ”میں یہاں آیا ہی ایک خاص مقصد سے ہوں۔“

شہزادی نے کہا : ”اگر ایسا ہے تو میں بھی دیکھوں گی کہ تو اپنے اس خاص مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتا ہے۔“

انجیل نے ڈر کر پوچھا : ”کیا آپ میرے اس مقصد سے آگاہ ہو گئی ہیں ؟“  
 شہزادی نے کہا : ”ہاں، میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آتے ہو، میں سلطان کی واپسی کی منتظر ہوں، پھر دیکھتی ہوں تم اپنے مقصد میں کس طرح کامیابی حاصل کرتے ہو۔“

انجیل کا ارے ڈر کے بہت بڑا حال ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر شہزادی اس کے ارادے سے واقعی واقف ہو گئی ہے اور اس نے اس کا انکشاف بادشاہ کے روبرو کر دیا تو اس کا حشر کیا ہوگا۔ اس نے شہزادی کی خوشامد کی اور کہا : ”شہزادی صاحبہ ! مجھے ایک بار معاف کر دیجئے اس کے بعد کوئی غلطی نہ کروں گا۔ آپ اطمینان رکھیے۔“

شہزادی بڑبڑاتی رہی : ”جب تک میں اس عمل میں ہوں، اور بادشاہ کی عطا کردہ آمانتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہوں میں شک حرا کا خیال تک لیتے دل میں نہیں لا سکتی اتم جس سارنٹ کو پرورش کر کے اپنے ساتھ لاتے ہو، میں بادشاہ کے سامنے اس کا پردہ چاک کر کے رہوں گی۔“

انجیل شہزادی کے قدموں میں گر گیا : ”مجھے معاف کر دیجئے شہزادی صاحبہ ! میں اپنے نازیبا طور و طریق پر تادم اور ہش معاف ہوں۔“  
 شہزادی نے اس کی پیشانی پر ایک ٹھوکر سید کر دی۔ یوں : ”ساق، ہیلن کے پاس

جادوہ تہیں تنگی کا ناچ نچائے گی ابھی تمہنے اسے سمجھا نہیں ہے اچھی طرح۔  
ایجل کی پیشانی سے خون جاری ہو گیا۔ لیکن شہزادی نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

کچھ عرصے بعد نوجوان بادشاہ محمد خان البشیر نے کوچک کی شہزادہ کو دیکھا کہ وہ اس  
آگیا۔ اس نے آتے ہی ایجل کو غیر متوجہ کر کے نظر بند کر دیا۔ ایجل کو شبہ نہ ہوا کہ سلطان  
کی یہ کامدانی یقیناً شہزادی کی رہا پر عمل میں لائی گئی ہے۔ اس وقت اسے شہزادی کے  
ساتھ ساتھ اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شہزادی کے دوہرے اس  
لے ہیلن کا نام لیا ہی کیوں اور جس مقصد کو لے کر وہ یہاں آیا تھا، اس کا اشارہ ہی سہی  
شہزادی کے سامنے ڈکمر ہی کیوں کیا؟  
لیکن اب تو تیرکمان سے نکل ہی چکا تھا۔ گزرے لمحات اور گزری باتوں کے  
ماجمے قائم ہوئے۔

اسی دوران سلطان محمد کی خدمت میں قسطنطنیہ کا ایک وفد حاضر ہوا قسطنطنیہ  
کے فرماں روا قسطنطین سینروہم نے سلطان کو نو عمر اور ناتجربہ بادشاہ سمجھ کر چہرہ چھٹا کر شروع  
کر دی تھی۔

سلطان محمد نے وفد سے دریافت کیا: "آخر تمہارا بادشاہ کیا چاہتا ہے؟"  
وفد کے قائد نے جواب دیا: "ہمارے بادشاہ نے سلطان عالی کو مطلع اور متنبہ  
کیلئے کہ آپ کے والد مرحوم کے زمانے سے قسطنطنیہ میں ادریان نامی ترک شہزادہ نظر بند  
ہے اس کے اخراجات آپ کی حکومت برداشت کرتی چلی آ رہی ہے، لیکن اب حالات اور  
وقت کے پیش نظر وہ رقم ناکافی ٹھہرتی ہے اس لئے ہمارے بادشاہ کا حکم ہے کہ اس میں  
اضافہ کر دیا جائے۔"

لفظ حکم نے سلطان کے جسم میں آگ لگا دی لیکن اس نے مصلحت اندیشی اختیار  
کی۔ وفد کے قائد سے پوچھا: اگر اس رقم میں اضافہ نہ کیا جائے تو؟

وفد کے قائد نے جواب دیا: "تب پھر ہماری حکومت میں امر ہو مجبور ہو جائے گی  
کہ شہزادے کو دہا کر دے تاکہ وہ شہزادہ اپنی گزیر لے کر کے لئے رقم کا انتظام خود کرے  
اور ان وسائل کو فراہم کرے جو اس کی تان و شکریت اور پریشہ آسائش زندگی کے لئے  
ضروری ہوں۔"

سلطان نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا بادشاہ ہمارے دو ہزار ایک افسر اور  
سلطنت کو لاکھ کھڑا کرے گا اور اس طرح وہ ہمیں ہمیشہ ان اور عاجز کرے گی کی کوشش  
کے گا۔"

قائم نے جواب دیا "نظر بند شہزادہ اور نہ کا طالب ہے اور ہماری حکومت  
کے خیال میں اس محروم شہزادے کو گزربسر کے لئے اگر وہ نہ بخش دیا جاتے تو کوئی  
معیوب بات نہ ہوتی۔"

سلطان نے کہا "تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ تمہارا مطالبہ  
نہیں غور ہے ہم اپنا حتمی جواب بہت جلد بھیج دیں گے۔"

قائم نے اصرار کیا "ہماری حکومت کو جلد از جلد جواب مل جانا چاہیے۔ کیونکہ جتنا  
زیادہ دقت گزرتی ہے گا ہماری حکومت نظر بند شہزادے پر فضول اخراجات سے زیادہ ہوتی  
جاتی گی۔"

دو دن واپس چلا گیا۔

سلطان نے اس کے جلتے ہی اٹھنا اور مل میں ایک شاندار قصر کی تیاری شروع کر  
دی۔ اس سے پہلے سلطان محمد اول نے قسطنطنیہ کے مقابل ایشیائی ساحل پر ایک قلعہ  
تعمیر کرایا تھا جس کا نام حصن اناطولیہ رکھا تھا، محمد ثانی نے قسطنطنیہ کے مقابل یورپی حصے  
میں ایک نئے قلعہ کی تعمیر شروع کرادی۔ یہ قلعہ روسیلیا نامی جگہ پر بن رہا تھا۔ ہزاروں  
مزدور اور محمل کام پر لگا دیئے گئے۔

قسطنطنیہ کو قلعہ کی تعمیر پر اعتراض ہوا، اسی نے سلطان کی خدمت میں ایک دفعہ  
اور مدعا کیا۔ اس دفعہ نے پہلے تو اس کا جواب دیا کہ سلطان نے ابھی تک قسطنطنیہ کے  
مقابلے کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سلطان نے اپنے وزیر خلیل پاشا کو حکم دیا کہ اس دفعہ  
کو اس کے سامنے مطالبے کا مسئلہ توڑ جواب دے دیا جائے۔

خلیل پاشا کا وہ جواب جو سلطان محمد ثانی کی ایسا اور مشورے سے تیار کرے  
رکھا گیا تھا، مدعی دفعہ کے حوالے کر دیا گیا، اس میں خلیل پاشا نے بہت سخت لہجہ میں  
اختیار کیا تھا۔

"اسحق اور پادشہت روسیہ ہمیں ہماری چالوں کا پورا علم ہے،  
اس کے برعکس ہمیں اس خطرے کا کوئی احساس نہیں جو تمہارے  
مصر پر مشتمل لادہا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ عطا سلطان (مرد ثانی) چل

بسا۔ آپ اس کا تخت ایک ایسے نوجوان فارغ کے قبضے میں ہے جو کسی بھی پابندی کا مبادا نہیں اور جس کے راستے میں کوئی بھی شکر کاوت نہیں بن سکتا۔ اگر تم اس کے ہاتھ سے بچ نکلے تو اسے خدا کی رحمت سمجھنا اور یقین کر لینا کہ ابھی خدا تمہارے گناہوں کی سزا میں ڈھیل دے رہا ہے تم بے سود اور بالواسطہ دھکیوں سے یہیں ڈولنے کی کوشش نہ کرو۔ تم شہنشاہی اور خاں کو رہا کر دو اسے اور بادشاہ بنادو تم دیر پا رہے ہو مگر یہی والوں کو اپنی مدد کے لئے بلانا، تم کو اس کی سبھی اجازت ہے کہ ہمارے خلاف مغربی قوموں کو بھی میدان جنگ میں لے آؤ، مغربی جو چاہو کرو، مگر یقین رکھو کہ نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلے گا کہ ہمیں اشتعال ملا دے اور اپنی تباہی اور بربادی کو اور قریب لے آؤ گے۔“

دوس وفد نے سلطان سے شکایت کیا کہ ”حضرت والا کے علم میں ہو گا کہ آپ کے جہاز میں آئے، یہاں قلعہ تعمیر کرنے کی اجازت طلب کی تھی، جسے مسترد کر دیا گیا تھا۔ اب آپ کسی اجازت اور معاہدے کے بغیر یہ قلعہ تعمیر کر رہے ہیں تو یہ معاہدے کی صریح خلاف ورزی ہے۔“

سلطان نے جواب دیا ”ابھی تک تمہارے شہر قسطنطنیہ کے خلاف میں کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور تمہارے شہر کی حدود اس کی فضاؤں تک ہیں، اس کے بعد جو کچھ ہے تمہاری حکمت کی حدود سے باہر ہے، تم اپنے بادشاہ سے کہہ دینا کہ اسی میں تم اہل و عسکری سے اتحاد کر کے ہمارے ملک پر حملہ کر رہے تھے اور فرانسیسی بیڑے نے درۃ وانیال کو روک لیا تھا۔ لیکن میرے والد مراد نادر وقت سے کام لے کر آجاتے باسفورس سے گزر گئے۔ اس وقت میں خود اڈریا نڈل میں کسں تھا۔ اپنے بادشاہ سے پوچھنا کیا وہ اس ماضی کو بھلا چکا ہے، جب مسلمان کانپ رہے تھے اور تم لوگ ان کی صفت چھیننے کے دہے تھے۔“

دفتر کے قائم نے سوال کیا ”لیکن حضرت والا ان تمام ہالوں کا قلعہ کی تعمیر سے کیا تعلق ہے؟“

”بالکل ہے“ سلطان نے طیش میں کہا۔ ”اس جنگ میں دلاسا کے میدان میں جب میرے والد نے فتح حاصل کی تھی تو اسی وقت یہ قسم کھائی تھی کہ باسفورس کے مغربی ساحل پر قلعہ مزید تعمیر کرادی گا اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے والد کی قسم پوری کروں۔“

قائد نے دلبری سے عرض کیا: "لیکن حضور والا کو یہ بھی علم ہوگا کہ اس کے ناخوشگوار نتائج بھی نکل سکتے ہیں۔"

سلطان نے مشتعل ہو کر جواب دیا: "بے شک ناخوشگوار نتائج نکل سکتے ہیں لیکن کس کے خلاف؟ کس کے حق میں؟ یہ فیصلہ وقت سر سے گا میں تمہاری حکومت کو یہ حق نہیں دے سکتا کہ جس خطے کا میں مالک ہوں وہ وہاں میرے اعمال پر یا بنیادیں قائم کرے۔ یہ خطہ میرے۔" باسفورس کے ایشیائی ساحل پر ترک آباد ہیں اور اس لیے یہی ساحل کو ردیوں نے خود ہی خالی کر دیا ہے، یہاں قلعہ تعمیر ہو کر ہی رہے گا۔"

وفا کے قائد نے پوچھا: "کیا یہ سلطان والا کا نظری اور آخری جواب ہے؟" "ہاں قطعی بھی اور آخری بھی۔ تم لوگ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ موجودہ عثمانی سلطان اپنے پیش روؤں سے بالکل مختلف ہے۔ تمہارا میرے عزائم میرے اپنے پیش روؤں کی خواہشات سے بھی آگے ہیں، میں وہ سب کچھ پورا کر دیتا چاہتا ہوں جو میرے آباؤ اجداد کے اداواروں میں بھی نہ تھا۔"

وفا کے واپسی کے لئے حرکت کی۔ پوچھا: "کیا ہم لوگ جاسکتے ہیں؟" سلطان نے جواب دیا: "ہاں اب تم لوگ جاسکتے ہو، تمہیں یہ حفاظت جانے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن جلتے جاتے یہ بھی جلتے جاؤ کہ اگر میرے پاس اس سلسلے میں پھر کوئی سفیر آیا تو وہ کھال کھینچے جانے کا مستحق قرار دیا جاتے گا۔"

وفا چلا گیا۔ قلعہ کی تعمیر کا کام ہوتا رہا۔ عیسائی اس تعمیر کو یاد دل بخوانہ گوارا گئے رہے۔ یہ قلعہ تین ماہ میں بنایا ہو گیا۔ دوسری طرف اڈنیا ٹوپل کا قلعہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کا نام جہاں نما اور قلعہ کا نام حصن یوسفیلا رکھا۔ قلعہ کی شکل مثلث تھی اور اس کے ہر گوشے پر نہایت مضبوط اور مستحکم برج بنوائے گئے تھے اس کی دیوار میں بائیس فٹ جوڑی تھیں لیکن برجوں کی چوڑائی تیس فٹ رکھی گئی تھی۔

سلطان نے قلعہ کی تعمیر کے بعد جہاں فوج بٹھادی اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنے گھوڑوں اور خیموں کو اس پاس کی چراگاہوں میں پھرائیں اور اگر کوئی مقامی شخص مزاحم ہونے کی کوشش کرے تو اسے مزار دی جائے اس کے ساتھ ہی سلطان نے یہ حکم بھی دیا کہ ساحل سے گزرنے والے جہازوں سے محصول وصول کیا جائے۔ دسین کے ایک جہاز نے سلطان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تو اسے توپ زنی کر کے سمندر کی تہ میں

بٹھا دیا گیا۔

★

★

★

سلطان نے ایجنل کو اس وقت طلب کیا جب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ شاید سلطان نے اسے فراموش کر دیا ہے۔ لیکن جب سلطان کے آدمی لے لے کر آئے کہ ”تمہیں سلطان یاد فرما رہے ہیں“ تو اس کی آدھی جان نکل گئی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں پوچھا ”میرے بھائی! مہربان سلطان کے پاس سے چلے گئے اس وقت اس کے چہرے پر ایسی کیفیت پائی جاتی تھی“

سلطانی خدمت گار نے جواب دیا: ”کس میں اتنی اہمیت ہے کہ سلطان کے چہرے کو غور سے دیکھ سکے؟“

ایجنل چلکرا ہوا تھا بولا: ”تم ٹھیک ہی کہتے ہو میرے بھائی! میں اتنی اہمیت ہے کہ سلطان کو نظر بچھ کرے دیکھ سکے۔ لیکن تم یہ ضرور بتا سکو گے کہ اس وقت سلطان کا لب دلچہ کیسا تھا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ سلطان کے کچے میں عام سی کیفیت پائی جاتی تھی یا اس میں نا اہمی اور غصہ بھی شامل تھا؟“

خدمت گار نے جھنجھلا کر کہا: ”اب زیادہ باتیں مت جا۔ میں نہیں جانتا کہ سلطان کے لب دلچہ میں غصہ تھا یا نہیں تھا؟“

ایجنل پوچھ چل قدمیں سے چل پڑا: ”خدا خیر کرے۔ معلوم نہیں کہ میں دلچہ آگیا، سر دیا، یا بری سرسکوں زندگی گزار سکتا تھا؟“

خدمت گار نے طنزاً کہا: ”مہربان آؤ! اس کی شامت دھکا کوئی ہے تو اسے یہی دن دیکھنا پڑتا ہے۔“

ایجنل نے تشویشناک انداز میں کہا: ”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی خطرے کی بات ہے۔ ضرور۔ یا میرے خدائے امیری جان پکا۔ میں بالکل بے قصور اور سلطان کا جان نثار اور وفادار ہوں؟“

جب وہ سلطان کے سامنے پہنچا تو دیکھا، سلطان کچھ افسردہ بیٹھا ہے۔ ایجنل کی حالت اس وقت اور زیادہ غیر اچھی ہو گئی۔ مہربان! ایک در خدمت گار دہانے اس کی دردناک طرف کی بغلیں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے قابو میں کر لیا۔ اپنی والائت میں اسے یقین ہو گیا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اسی وقت سلطان کے اشارے پر ایک



اور شخص موجود ہوا اور وہ سلطان کے سامنے بائیں طرف کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اس شخص سے کہا: ”تم اس نابکار سے پوچھو کہ اس نے سردیا میں اپنے شب دروز کس طرح گزارے؟“

اس شخص نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجیل پتھر پتھر کاٹنے لگا۔ دہشت سے اس کی زبان تنگ ہو گئی تھی۔ سلطان نے درشت پہنچے میں کہا: ”اس سے جواب لیا جلتے“۔ سلطان کی ماتم سے نے سختی سے کہا: ”جواب کیوں نہیں دیتا ظل ہما نہیں چاہا کہ کسی صفائی کے بغیر ہی سزا پا جائے“۔

اینجیل نے گروہ لڑتے ہوئے کہا: ”حضور والا اس سردیا والوں نے میری اتنی صفائیاں کیں اتنی دعوتیں کیں کہ میں دعوتیں اڑانے کے علاوہ کچھ کر ہی نہ سکا“۔ سلطان نے کہا: ”اس سے پوچھو یہ قسطنطنیہ کیوں گیا تھا کیا وہاں بھی دعوتیں اڑانا رہا؟“

ماتم سے نے سلطان کا سوال دہرایا۔ اینجیل کے رہے سبے حواس بھی رخصت گئے وہ دونوں خدمت گاروں کے بازوؤں میں کسی شرابی کی طرح جھول گیا سبے اختیار ”سلطان معظم رحمہ اللہ“

سلطان نے پوچھا: ”رحم کیوں؟ کس بات پر رحم؟ کس جرم پر رحم؟“ اینجیل کی پھر سمت بندھی، بولا: ”حضور والا کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے عزیز اور احباب قسطنطنیہ میں بھی ہیں اور وہاں مجھے سینٹ ابا صوفیہ کی زیارت کروانا تھا“۔

سلطان نے اپنے ماتم سے کے ذریعہ سوال کیا: ”میری ساری باتیں مشتبہ ہیں؟ ہر بات، تیرا ہر جواب شک آلودہ ہے اور کیا کرنے یہ مثل نہیں سکتی کہ ایک جھوٹ سی پر داری کے لئے لائے اور وہ جھوٹ بولنا پڑتے ہیں“۔

اینجیل کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے یہی سلطان کو سب سے پہلے ہرچکا ہے ہوا اگر معلوم ہوا ہے تو اس معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟ سلطان نے کسی کو حکم دیا: ”اسے حاضر کیا جائے“۔

اور ذرا دیر بعد وہ خدمت گار ایک اور شخص کو اپنے بازوؤں میں لے کر ہوئے سلطان کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ اینجیل نے اس شخص کو پہلی ہی نظر میں لیا۔ یہ ماتم تھا۔

سلطان نے مائیکل کو حکم دیا کہ یہ بدریخت جس منصوبے کے ماتحت یہاں آیا ہے اسے بیان کیا جائے۔

مائیکل نے قرقروہ سب کچھ بتانا شروع کر دیا جسے لپوڈا کر کے انجیل ہیلن کھاتل کر لیتا۔ اس نے اپنی ماہ کے اس بھاری پتھر کو درگم کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ سلطان سے مل کر انجیل کا حامی منصوبہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

مائیکل نے کیا کچھ کہا، انجیل پوری طرح نہیں سن سکا کیونکہ خوف اور دہشت سے دل اتنی دندنہ سے دھڑکا کہ بعد میں ڈوبتا چلا گیا آنکھوں کے آگے بے وقت کی سیاہی دوڑتی چلی گئی اور انجیل بالکل بے جان سا ہو کر دونوں خدمت گاہوں کے بانڈوؤں میں جھولنے لگا۔ مگر دن ایک طرف جھک گئی اور دہانے ہوش و حواس کھو دینے کی وجہ سے سلطان رعب و ریدہ اور عتاب سے نجات پا گیا۔

\*

\*

\*

قسطنطین نے بھی تمام مسیحی دنیا کو اپنی مدد کے لئے آواز دی ابھی تک مسیحی دنیا بڑھتی ہوئی تھی۔ ایک حصہ چرچ آف ارم کے زیر اثر تھا اور یہ پوری مغربی دنیا پر حاوی تھا، دوسرا حصہ چرچ آف ارم کے دائرہ اثر میں تھا، یہ قسطنطین کے ماتحت تھا اور اس اشرقی حصوں میں ان دونوں حصوں نے نہایت دانشمندی اور ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے دھماکے پلوپ کو لکھا: "جناب دلالا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے مذہبی اختلافات چھوڑیں اور سب متحد اور متفق ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں، میں یحییٰ بن آپ کے عقائد کو تسلیم کرتا ہوں اور آئندہ قسطنطین کا گھر جابھی آپ ہی کے ماتحت ہو گا۔"

اس پیش کش اور جذبہ کاربند نے وہ کام کیا جو پڑی پڑی تدبیریں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ پوپ نے خوش ہو کر پورے بڑا عظم پوپ میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ مسیحی اور عیسائی بحری اور برہمنی لوہیں قسطنطین کی طرف چل پڑیں اس میں کی شمالی سیاست اور گون اور سطر کے مزید دستے بھی قسطنطین کی مدد کے لئے حرکت میں آ گئے۔

ادھر ہنگری سے ایران نامی ایک شخص سلطان محمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بیان اہل وطن اور ہم تو سون کی ناقصی کا شکار تھا۔ اس نے سلطان کے پاس آکر اسلام قبول کر لیا اور بتایا کہ وہ سلطان کے لئے بہترین ڈیوار تو ہیں تیار کر سکتا ہے پہلے تو سلطان وہی طرح اس کا منصوبہ سمجھنا اس کے بعد اس نے حکم دے دیا کہ تو یہیں تیار کی

جائیں۔ امان توپوں کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔

اینگل کو حیرت اس بات پر تھی کہ سلطان نے اسے فوراً ہی قتل کیوں نہ کر دیا۔ دورانِ اس کے پہرے داروں نے بتایا کہ سلطان بطور خاص توپیں تیار کر رہا ہے اور ان میں سے کسی ایک توپ میں اینگل کو ڈال کر قسطنطنیہ کے اندر پھینک دیا جائے گا۔ اینگل کا خودی اک ہزار کا حال سن کر تپ مچ رہا ہو گیا اور روتے روتے آتش بھی خشک ہو گئے۔ اب اس نے تو ماریہ یاد آ رہی تھی اور نہ ہیلن مائے دردوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

سلطان محمد اپنی فوجوں کے ساتھ قسطنطنیہ کی تفصیل کے نیچے پہنچ گیا اور اسے کا خشکی کی طرف سے محاصرہ کر لیا۔ قسطنطنیہ والوں نے بھی تفصیل کے برجوں پر توپیں چڑھ دیں اور ان پر بے شمار آدمی متعین کر دیئے۔ بحیرہ ارمورہ میں سلطان کے جہازوں سے قسطنطنیہ کی مدد کے لئے آنے والے بحری جہازوں کا راستہ روک رکھا تھا۔ اسی دوران میں ایک بحری جہازوں نے سلطان کی بحری ناکہ بندی کو توڑ دیا اور سامانِ رسد و آمدت کے جلیق با سفورس سے شاخِ زہری میں داخل ہو گئے۔ سلطان یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساحلِ سمندر پر اپنے دستے کے حاکم بے چینی سے اِدھر اُدھر گھومتے دوڑتا پھر رہا۔ اسے اپنی بحری ناکہ بندی کے ٹوٹ جانے کا جھٹکا مل رہا تھا۔ ان جہازوں کے بعد پانچ اور نمودار ہوئے اور سلطان نے اپنے امیر البحر کو حکم بھیجا کہ ان جہازوں کو ہرگز نہ نکلنے دے۔ ترکی بحریہ حرکت میں آگئی اور اس نے دشمن کے جہازوں کو محاصرے میں لے لیا۔

نہک بحری سپاہ دشمن کے جہازوں پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی اور دشمن انہیں روک رہا تھا۔ قسطنطنیہ کی تفصیل پر چڑھے ہوئے عیسائی بھی اس کشمکش کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ترکوں کے جہاز بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور غنیمت کے جہاز بہت بڑے بڑے تھے۔ ترکوں کے جہازوں نے پنج میں گھومتے ہوئے دشمن کے جہازوں لگ رہے تھے گویا نے دیو دژن کو محاصرے میں لے رکھا ہے۔ پھر اچانک یہ تماخا دیکھنے میں آیا دشمن کے ترکی بحریہ کی ناکہ بندی توڑ کر تیزی سے شاخِ زہری میں داخل ہو گئے۔ شاخِ زہری میں کناہ سے دو سرے کنارے تک ایک موٹی فولادی زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ قسطنطنیہ والوں نے اس زنجیر کو پھیل دیا اور ان کے امدادی جہاز شاخِ زہری میں محفوظ ہو کر ان کے پیچھے پیچھے ترکی جہاز بھی آگئے۔ لیکن ان کے آتے ہی زنجیر کھینچ کر دیو دژن کی طرف سے کر دی گئی جس سے ترکی شاخِ زہری میں نہیں داخل ہو سکے۔ اس ناکامی نے سلطان بے قابو کر دیا اس نے اسی وقت اپنے امیر البحر کو طلب کیا اور اس کی ٹکوں اور

پہچانی کہ روی اس مروت نے یہ اثر ضرور دکھایا کہ اس کے بعد کوئی جہانہ نہ کوئی بحری  
بہنری کہ نہیں توڑ سکا۔

سلطان محاصرہ کرتے پڑا تھا۔ ایجنل نظر بند تھا۔ سلطان کا دوری نے ایجنل کو  
برے سکین بننا شہزادی ماریہ کو ایجنل کے زیرِ عتاب آنے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ہم قوم  
بسی بھی طرح بچا لینا چاہتی تھی، اس نے شاہی پہرے داروں کو رشوتیں دے کر ایجنل سے  
ادارہ کر کوئی منصوبہ بنانے کی سازش کی۔ رات کی تاریکی میں جبکہ لوگ خواب خرگوش  
منڑے لیتے ہیں، شہزادی مردانے لباس میں ایجنل کے پاس جا پہنچی ایجنل پہلی نظر میں  
پرچان نہیں سکا۔ وہ سمجھا کوئی تہکی شہزادہ اس کی دہان لیتے آ رہا ہے۔ وہ شہزادی کو  
جتے ہی ٹوٹ گڑایا "معرز شہزادے ہیں بالکل بے گناہ ہیں، آپ یقین کریں میری خطا  
ما تھی سہی ہے کہ میں مسویا کے بادشاہ کی بیٹی ہوں، میں سے محبت کرنے لگا ہوں اور  
پیری خوش قسمتی کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اور یہ کجحت مائیکل، جس نے ایک  
نوش تیار کر کے مجھے گرفتار کر دیا ہے، دماغل میرا نہ قیب ہے اور چاہتا ہے کہ  
ہیلن اور اس کے دو میان سے دور ہو جائیں، اب آپ ہی غور فرمائیے کہ میں کس حد  
لگا ہنگار یا مجرم ہوں؟"

شہزادی ماریہ کو اس انکشاف سے ذہنی اذیت پہنچی۔ وہ کچھ دیر کھڑی بس  
عقی رہی، ایجنل کے ہوش و حواس بہر محنت کی دہشت دھند کی طرح چھانی ہوئی تھی  
انکھیں دکھتا تھا لیکن ان کی بصارت ناقابلِ اطمینان تھی۔

ایک چہرے دار نے ایجنل کو جھڑکا "تو یہ کیا ہے سرور یا تقریر کر رہا ہے اور کس کے  
نے کر دیا ہے، ہوش و حواس میں رہ کر کام کی باتیں کر لے کیونکہ وقت بہت کم ہے؟"  
ایجنل نے بے بسی سے جواب دیا "افسوس کہ میری عقل کام نہیں کر رہی، شہزادے  
بہت سے تعارف کر دیا جائے اور غایت ملاقات بتادی جائے؟"

شہزادی نے اس کی پریشانی دور کر دی بولی "ایجنل میں ہوں اور یہ۔ مجھے  
اپنے کی کوشش کرو؟"

ایجنل کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ بھٹی بھٹی لگا ہوں سے شہزادی کو  
جئے لگا، اسے فوراً ہی اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہوا کہ اس نے ہیلن کا ذکر خواہ  
اہ کر دیا۔

شہزادی نے پوچھا "ایجنل! تم سچ سچ بتاؤ کہ تم پر جو الزام لگایا گیا ہے

وہ کس حد تک صمیم یا غلط ہے؟  
ایجنل کو جو کچھ کہنا تھا وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا، اس نے مختصراً کہا: مجھ بہترین  
باندھا گیا ہے، تم مت رنج ہو، یہ بے گناہ ہوں۔  
شہزادی نے انہوں سے کہا: لیکن تم اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتے۔  
ایجنل نے جواب دیا: ہاں یہ بات بھی ہے۔  
شہزادی نے کہا: اگر تم واقعی بے گناہ ہو تو ایک بار پھر تم سلطان کو  
بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرو، کیونکہ میں بڑا اثر ہوتا ہے اور یہ دل  
ٹکاتا ہے۔

ایجنل نے خوشامدی: شہزادی صاحبہ، کیا میں معاملے میں آپ میری کوئی  
میں نہیں کر سکتیں؟  
شہزادی نے جواب دیا: سلطان تو عزم ور ہے لیکن اس کے ارادوں میں  
خوالہ کی سی سختی ہے، اگر اس نے تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو تم یقیناً  
کہ اسے بدل لا نہیں جاسکے گا۔  
ایجنل نے روتے ہوئے کہا: تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں قتل  
جاقی گا۔

اسی وقت ایک خوفناک دھماکے نے سب کو ہلا دیا۔  
شہزادی نے گھبرا کر پوچھا: یہ دھماکہ کیا ہے؟  
پہرے دار نے جواب دیا: اسباب نامی ہنگامی کے ایک کارنگر نے سلطان  
نے توپ بنائی ہے۔ یہ شاید اسی کا تجربہ کیا گیا ہے۔  
شہزادی نے پوچھا: یہ تجربہ یہاں سے کتنی دُور کیا گیا ہے؟  
پہرے دار نے جواب دیا: جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے یہاں سے تقریباً  
میل دو سو بیس تجربہ کیا گیا ہے اور اس توپ سے تقریباً چھ سو پونڈ کا سنگی گولہ پھینکا  
جواسہاں کے اندر سے کے مطابق ایک میل کے فاصلے پر گر رہا ہوگا۔  
شہزادی نے کہا: اگر یہ ساری باتیں درست ہیں تو میں یہ بات تسلیم کر لیتی  
کہ اب قسطنطنیہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے۔

ایجنل اور دوسرے قہر مند گمراہ تھے، بولا: اور اگر یہ درست ہے کہ توپ تیار  
چکی ہے تو اب میں بھی بس چند دنوں کا مہمان ہوں کیونکہ میں نے سن رکھا ہے کہ مجھے تو

دہانے میں رکھ کر اڑا دیا جاتے گا اور قسطنطنیہ والوں پر میرے خون کا چھڑکاؤ ہو جائے گا  
اور میرے اعضاء جسمانی کے ریزے ہوا میں بکھر جائیں گے؟  
شہزادی نے ہنس کر پوچھا: یہ تجھے کس نے بتا دیا کہ تو توپ میں رکھ کر اڑا  
دیا جائے گا؟

ایجل نے جواب دیا: انہی پہرے داروں میں سے کسی نے بتایا تھا؟  
شہزادی نے افسوس کا اظہار کیا: "ایجل! مجھے افسوس ہے کہ میں تجھے اتنا بزدل  
نہیں سمجھتی تھی؟"

ایجل نے کہا: "میں بزدل نہیں ہوں شہزادی صاحبہ! بلکہ اپنے بے گناہی کی محنت  
نہانے کا قبل از وقت افسوس کا اظہار ہے؟"

"اگر تم محمد کو داغی بے گناہ سمجھتے ہو تو تمہیں مطمئن ہو جانا چاہیے، بالکل سچ  
اسی طرح، جو چپ چاپ صلیب پر بچھ گئے تھے؟  
ایجل نے سسی حد تک اطمینان کا اظہار کیا بولا: "میں صبر و شکر سے جان جینے کی  
کوشش کروں گا۔"

شہزادی نے واپس جاتے ہوئے کہا: "میں کوشش کروں گی کہ تم پرے جاؤ لیکن  
قبل از وقت اس کا وعدہ نہیں کر سکتی؟"

شہزادی نے جاتے جاتے پہرے دار سے کہا: "تم اس کا اس دقت تک خیال رکھو  
کہ جب تک سلطان کوئی قطعی فیصلہ نہ صادر فرمادیں؟  
پہرے دار کیا بولنا، اسے تو اس ملاقات ہی کے بدلے کافی انعام مل چکا تھا۔"

❖

❖

❖

سلطان گھنٹوں قسطنطنیہ کی فصیلوں کا نقشہ سامنے بچھاتے اس کے کمرے جھڑن  
کی جستجو میں لگا رہتا اس کی بنیاد حرام ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔  
سلطان جنگ کے پہرے ملو پر نظروں رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان ممکنہ سازشوں سے  
بھی چوکتا تھا جو اس موقع پر عمل میں لائی جاسکتی تھیں سلطان کو اس واقعے کی بھی اطلاع  
مل گئی کہ شہزادی سردیا اپنے ہم قدم ایجل کو مدد ملی تھیں۔ میں کو حال ہے شہزادی نے ایجل  
سے کیا باتیں کیں اور ایجل نے کیا کچھ کہا تھا۔ اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا لیکن اس میں اسے  
کوئی ایسی بات نہیں ملی جس کو بنیاد بنا کر وہ ان دونوں کے خلاف کوئی کارروائی کر سکتا۔

انہی حالات میں اس کے خبروں نے یہ خبر بھی گردش گزار کی کہ اس کے وزیر خلیا  
پاشا سے دشمنوں کے گہرے تعلقات وہ چکے ہیں اس لئے اس نازک وقت پر اس سے  
ہوشیار اور محتاط رہا جائے۔ سلطان نے خلیل پاشا کے وزیر مرزا کی کڑی نگرانی کی اور اسے  
ان میں کوئی بات بھی مشتبہ نظر نہیں آئی اور حضرت خلیل پاشا بھی غافل نہیں تھا، ہر دفعہ  
سلطان کی طرف سے چونکا رہتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی، اول نصف شب کے پہرے دار آہم نے جا رہے  
اور ان کی جگہ بقیہ نصف شب کے پہرے دار نے رہے تھے سلطان اس وقت بھی جا  
رہا تھا۔ اس کی خواب گاہ میں اس وقت بھی روشنی ہو رہی تھی۔ سلطان نے خلافِ توف  
تالی بجائی۔ تالی کی آواز پر ایک پہرے دار حاضر ہو گیا۔ سلطان کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں  
اس نے تھکی تھکی نظروں سے پہرے دار کی طرف دیکھا تو وہ کانپ گیا۔ سلطان نے سر خم  
لیجے میں حکم دیا: "خلیل پاشا کو حاضر کیا جائے۔"

پہرے دار پریشان ہو کر خواب گاہ سے نکلا اور خلیل پاشا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ یہ  
اس وقت سوئے کی تیاری کر رہا تھا، سلطان کے فرمانِ طلبی نے خلیل پاشا کے ہوش و خوا  
الٹا دیئے۔ اس نے پہرے دار سے پوچھا: "میرے عزیز دوست! خدا تمہاری عمر دراز کرے تو  
یہ تو بتاؤ اس وقت سلطان کی مزاحی حالت کیسی ہے؟"

پہرے دار نے جواب دیا: "حضور والا! ان کے لیجے میں کچھ روشنی پائی جاتی ہے  
خلیل پاشا کا دل دھڑکنے لگا۔ پوچھا: "سلطان کے پاس اندرون کون ہے؟"  
پہرے دار نے جواب دیا: "سلطان اپنی خواب گاہ میں تنہا ہیں۔"

خلیل پاشا جمبات جانتا رہا تھا وہ ابھی تک نہیں جان سکا تھا۔ پوچھا: "اس  
کے پاس اول شام سے کون کون آیا اور سلطان کے پاس کتنی کتنی دیر تک ٹھہرا رہا؟"  
"جناب والا! پہرے دار نے تنگ آ کر جواب دیا: "میرا پہرہ نصف شب کے  
منشروع ہوتا ہے اور میں ابھی ابھی پہرے پر آیا ہوں آپ کے سوال کا جواب مجھ سے  
والا پہرے دار ہی دے سکتا ہے۔"

خلیل پاشا اس دہم میں تھا کہ پہرے دار جانتا سب کچھ ہے لیکن شاید  
نہیں جانتا۔ اس نے کہا: "تم یہیں ٹھہرو، میں اپنے بیوی بچوں سے مل کر بھی آتا ہوں۔"  
خلیل پاشا اندر گیا تو اس کی بیوی نے کہا: "آج صبح سلطان کی طرف سے  
میری بلایا تھا۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کے ایک اہم قوم اور ہم وطن کو سزا دیدہ یا شاہ۔"

عقاب سے بچا لیا جاتے۔“

خلیل پاشا نے افسوس سے جواب دیا: ”خاتم! سلطان نے مجھے بے موقع طلب کیا اور میں نہیں جانتا کہ میں وہاں سے تندرہ واپس آسکوں گا یا نہیں، یہ دقت ایسا نہیں ہے کہ میں کسی سیسی کی سلطان کے روبرو سفارتی کمروں“

بیوی ڈر گئی۔ بولی: ”اگر ایسا ہے تو میں آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“

خلیل پاشا نے جواب دیا: ”تو گویا تم یہ چاہتی ہو کہ میں حکم عدولی کر کے سلطان کے عائد کردہ جرم کو تسلیم کر لوں۔ اس دقت میں غلط ایک قدم بھی اگر اٹھا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں تباہ دہر باز کہہ دیا جاؤں گا۔“ پھر خلیل پاشا نے اپنی بیوی سے کہا: ”کیا ملے بچے سوچتے؟“

”ہاں ابھی سوچتے۔“

خلیل پاشا اٹھ کر بیچڑ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔ اور باری باری ہر ایک کے سر پر ہاتھ پڑھا اور انہیں کھڑے رہ کر کچھ دیر تک نہایت محبت اور شفقت سے دیکھا۔ اس کے بعد نہایت آہستہ سے کہا: ”میرے بچو! خدا حافظ تم سو رہے ہو شاید کل صبح جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو تم خود کو یتیم دیکھو گے، کیونکہ سلطان کی بے وقت طلبی کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ مطلب یہ ہے کہ سلطان کو تمہارے باپ کے دشمنوں نے ضرر و غلا پہنچا ہے اور سلطان اس دقت مجھ سے کچھ ایسے سوالات کرے گا جن کے جواب پر ہی میں قتل کر دیا جاؤں گا اور تم سب ایک ہی دن میں یتیم ہو جاؤ گے۔“

خلیل پاشا کی ان باتوں کا جواب کون دیتا کیونکہ بچے تو سو رہے تھے۔

خلیل پاشا نے باری باری جھک کر ان کی پیشانیوں کو بوسہ دیا اور خواب گاہ سے نکلنے لگا تو دیکھا اس کے پیچھے ہی اس کی بیوی بھی موجود ہے۔ خلیل پاشا نے پوچھا: ”تم یہاں کیا لینے آگئی تھیں؟“

بیوی نے تشویشناک آواز میں پوچھا: ”تم ان سوتے ہوئے بیچڑ سے ابھی کیا کہہ رہے تھے؟“

خلیل پاشا نے جواب دیا: ”میں نے جو کچھ کہا تم نے سن لیا ہے پھر فضول سوالوں کا مطلب؟“

بیوی نے کہا: ”دہی تو میں جانتا چاہتی ہوں کہ تم سلطان کے پاس جا رہے ہو یا کسی جلاؤ کے پاس؟“



خلیل پاشا نے بیوی کو جھڑک دیا۔ دیواریں بھی کان رکھتی ہیں تم ایسے باتیں مت کرو۔“

بیوی مردہانسی ہو رہی تھی، بولی: ”میں اپنی یا بچوں کی موت سے نہیں ڈرتی۔  
بمذکر جب تم ہی نہ رہو گے تو میرا یا ان بچوں کا مندرہ مہنا بھی فضول ہے، اگر تم نہیں بھرتے  
ہے کہ تم زندہ نہیں ہو تو مجھے تو یہ سہا خنجر اس سے تم ہم سب کا کام تمام کر دو، اور کچھ  
نہایت اطمینان سے سلطان کے روبرو حاضر ہو جاؤ۔“

خلیل پاشا نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پوچھا: ”گھر میں کتنی اشرفیاد  
موجود ہوں گی؟“

بیوی نے حیرت سے سوال کیا: ”اشرفیاں کا کیا سروے؟“  
خلیل پاشا نے کہا: ”انہیں ایک کشتی میں لے آؤ، انہیں مندرے کے طور پر  
سلطان کی خدمت میں پیش کرنا ہے اس طرح ممکن ہے سلطان انہیں معاف کر دے۔“

\*

\*

\*

بیوی نے سسکیاں بھرنا شروع کر دیں اور اپنا سر خلیل پاشا کے کان دھے پر  
کر دے لگی۔ فلاسی و میرین آئندوں نے خلیل پاشا کے شانے کو تر کر دیا۔  
خلیل پاشا نے اشرفیوں والی کشتی ایک خادم کے سر پر رکھی اور شاہی پہرے  
کے ساتھ سلطانی خواب گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان خواب گاہ کے دروازے تک خلیل پاشا کی پیشوائی کو پہنچا خلیل پا  
نے نہایت ادب کے ساتھ مراکم شاہانہ ادا کئے اور خادم کے سر سے اشرفیوں کی کشتی۔  
کر سلطان کی خدمت میں پیش کر دی۔  
سلطان نے اشرفیوں کو کشمکشیں ٹھہروں سے دیکھا اور سوال کیا: ”اشرفیاں لانا  
مطلب کیا میں نے تم سے اشرفیاں طلب کی تھیں؟“ پھر اپنے پہرے دانہ کر بھر کا۔  
نے خلیل پاشا کو کیا پیغام دیا تھا؟“

پہرے دار نے عرض کیا۔ ”ناچیز نے عرض کیا تھا کہ حضور والائے دند بر اعظم کو اسی وقت طلب فرمایا ہے۔“

سلطان نے خلیل پاشا سے کہا۔ ”کیا اس پہرے دار نے یہی کہا تھا؟“  
خلیل پاشا سلطان کے اضطراب اور بے چینی کو دیکھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے عرض کیا۔ ”ناچیز نے اگر اشرقیان لانے میں کسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے تو یہ اپنی نادانستہ غلطی پر معافی کا خواستگار ہے۔“

سلطان نے درشت لہجے میں کہا۔ ”خلیل پاشا! میں نے تمہیں جو کچھ دے دیا اسے واپس لینے کی میں کوئی خواہش نہیں رکھتا میں تاجر نہیں، ایک سلطان ہوں۔“  
پھر کچھ دیر تک کہہ کر کہا۔ ”میں ایک نہایت قیمتی تحفہ لینا چاہتا ہوں۔“  
خلیل پاشا نے عرض کیا۔ ”حضور ارشاد تو فرمائیں، یہ ناچیز اپنی جان تک نذر کرنے کو تیار ہے۔“

سلطان نے قسطنطنیہ کے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں قسطنطنیہ سپاہیوں، یہ قسطنطنیہ۔“

خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا۔ ”پوری رومی سلطنت حضور والا کے زیر نگیں آ چکی ہے بس یہی ایک شہر باقی رہ گیا ہے، سو یہ بھی آج ہی کل میں سلطان کے قبضے میں آجائے گا۔“

سلطان نے کہا۔ ”خلیل پاشا! ادھر آؤ میرے ساتھ۔“  
خلیل پاشا سلطان کے ساتھ اس کے بستر تک چلا گیا سلطان نے اپنے تکیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”خلیل! تم میرے اس تکیے کو غور سے دیکھو، اس پر تمہیں کہیں بھی کوئی دشمن یاد باق نہیں ملے گا، یہ اس لئے کہ میں نے ابھی تک اس پر اپنا سر رکھا ہی نہیں۔ ہاں میں کبھی تکیے کو اٹھا کر ادھر دکھ دیتا ہوں اور کبھی ادھر دکھ دیتا ہوں، کبھی ادھر بیٹھ گیا کبھی ادھر بیٹھنے لگا۔ میری نیند اٹھ چکی ہے۔“ پھر معلوم نہیں کیوں، اس نے خلیل پاشا کو نصیحت کی۔ ”خلیل پاشا! میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ روڈیو کی میم دزد کی ترغیب سے بچو جنگی قوت میں ہم ان ہر فائق ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رسول مقبول کی برکات سے ہم بہت جلد قسطنطنیہ کے مالک بن جائیں گے۔“

خلیل پاشا نے صدارتے آدین بلند کی۔

سلطان نے مزید کہا۔ ”میں اکثر بھیس بدل کر بازاروں اور اپنے نوجوانوں میں نکل

جاتا ہوں اور ان کی ہمت اور حوصلے کا اندازہ لگایا کرتا ہوں، میں ان کی باتیں سن کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے آدمیوں کے حوصلے بہت بلند ہیں۔ بالکل میری ہی طرح۔ اتنے یکساں حوصلوں کو شکست نہیں دی جاسکتی، اور خلیل پاشا! ہم بہ جنگ دفاعی نہیں جاملتے اور یہ ہیں مبار جانہ جنگیں کمتر ہادی گئی ہیں۔“

”حضرت والا بجا فرماتے ہیں!“

سلطان نے کہا۔ ”تم یہ بھی مہانے ہو کہ آج جو سیسی فوجیں ہم سے برسر ہیکار ہیں، کل تک ان میں کی کئی ہماری دوست رہ چکی ہیں۔“

”حضرت والا کا ایک ایک لفظ سچائی سے لبریز ہے۔“

لیکن اب یہ ہمارے دوست نہیں رہے، میدان جنگ میں ہم دشمنی کی عمر میں سے مصافحہ کرنے نہیں آتے ہیں، بلکہ اب ہماری ہتھیالیوں کے بجائے تلواریں نکلتی ہیں گی۔“

خلیل پاشا نے سر نیاز جھکا دیا۔ بولا۔ ”حضرت والا کا یہ نکتہ بھی نا پیر کے دل و دماغ میں خوب اچھی طرح جاگزیں ہے۔“

سلطان نے کہا۔ ”تب پھر تم سباق اور اپنے فکر قدر تیری جملہ فوجیں اس امر میں لگا دو کہ قسطنطنیہ کی تسخیر میں کن کن تمام امور کو رو بہ عمل لایا جاسکتا ہے اور ہم اپنے دشمنوں کو کم سے کم دقت اور زیادہ سے زیادہ جوش و خروش سے کس طرح شکست دے سکتے ہیں؟“

خلیل پاشا آٹھ قدموں سلطان کی خوب گاہ سے باہر نکلا اور اپنے دھڑکیں بچھڑکیں کی طرف مدانہ ہو گیا۔

صبح جب لڑکی فوج قسطنطنیہ کی قصبوں کی طرف بڑھی تو اس کے پاس مکرطوں کے ہزاروں ہر طرح کے ہتھیاروں کے بیچے لگے تھے اور یہ کئی کئی منزلہ سنبھال کی بلندی فضیل کے مطابق تھی اور ہر طرح میں سیرھیاں بھی موجود تھیں۔ ان ہرجوں کی ہر منزل میں تیر انداز اور شمشیر زن بیٹھے ہوتے تھے۔ ان ہرجوں کو دھکیلتے ہوتے فضیل کے قریب پہنچا دیا گیا اور ہرجوں میں بیٹھے ہوتے ترک فوجیوں نے دشمنوں کی بے پناہ تیر اندازی کی۔ ہمدرد گئے بغیر اپنی سیرھیاں ترک قسطنطنیہ کی فضیل پر دھک دیا، عیسائیوں نے ان سیرھیاں میں آگ لگا دی اور ہرجوں پر مدغنی نفت اور رال کے شعلہ زن نیزہ برسانے لگے، ہرجوں میں آگ لگ گئی اور ترک سپاہی کو اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا۔ سلطان نے اپنی میدان فوج کو حکم دیا کہ فضیل پر جو ہر بھی دکھائی دے اسے تیر سے چھید دیا جائے لیکن ہرجوں میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں اور دھڑکیں کے بادلوں نے ترکوں اور عیسائیوں کے درمیان حائل ہو کر

سلطان کے فرمان کو بے اثر بنا دیا۔ فضیلوں اور نژدوں کے درمیان جدوجہد مری اور گہری خندقیں  
لگ گئیں اور انہیں عبور کرنے کے فضیل کے نیچے پہنچ جانا تقریباً ناممکن تھا خندقوں کو پاٹ  
کر دوسری طرف پہنچنے کی کوشش میں ہزاروں ترکوں کی جانیں ضائع گئیں۔

حصن بد میلہ کے برجوں سے سلطان کی توپیں گولہ باری کرنے میں مصروف تھیں  
اور ان سے فضیلوں میں جگہ جگہ شکاف بھی پڑ رہے تھے لیکن دن بھر کی گولہ باری کے ننگاؤں  
کورات کی تاریکی میں عیسائی پھر سے بھر دیتے تھے۔ عیسائی فوجوں کی کوششوں کو ناکام  
ہوتے دیکھ کر ہتے مسکرائے تھے۔ انہیں اپنے دوستوں اور حلیفوں سے اتنی امداد مل چکی  
تھی کہ اگر سلطان سال بھر اپنا عرصہ جاری رکھتا تو انہیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔  
سلطان نے ایک بار پھر نقشہ جنگ کر اپنے سامنے بچایا اور فیصلہ کن تداریک  
پر غور کرنے لگا۔

\*

\*

\*

خشکی کی طرف سے حملوں کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں سلطان نے اپنے بحری  
بیڑے کر شاخ زریں میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن عیسائیوں نے اسے بھی ناکام بنادیا  
سلطان اس مہم پر بہت زیادہ دقت نہیں متا چاہتا تھا، اس نے انتہائی غور و فکر  
کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی طرح اس کا بحری بیڑا شاخ زریں میں داخل ہو کر شمال کی  
طرف سے قسطنطنیہ پہنچا کر ڈلے تو یہ مہم بہت جلدی سر کی جاسکتی ہے کیونکہ اس طرح  
مدافعین کی قوت دو حصوں میں تقسیم ہو جائی اور یہ صورت حال ان کے لئے ناقابل برداشت  
ہو سکتی تھی۔

سلطان خاموشی سے ایک بحری جہاز میں بیٹھ کر باسفورس کے اس حصے میں پہنچ  
گیا جو آج کے جاکو بحر اسود میں کبریل ہو جاتی تھی۔ یہاں اس کے سامنے اونچی نیچی پہاڑیوں  
جیسا خشکی کا ایک ایسا حصہ موجود تھا جس کے ذریعے وہ دوسری طرف پہنچ کر شاخ زریں  
میں داخل ہو سکتا تھا اور یہ خشکی کا ایسا حصہ تھا جس پر مدافعین نے اس لئے کوئی خاص  
توجہ نہ دی تھی کہ اگر یہاں نژد پہنچ بھی جائے تو خشکی کے قدامت بعد شاخ زریں وہی  
کمدار اور کئی جو فضیل کے نیچے خندقیں انجام دے رہی تھیں اور خندقوں کا پاٹ دینا تو  
پھر بھی آسان تھا لیکن شاخ زریں کو پاٹنا ناممکن تھا۔

سلطان اپنے معتبر آدمیوں کے ساتھ خشکی پر اتر گیا اور دیر تک ادھر ادھر گھوم

پھر کردار سے کی نا اہماری اور نیشیب و فراز کا جائزہ لیتا رہا اس نے اندازہ لگایا کہ پہاڑوں سے اس پار مشائخ و بزرگین میں داخل ہونے کے لئے اس کے بحری جہازوں کو دس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا لیکن سوال تو یہ تھا کہ اس کے بحری جہاز خشکی کا یہ دس میل کا سفر کس طرح کر سکتے تھے۔ اس نے خشکی پر کھڑے جنگلات کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا اور بستی میں موجود ہزاروں مویشیوں پر بھی نظر دیا۔ ایں بستی کے لوگوں نے سلطان کو پہچان لیا تھا، وہ نیاز مندانہ سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور درخواست کی کہ اس جنگ میں انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

سلطان نے جواب دیا: ”یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تم لوگ بھی ہمارے کاموں میں دخل اندازی نہ کرو اور ہمیں اخلاق اور مادی مدد دو۔“

بستی والوں نے پوچھا: ”ہم سلطان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔؟“

سلطان نے جواب دیا: ”اخلاق مدد تو یہ ہے کہ تم لوگ اس جنگ میں بے تعلق رہو اور مادی مدد یہ ہے کہ ہمیں تم سے کھڑیاں کاٹنے کے آلات اور مویشیوں کی ایک بہت بڑی تعداد درکار ہوگی۔ ہم تمہیں ان کی قیمت ادا کریں گے اور پہلا فرقہ یہ ہوگا کہ ہمارا حکم لیتے ہی اپنے مویشی ہمارے حوالے کر دو۔“

بستی والوں نے سلطان سے وعدہ کر لیا کہ وہ سلطان کی ہر خواہش کا احترام کریں گے اور مذکورہ حکم پر بروقت عمل کیا جائے گا۔ اس کے بعد سلطان جنگلات کے درختوں کو شہلہ کرنا رہا اور ادھر سے مطمئن ہو کر وہ اپنے بحری جہاز میں چلا گیا، اس نے سحیرۃ قادموہ میں مقیم اتنی جہازوں کے ملاحقوں کو حکم دیا کہ ”حکم ملتے ہی انہیں ایک پر اسرہ سمت میں روانہ ہو دینا ہے۔“

ان جہازوں پر فوجیوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو چھا دیا گیا۔

یہاں سے وہ اپنے قصر گیا اور وہاں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے اس طرح ملا، کہ باب وہ داپس نہیں آئے گا ماں نے اپنی سوتیلی ماں مردیا کی شہزادی سے بھی ملائی کی اور اسے اس بات پر مقررش کی کہ اسے ایک ایسے شخص سے چوری چھپے نہیں ملنا چاہیے جو شاہی معتوب ہے اور جس کے خلاف ایک خطرناک جرم ثابت ہو چکا ہے۔

شہزادی نے ذرا دلیری سے انجیل کی وکالت کی، بولی: ”یہ سلطان سے درخواست کر دوں گی کہ وہ انجیل کو قبل از وقت مجرم نہ قرار دیں، کیونکہ انجیل مدد و کویاری بے گناہی کا یقین دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ وقایت اور حصد میں کیا گیا ہے۔“

سلطان کی تیوریوں پر عمل پیرا نہ گئے، بولا: "آنسوؤں کا سیلاب کسی کو بے گناہ تو نہیں قتل دے سکتا۔ حضرت یعقوب کے جن مکار بیٹوں نے اپنے بھائی یوسفؑ کو کنوئیں میں گمراہ کیا تھا۔ ان سب نے مدد دے کر ہی اپنے باپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ یوسفؑ کو پھیر دیا گیا اور پھر تادم رخ عالم میں بے شمار ایسے واقعات موجود ہیں جن میں حکمرانے آنسوؤں کے سہارے پھیانک ترن کھیل کھیل گئے ہیں۔"

شہزادی لاہجواب ہو گئی، آپسیدہ ہو کر بولی: "پھر بھی سرتے موت سے پہلے اگر معنی سے تحقیقات کر لی جاتے تو میرے خیال میں یہ ایک دانشمندانہ ہی نہیں عادلانہ اور فارغ دلائل قائم ہو گا۔"

سلطان نے کہا: "میں نے ابھی تک اس کے قتل کا فرمان نہیں صادر کیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ میں جب تک قسطنطنیہ کی مہم سے فارغ نہیں ہو جاتا، ایجنل کو کوئی منزل نہیں دی جاسکتی، قسطنطنیہ اب چند دنوں کا مہمان ہے۔ اس چند دنوں کے مہمان کے ساتھ ہی ایجنل بھی پہلا چند روزہ مہمان ہے۔ قسطنطنیہ کو ایک مسئلہ ہے ایک مہم ہے لیکن ایجنل نہ تو کوئی مسئلہ ہے اور نہ کوئی مہم، اس لئے اس پر قبل از وقت غور کر کے میں اپنا قیمتی وقت نہیں بے فائدہ کرنا چاہتا۔"

شہزادی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "فصیلیوں کی طرف سے قسطنطنیہ کی تسخیر ناممکن آ رہی ہے۔ اس لئے کیا سلطان حالی مقام یہ بنانا پسند فرماتیں گے کہ اس کا قابل تسخیر شہر کی تسخیر کے لئے اب کن تدابیر پر عمل کیا جائے گا؟"

سلطان نے ترشی سے جواب دیا: "یہ سب کچھ سنانا تمہارے لئے ضرور نہیں ہے اور اتنے دن تم مجھ سے اس نوع کا کوئی اور سوال کر لے کی جرات بھی نہ کرنا۔"

یہاں سے نکل کر سلطان خلیل پاشا کے پاس پہنچ گیا، اس وقت سلطان کے چہرے پر وہی جیسی تشویش اور فکر مندی تھی، پھرے پر ایک عجیب سی طمانیت چھائی تھی۔ خلیل پاشا نے ادب سے عرض کیا: "اسی ناچیز کے لئے حضور والا کا کوئی نیا حکم ہے؟" سلطان نے جواب دیا: "خلیل پاشا! میں بہت جلد ایک نامعلوم مہم بے سودانہ اور جاذب کا تم اور میرے دوسرے فوجی ان فصیلیوں پر بدستور دیا ڈھالتے رہیں گے خبردار جو اس میں قصا ہل یا کوتاہی سے کام لیا گیا۔"

خلیل پاشا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "حضور والا کس مہم پر روانہ ہونے والے ہیں کیا کوئی اندازہ فرمانا گوارا کر فرماتے گے؟"

سلطان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، اس نے چہرہ خوش پہنے میں کہا: خلیل پاشا! اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میرے کسی آئندہ منصفہ سے میری خاطر میں کا کوئی بال واقف ہو گیا ہے تو مجھ میں اسے فوج کر بھیج دینا گا۔  
خلیل پاشا ڈر کر خاموش ہو گیا۔

سلطان اسی دن اسی جہازوں میں فوج بھیجا کہ باسفورس سے بحیرہ اسود کی طرف روانہ ہو گیا۔

✽

✽

✽

سلطان باسفورس سے خشکی کے اس حصے میں اتر گیا، جس کا وہ کچھ دن پہلے جاترہ لے گیا تھا، اس نے جنوب کی پہاڑیوں سے اتر کر شاخ زریں کے مقابلہ میں نصب کردہ فوجی دستہ بٹھادیا اور اسے حکم دیا کہ شاخ زریں کے دہانے سے جیسے ہی کوئی مسیحی بحری جہاز حرکت کرے اور مغرب کی طرف بڑھے اسے نہایت سفاکی اور بے دردی سے تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے جگہ جگہ پہاڑیوں کی بلندیوں پر بستی والوں کے لئے توپیں نصب کر دیں اور اس پر متعینہ فوجوں کو حکم دیا کہ کسی دہانے جیسے ہی کسی شہریت پر آمادہ ہوں انہیں فوراً تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس کے بعد سلطان کے بے شمار آدمی جنگلوں میں گھس گئے اور درختوں کا صفایا کرنے لگے، آدمیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راستہ میں کوہلو کرنے میں لگی ہوئی تھی اور ساحل سے اندر تک کی ناہمواریوں کو پاٹ پاٹ کر سطح کرنے میں لگے پڑے تھے۔ جب ان کی سطح برابر ہو گئی اور ساحل سے اندر تک ایک وسیع و عریض

پہلو ان تیار ہو گئی تو سلطان کے حکم سے اس پہلو ان شاہراہ پر اندر تک نکڑیوں کے رولے بچھا دیئے گئے۔ یہی کام پہاڑی کے اس پار بھی کیا گیا اور شاخ زریں تک دس میل کا فاصلہ ایک کشادہ ہموار شاہراہ سے ملا دیا گیا اور اس شاہراہ پر بھی نکڑی کے رولے بچھا دیئے گئے۔ بستی کے لوگ اور درخشاں زریں کے دوسرے کنارے سے مسیحی یہ عجیب و غریب عمل دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ نہیں آسکا تھا کہ یہ سب کچھ سلطان کیوں کر رہا ہے؟ جب دس میل کی شاہراہ ہموار کر دی گئی اور ان پر نکڑی کے رولے بچھائے جا چکے تو سلطان نے ہزاروں جانوروں کی چربیوں پگھلا کر ان رولوں کو تڑک تڑک کر دیا پھر حکم دیا کہ اسی جہازوں کو آگے پیچھے ان رولوں پر چڑھا دیا جائے۔ اس دن انسان طاقت نے اس حیرت انگیز کام نامہ انجام دیا کہ آج تک عقل محو تماشا سے لب بام نظر آتی ہے۔ ان

جہازوں کو انسانی دیوتاؤں کی مدد سے پہاڑی پر چڑھا کر دوسری طرف اتار دیا گیا اس دن ہوا بھی موافق تھی۔ جہازوں کے بادبان کھول دیئے گئے، انسانی طاقت اور ہوا کے دباؤ نے جہاز کو چمنیوں کی چکنا چٹندہ مولوں پر دوڑانا شروع کر دیا اور دس میل کا فاصلہ طے کر کے یہ جہاز شاخ اندریں کے ساحل پر پہنچ گئی۔ اس دن جب یہ کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا جہازوں کو دھکیل کر آگے بڑھانے والے جہیز کاروں نے جوش و خروش میں طرح طرح کے نعرے بھی لگاتے اور حوصلہ بڑھانے والے کیت بھی لگاتے۔ شاخ اندریں کے مشرقی دہانے پر موجود عیسائی بصریہ یہ مناظر دیکھتا رہا اور مسلمانوں کا شور و غل سننا بہا لیکن خوشنما ہی نہیں سمجھ سکا کہ اس کو شش کا مقصد کیا ہے، لیکن جب سلطان کے جہاز شاخ اندریں کے ساحل پر پہنچ کر پانی میں اتارے جانے لگے تب ان کی سمجھ میں سلطان کا اصل مقصد آیا، انہوں نے ساحل سے حرکت کی اور سلطان جہازوں سے برسرِ پیکار ہونے کا ارادہ کیا لیکن ساحل پر موجود سلطان کی توپ خانے ان کے عزائم خاک میں ملا دیتے۔

شاخ اندریں کے ساحل والی تفصیل پر موجود عیسائیوں نے جب یہ دیکھا کہ اب ملطانی بیڑہ شمالی سمت سے بھی حملہ آور ہونے والا ہے تو ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ ۲۷ مئی ۱۳۵۵ء کی بات ہے، سلطان نے اپنے عساکر میں اعلان کر دیا کہ وہ اپنی کی صبح سے فیصلہ کن حملہ کر دیا جائے گا۔

۲۸ مئی کی صبح، قسطنطنیہ کے ایک دروازے سے چند آدمی نمودار ہوئے ان نے گھوڑوں کا رخ شکر کی طرف تھا اور جو شخص سب سے آگے تھا اس کے ہاتھ میں سفید جھنڈا تھا۔ سلطان سمجھ گیا کہ یہ صلح کا دفرہ ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا: "آگے والوں کو گزندہ پہنچایا جائے۔"

دھوپ کی کڑور شعاعوں میں ان کے سفید لباس بہت اچھلک رہے تھے اور ان کی داڑھیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ان لوگوں نے ترکوں کے لشکر کے قریب پہنچ کر لپکا کر کہا۔ "ہم ترکوں کے سلطان کے پاس اس صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوئے ہیں" سلطان نے اپنے گھوڑے کو ذرا آگے بڑھایا، اس کے ساتھ ہی محافظ دستے نے بھی حرکت کی، سلطان نے ان کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی نگام کھینچ کر اسے روکنا چاہا تو اس کا مکش گھوڑا الف ہونگیا، سلطان نے اسی حالت میں بلند آواز میں بدچھاہ کیسی صلح بہ کیسا اس بہ اب اس کا دقت گمزدہ چکا!"

عیسائیوں کے دفرہ کا تاثر نہ ہوا۔ قسطنطنیہ اس اس صلح کے عوض سلطان



کا منہ مانگا خراج ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس کی درخواست ہے کہ سلطان ایک مار قسطنطنیہ معاف کر دے وہ اس معافی کے بدلے سلطان کی ماتحتی اور باجگنہاری قبول کرنے پر ہے۔

سلطان نے پھر وہی الفاظ دہرائے: "میں قسطنطنیہ کو فتح کرتے بغیر ہرگز دریا چاؤں گا، ہاں تمہارا قسطنطنیہ اگر پسند کرے تو اسے جان کی امان دی جاسکتی ہے اور وہ یونان پر بدستور حکمران رکھا جاسکتا ہے۔"

دفتر الیوس ہیکرہ الیس چلا گیا۔  
توپوں نے گولابادی شروع کر دی، اب قسطنطنیہ کی فصیلوں پر شمال اور درجنوں ہی طرف سے گولابادی ہمارے ہی تھی۔

دفتر کے جواب نے قسطنطنیہ کو بالکل الیوس کر دیا۔ اس نے امراء، علمائے دین اور اپنے اعتراضے میں اباصوفیہ میں جمع ہو جانے کی خواہش کی۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا عالم یاس میں اس مقدس مقام کے لئے میدان ہو گیا۔ جوان کے خیال میں ان کی آخری پناہ تھی۔ قسطنطنیہ کا آخری مسیحی فرمان روا اپنے گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلاتا تھا اباصوفیہ میدان سے پرہیز کیا اور باعتراف گھوڑے سے اتر پڑا، اس کے ہمراہ خدمت گار نے پھر بچے اتر کر بادشاہ کے گھوڑے کی لگام بھام لی۔ قسطنطنیہ باوجود فرمانداز میں اباصوفیہ کی دہ چنچ گیا یا اس نے تاج رٹا ہی تاج کر ہاتھ میں لے لیا۔

اندرون کی روشنی میں بھی شمعیں روشن کر دی گئی تھیں اور ان کی ٹوکھٹ سے رہی تھی۔ وہ منقش اور مزین پردوں کے پاس سے گزرتا ہوا مقدس ترین جہنم گیا، اس نے کسی قدر مستی سے قسطنطنیہ کا احترام کیا۔ اسقف اعظم نے اسے اپنے برابر بیٹھ جگہ دے دی۔ مقدس جہنم ہرگز تاج کپڑا بچھا تھا اور اس پر کڑھی ہوئی سنہری تصویریں رہی تھیں۔ فرمان گاہ کے اوپر حضرت مریم کی تصویر تھی ان کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا تھا۔ حضرت مریم کے اوپر ایک دھندلے چہرے کے مہم سے نقوشی ابھر رہی ہے یہ حضرت مسیح کی شبیہ تھی۔ ان کے اوپر فرشتوں کی تصویریں مقبب جواہر بنافقوں کو پہناتے تھے۔

پورے مجمع کی مجموعی کیفیت نے ایسا لگنا تھا گویا یہ سارے آدمی کسی کی سرگ میں بچھا ہو گئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے حسرت و غم اور مایوسی جھلک رہی تھی چہروں پر ایک ایسی اداسی طاری تھی، جہنم دہانہ جاسکتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو

مدہ ہے تھے گویا وہ ان کے حکم کو ہلکا کرنے کے لئے تسلی آمیز کلمات ادا کر رہے تھے۔  
 کچھ ادا ایک ہی غم کا ہر کوئی شکار تھا۔

ابا صوفیہ میں دیر تک آہ دیک کے درمیان دشمنوں کی پسپائی ادا کرنا کامی کا دعائیں  
 تھیں۔ اسی دن شام کو یونانی امرا ادا اتحادیوں کے بہترین پہلندوں کو شاہی محل  
 کیا گیا۔ یہ ان کی آخری مجلس مشاورت تھی۔ یسٹنطین نے اپنی بہترین تقریر سے انہیں  
 دلوں میں گہری پیدا کر کے کی کوشش کی، لیکن اسی کے سامعین خود اس کے جہرے  
 ہی جیسی بلایوسی ادا ہر اس دیکھ رہے تھے۔ تقریر کے بعد وہ سب آپس میں  
 لگے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ادا ہر آنکھوں سے آنکھیں نکل رہی تھیں۔ اس کے بعد  
 نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "میں ان سب سے معافی ادا دعوت مہانتا ہوں۔ میں  
 اللہ یا نادانستگی میں کسی قسم کی اذیت پہنچائی ہو" محل سے نکل کر وہ گھوڑے  
 ادا در فضیلت کا نگرانی کے لئے چلا گیا۔

۲۹ مئی ۱۳۵۴ء کی صبح سلطان کے حکم کے بموجب دونوں طرف سے حملے کا  
 یا گیا۔ تو میں گولے لگنے لگیں ادا فضیلتوں میں شگاف پڑے گئے۔ سلطان عصلے  
 لوزیوں کی ہمتیں بڑھا رہا تھا۔ مسلمان دیوانہ وار فضیلتوں سے ملی ہوئی خندقوں  
 نے کی کوشش میں دفن ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ ہمت ہارنے کا نام نہ لیتے  
 دیوان سلطان کی لڑپوں نے فضیلتوں کو جگہ جگہ سے منہدم کرنا شروع کر دیا، فضیل  
 الاطیعہ خندقوں میں گمراہ جس سے خندق خود بخود پستی چلی گئی، مسلمان ان حصوں  
 کے نیچے پہنچ گئے عیسائی ان منہدم شدہ حصوں میں دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے  
 زیر معرکہ مافعتی قوت سے مسلمانوں کے سیلاب کو روک دیا، اس شمشک میں حسن  
 ری اپنے تیس ساتھیوں کے ہمراہ فضیل پر چڑھنے لگا۔ عیسائیوں نے پتھر ادا کر  
 کے اٹھارہ آدمیوں کو مار دیا لیکن خود حسن اپنے بارہ ساتھیوں کو لے کر فضیل پر چڑھ  
 ادا فضیل ہر اچھی طرح کھڑا بھی نہ ہوا تھا، کہ عیسائیوں نے اسے فضیل سے نیچے  
 ادا دینچے گمر کے ایک بار کھڑا تھا، ادا گھٹنوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسی  
 نے لڑیہ سے پتھروں ادا اینٹوں کی بارش کر دی گئی ادا حسن بنی چری اس میں بیٹھ  
 ادا ہوا گیا۔

سلطان حسن بنی چری کی ہمت و شجاعت کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا  
 تھے شاہی کو بلند کرنے ہوئے اعلان کیا: "آج کے عار بے کا پھر حسن بنی چری

ہے اندر یہ آگندہ دہشتا تو ہمارے انعام کا مستحق ٹھہرتا۔ سلطان نے اپنے ایک خدے کو حکم دیا کہ تم اسی وقت ہمارے پیر مرشد کے پاس جاؤ اور ان سے کہو، خدا کی بامعاہ سجدہ کرنا ہو کر فتح کی دعا کریں۔

میدان کا اندازہ سے دیکھ کر ان کے پاس ہیروں کے عقب میں، جہاں ان کے غیروں کو قطار میں ڈھونڈ نکال چلی گئی تھیں، یہیں شاہی خیمے کے قریب سلطان کے پیر مرشد کا خیمہ تھا، سلطان کی خدمت گاہ میں خیمے کے دروازے پر پہنچا تو پیر مرشد کے ایک غلام نے سختی سے کہا: ”تم اندر نہیں جاسکتے، کیونکہ پیر مرشد کا حکم ہے کہ اس وقت کہ بھی اندر نہ جانے دیا جاتے۔“

شاہی خدمت گاہ کے آگے جواب دیا: ”میں سلطان کے حکم سے پیر مرشد کے آیا ہوں تم مجھے اندر جانے سے نہیں روک سکتے۔“ اس نے خیمے کے پہرے دار کو دھکا دیا خیمے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اندر پیر مرشد سجدے میں پڑے گدیہ دار ہی میں مشغول شاہی خدمت گاہ کے ادب سے عرض کیا: ”پیر مرشد! سلطان کا پیغام۔“

پیر مرشد نے سجدے سے سر اٹھایا تو اس کی دائرہ آستینوں سے ترنظر آئی۔ سلطان کا پیغام عرض کرو۔

خدمت گاہ سے عرض کیا: ”مشرقی تہذیب کی دعا۔“

پیر مرشد نے جواب دیا: ”قسطنطین کا بادشاہ ہلاک ہوا، شہر فتح ہو گیا، تم کے پاس واپس جاؤ۔“

خدمت گاہ یہ بشارت لے کر فیرا، اس خیمے سے باہر نکلا اور سلطان کی طرف چل پڑا۔

مسلمان ترقی ہوتی تفصیلات کی راہ سے شہر میں داخل ہو گئے تفصیل کے عیسائی نے بچے اتر کر انہیں روکنے کی کوشش کی تو مسلمان تفصیلات پر چڑھ کر شہر میں اتر گئے عیسائیوں کی دفاعی قوت جواب دیتی جا رہی تھی۔ عام عیسائیوں میں قسطنطین بھی آدھے جگہ سے حملہ آور ہو کر مسلمانوں کو روک دینے کی کوشش کی کسی طرف سے سنسنا تا ہوا تیر ٹھیک بادشاہ کے سینے کی طرف آیا اور باقی طرف، پسلی کی دیوار کو چھو رہا تھا۔ بادشاہ تیرا کہہ کر گیا، شدت کرب سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور شکنیں پڑ گئیں اس کے پاس جنگ جو عیسائیوں کو یہ بھی نہ چل سکا کہ بہت

لاشوں کے درمیان ان کا بادشاہ بھی بڑا سسک رہا ہے۔ کچھ دیر بعد قسطنطین نے آنکھیں  
 کھول دیں اور مشکل اپنے شاہی لباس کو جسم سے اتار دیا اور کسی معمولی سپاہی کا لباس پہن لیا  
 کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نرک اس کی لاش کو پہچان کر بے حرمتی کرے اس کی بے قراری  
 کا یہ عالم تھا کہ اسے اب بھی خود کے پہچانے جلنے کا دھڑکا لگا تھا، اس نے کپکپاتی آواز میں  
 کہا: ”کیا یہاں کوئی عیسائی نہیں ہے جو میرے سر کو تناسل سے جدا کر دے، کیونکہ میں جیسے جی  
 چاہتا ہوں کی قید میں جانا پسند نہیں کرتا۔“

لیکن وہاں کوئی بھی عیسائی موجود نہیں تھا، جو بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتا۔ کچھ  
 دیر بعد عام مسلمان سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور ان میں سے کسی ایک نے بادشاہ کو معمولی  
 سپاہی ہی سمجھ کر زندہ گی کے آثار کے پیش نظر ایک ہی دار میں اسے ختم کر دیا۔

حمر کوں کا سیلاب جب جنوبی حصوں سے داخل ہو کر شہر میں داخل ہوا تو شہر کے  
 قبرگوں پر شہر کے شمالی حصوں سے داخل ہو جانے والوں کا سیلاب ان کے استقبال کو موجود  
 لا شاخ مذہبی کے ساتھ جہادوں کے قریبی ان سے پہلے ہی شہر میں داخل ہو چکے تھے اور شمالی قبیل  
 برفرخ کا پریم ہمارا تھا۔

عیسائیوں نے مار مارا خلیار کی اور وہ محلوں اور گھروں کے بجائے عبادت گاہوں  
 میں پناہ لینے لگے۔

سلطان کا خدمت نگاہ جب پیر مرشد کے پاس سے سلطان کے قریب پہنچا تو اس  
 نے بھی اپنی آنکھوں سے سلطان پریم کو ہراتے ہوئے دیکھ لیا، اس نے فرط جوش میں کہا:  
 ”قسطنطین کی تسخیر نوح سے نہیں، دغا سے ہوئی ہے۔“

سپاہیوں طرف سے سلطان کو قہقہہ زنی کی ساز کبادیں ملنے لگیں۔ سلطان کے چہرے  
 پر اب بھی اطمینان پائی جاتی تھی۔ خلیل پاشا اسے پوچھا: ”حضور والا کو لب تو  
 خوش ہر جانا چاہیے، کیونکہ خدا نے قسطنطین کے اقبال کو فاک میں ملا دیا ہے۔“

سلطان نے جواب دیا: ”مجھے اس وقت تک اپنی فتح کا یقین نہیں آئے گا جب  
 تک میں قسطنطین کی لاشی خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں گا۔“

اس کے بعد سلطان نے لاشوں کے گھیر میں قسطنطین کی لاش کی تلاش کا کام  
 شروع کر دیا۔

کافی دیر بعد درہنی چری ایک معمولی سپاہی کی لاش کو اٹھا کر سلطان کے پاس  
 لاتے اور عرض کیا: ”حضور والا! یہی فزاں دوا کی لاشی حاضر ہے۔“ ملاحظہ فرمائیے: سلطان

نے اس لاش کو غدر سے دیکھا، جس کا سر ایک نیخی چمڑی کی کلائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ پھر اس کی ٹانگیں ٹھکی ہوئی تھیں اور ایک تیر اس کی بائیں پسلی کے اذ پہنا ہوا تھا۔

سلطان نے پوچھا: ”تم دونوں نے اسے کس طرح پہچان لیا کہ یہ معمولی لباس میں بادشاہ کی لاش ہے؟“

ایک نیخی چمڑی نے مرنے والے بادشاہ کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے دیا: ”ان جوتوں سے، جن پر وہ طلائی عقاب بنے ہوئے تھے، ایسے جوتے بادشاہ کو ہی ادر نہیں پہن سکتا۔“

سلطان نے معزز عیسائیوں کو طلب کیا اور قسطنطنیہ کی لاش کو پہنچانے عیسائیوں نے روئے ہوئے تصدیق کر دی، کہ ہاں یہ ان کے بادشاہ کی ہی لاش اسی وقت سب سے سب گم گیا اور دیر تک خلیہ کا شکر ادا کرتا رہا یہ ۲۹ مئی ۱۵۵۰ جموں کا دن تھا، اباصوفیہ کے دروازے اندر سے بند کر دیے گئے تھے، سلطان کے دروازوں پر کھانڈیوں کی بادشہ کر دی گئی اور دروازے دیر بعد یہ لوگ اباصوفیہ ہو گئے۔ وہاں پناہ گزین شہریوں کو دستوں سے جکڑ دیا گیا، سلطان گھوڑے کو دوڑا دوڑ کے میدان میں پہنچ گیا اس کے دلیق بائیں اور پیچھے اس کے ونداء احمدیہ گھوڑے کے میدان میں گھوڑوں کی رفتار سے گم کر دی گئی اور سلطان میدان طرف مئی ہوئی عظیم الشان عمارتوں کو دیکھنے لگا یہاں تین ستون سائینوں کی طرح کبر و غرور کے انداز میں کھڑے تھے یہ ستون آذر ہوں کی شکل میں بنائے گئے تھے نیچے کی طرف تھے۔ سلطان نے گھوڑے سے اتر کر اپنی جنگی کھانڈی کی ایک ہی ایک ایک اندھ کے جہزے کو کھڑے سے کھڑے کر دیا۔ یہاں سے وہ اباصوفیہ کی طرف گیا۔ وہ اباصوفیہ کے مرکزی دروازے پر گھوڑے سے اتر پڑا۔ یہاں اس نے آ جا ہی کہ اباصوفیہ کے ایک چبوترے سے سنگ مرمر کی پیل اکھاڑے دیکھا، سلطان آگے بڑھا اور اپنے عصائے شاہی کی ایک ہی ضرب سے اسے ڈھیر کر دیا۔

سلطان دیر تک اباصوفیہ میں گھومتا رہا۔ وہ اپنے محافظوں اور سپاہ مختلف احکام بھی دیتا رہا۔ عمارتوں احکام کے زیر اثر گرے کا سامنا کرتے ہوئے عیسیٰ گمراہیں اور دود پورہ پہنچی ہوئی آسمانی شہس ہادی گتیں، ان امور ہونے کے بعد سلطان نے شاہی متون کو حکم دیا کہ اباصوفیہ کے سب سے آد

۱۵۴۸ء میں اذان دی جائے۔ مؤذن نے اسی وقت تثلیث کے بلند بالا بروج سے خدا کے لائبریری  
 وصالیت اور رسول مقبولؐ کی نبوت کا اعلان کرتے ہوئے مسلمانوں کو نماز کے لئے  
 آج ہوجانے کی دعوت دی۔ سلطان نے عام مقتدیوں کی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ کرانہ  
 نماز ظہر ادا کی اس کو یہ فتح ۵۳ دن کے محاصرے کے بعد ۱۳۵۳ء میں حاصل ہوئی  
 اس محاصرے کا آغاز ۱۴ اپریل سے ہوا اور ۲۹ مئی کو اختتام کو پہنچا، اس طرح  
 عین نے سقوط قسطنطنیہ سے اپنی مشہور تاریخی اصطلاح *نذر منہ و مسلط* (MIDDL E) AGE  
 نے لے لے ۲۹ مئی ۱۳۵۳ء کو آخری حد قرار دیا جس کا آغاز ۱۴ اپریل ۱۳۵۳ء میں بربریل  
 ہاتھوں رومہ الکبریٰ کے ذوالی سے ہوا تھا۔

اباصوفیہ سے فارغ ہو کر سلطان اس عظیم الشان شاہنشاہی محل کی طرف گیا جو اس  
 تک یکے بعد دیگرے قسطنطین اعظم کے شہر جانشینوں کی رہائش گاہ رہ چکا تھا اس  
 ت وہ دیران ہو چکا تھا اس کی شاہانہ شان و شوکت خود سلطان کے ہاتھوں چند  
 قبل چھینی جا چکی تھی۔ اس کی دیرانی کا سلطان کے دل پر بھرا اثر ہوا، اس کی زبان  
 ناری کا ایک شعر نکل گیا۔

پردہ واری می کند بر قصر قیصر عنکبوت

بوم نوبت می زند بر گنبد افرا سیاب

دائر عنکبوت قیصر کے محل کی پردہ پوشی کر رہے ہیں اور افرا سیاب

کے مقبرے کے گنبد کے نیچے بیٹھا ہوا اور نوبت بجا رہا ہے)

بائیس سالہ سلطان نے قسطنطنیہ کا نام بدل کر اسلامبول رکھ دیا جو بعد میں  
 بتول ہو گیا۔

فتح قسطنطنیہ کی طرف سے فراغت پا کر سلطان نے یونانی گرجے کا انتظام سابق  
 نف ہی کے سپرد کر دیا اور خود آڈریانویل واپس گیا۔ یہاں انجیل کو فتح قسطنطنیہ کا حال  
 نام ہی ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی زندگی کے دن گن رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس مہم کی  
 باقی تک دو ہزار تندرہ رہے گا۔ اس کے بعد سلطان آڈریانویل واپس آکر اس کی صحت  
 زبان صادر کر دے گا اس دوران وہ شہر لوی مارہ سے بھی نہیں مل سکا، امید کی ساری  
 ہی زائل ہو چکی تھیں۔ بالیوسی اور غم نے اس کی صحت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ سلطان  
 قصر جہاں نما کے اس حقے میں جس کے سامنے ایک وسیع و عریض اکھاڑہ سانا ہوا تھا  
 ل کو طلب کر لیا۔ زہر وادہ خواہ حال انجیل جب سلطان کے روبرو پہنچا۔ اس وقت

سلطان کے آس پاس افراد معززین کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہیں سلطان کے سامنے ایک اور شخص بھی کھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص ایجنل سے زیادہ لا عنرا اور غمزہ دکھائی دیتا تھا۔ ایجنل کو بھی اس شخص کے برابر سے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ رعب سلطان سے وہ دبا کر اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔

سلطان نے ایجنل سے پوچھا: "ایجنل! تو اس شخص کو پہچانتا ہے؟"  
اور سلطان نے ایجنل کے قریب ہی کھڑے ہوتے دوسرے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ایجنل نے اس پر سرسری نظر ڈال کر جواب دیا: "جی نہیں حضور والا!"  
سلطان نے کہا: "یہ ایجنل ہے تیرا رقیب، تو اسے نہیں پہچانتا؟"  
ایجنل نے مائیکل کو کھنکھار کر دیکھا اور اس وقت تو اس کی حیرت اپنے عروج پہنچ گئی جب اس نے مائیکل کی جگہ ایک منحنی غبار سا مائیکل کا ہیڈ لاء دیکھا اور ایجنل سے زیادہ تباہ و مبرا ہو چکا تھا۔

سلطان نے ان دونوں کو مخاطب کیا: "تم دونوں کا اپنی سزاؤں کے بارے میں کیا خیال ہے یعنی میں تمہیں کیا سزا دے سکتا ہوں؟"  
مائیکل نے جواب دیا: "میں نے تو حضور والا کو ایک ایسے خطرے سے قبل از وقت ہی مطلع کر دیا تھا کہ اگر میں چشم پوشی، لٹا ہل یا لا تعلقی سے کام لیتا تو شاید سلطنت بیکار میں کوئی غیر معمولی سانحہ رونما ہو چکا ہوتا۔"  
سلطان نے ایجنل کی طرف دیکھا، اس نے ایک ایک کر کے جواب دیا: "حضور والا! اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

سلطان نے مائیکل کو دوبارہ مخاطب کیا: "میں تیرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ مائیکل نے مسکراتے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کسی شردے کا چہرہ سا صبرین کی نظر میں بھر گیا اس کے کہا: "حضور والا! میں اپنی خدمت کے صلے میں الغام و الکلام کی امید رکھتا ہوں۔"  
سلطان نے مائیکل کو مخاطب کیا: "تو نے ایک بڑی کی محبت اور ایجنل کی رقابت میں یہاں تک آنے کی زحمت گوارا کی ہے تو ایجنل کو لینا راہ سے ہٹانے کے لئے یہ خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ اس لئے میں تجھے بھی بے گناہ نہیں سمجھتا، تو نے اپنے ایک ہم وطن سے غداری کی ہے اور یہ جرم ناقابل معافی ہے۔"

مائیکل سلطان کے قدموں میں گر گیا: "شاہوں کے شاہ رحم!"

سلطان نے پوچھا: "تو فوج سپاہ گری جانتا ہے؟"

"اچھی طرح۔"

سلطان ایجنل کو اچانک مخاطب کیا: "ایجنل! تو ایجنل سے مقابلہ کرے گا، میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ چھل فریب اور عیاری مکاری کے علاوہ تم دونوں میں سے کس میں اتنی قوت ہے کہ وہ محض اپنی قوت بازو سے ہیلن کو حاصل کر لے۔"

ایجنل فوراً "آدھ ہونگیا لیکن مائیکل نے پہلی ہی اختیاری ابولہ" میں نے ایک عرصے سے تلوار چھتی تھی نہیں۔ اس لئے فی الحال اس مقابلے کو مختصری فرما دیا جائے گا۔ سلطان نے کہا: "الیا نہیں ہو سکتا۔"

چند امر نے بھی فیزی محط بلے پر امر کیا۔ آخر بدرجہ مجبوری دونوں کو ایک ایک تلوار دیا کہ کھائے میں اتار دیا گیا، دونوں نحیف و نزار اور نہ زنگیوں سے بیزار تھے۔ انہوں نے شاید یہ سوچ لیا تھا کہ اپنی اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی اور قیمتی بازی میں انہیں غیر معمولی جرات و شجاعت کے مجسم دکھانا ہیں۔ مائیکل ایک شہزادہ تھا اور ایجنل ایک عام سامعوی لیکن فوج سپاہ گری کا ماہر تھا۔

سلطان کے اشارے پر مقابلہ شروع ہو گیا۔ دونوں ہی بہت جلدی شک بھی گئے ان دونوں میں سے کسی ایک کے بھی زخم نہ ہونے کا منظر دیکھ کر امر اور دوسرے درباری بھی تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ تقریباً نصف گھنٹے کے مقابلے میں مائیکل نے مائیکل کو زخمی کر لیا اور اس کے سینے میں تلوار کی نوک پیوست ہو گئی۔ مائیکل چیخ مار کر گر گیا۔ ایجنل نے فرط جوش میں اپنی خون آلود تلوار فضا میں بلند کی اور نعرہ لگایا: "لوگو! ادھر میری طرف دیکھو، میں ایجنل ہوں، میں نے اپنے بد باطن اور بد طبیعت حریف کو زخمی کر لیا ہے اور اس کے صلے میں میں سلطان معظم سے رحم کی درخواست کر لے میں حق بجانب قرار دیا جاؤں گا، شاید۔"

سلطان نے نفرت سے جواب دیا: "نہیں! تو اپنی جیت کے صلے میں رحم کی درخواست بالکل نہیں کر سکتا۔ آخر تو نے یہ کس طرح بادر کر لیا کہ میں تجھے معاف بھی کر سکتا ہوں۔ ایسے ایک ایسے دشمن کو جو ایک مڑی کی فاطمہ اپنے آقا، اپنے دلی نعمت کو قتل کر دینا چاہتا تھا؟"

سلطان کے اشارے پر شاہی خدام دم توڑتے ہوئے مائیکل کو اٹھا کے گئے۔ مائیکل نے دوبارہ فرماست کر دیا اور ایجنل کے لئے حکم دیا: "اسے کل دربار بغرض فیصلہ پیش کیا جائے۔" شاہی خدمت گاہ میں ایجنل کو دونوں طرف سے جکڑ لیا اور کھینچے ہوئے انداز میں ڈال آئے۔ اس وقت ایجنل کے حواس خمسہ خستہ اور چکے تھے، ہڈیوں سے دم



کھینچ رہا تھا۔ زندان کی وہ سات بڑی بھاری نکلی۔ بڑی کوشش کی کہ دوسرے دن  
آنے والے ہے اس کا ہمت ادا حوصلے سے استقبال کرے۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش پر  
ناکام رہا، رات کے پچھلے پہر نیند نے ذرا غلبہ کیا تو اس میں اسے اپنے سر پر جلا دی  
نظر آئی رہی۔

دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد آج بھی سلطان نے ایجنل کو طلب کر لیا۔  
سلطان بالکل تہا تھا، سلطان اسی وقت نماز سے فارغ ہوا تھا۔ شاہی خدمت گاروں کو  
چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ جب اسی تخیلے میں سلطان ادا ایجنل کے علاوہ تیسرے کوئی نہ  
سلطان نے اپنا فیصلہ سنا دیا، اس نے ایک گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اے  
ایجنل! اور اسی وقت اڈریا نوبل کی حدود سے نکل جاؤ۔"

ایجنل یہ جانتا تھا کہ آخر اس گھڑی میں ہے کیا، لیکن سلطان نے اس  
ہی نہ دیا، اس نے مزید کہا: "تو نے ہمارا شک کھا لیا ہے۔ تیری خدمات بھی ہیں۔ اگر میں  
قتل کا حکم صادر کر دیتا تو ہم دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ لیکن میں سلطان ہوں  
صاحب اختیار ہوں۔ میں قسطنطنیہ کا فاتح سلطان محمد اپنے ایک ادنیٰ خدمت گار کی  
کم عقلی کے جواب میں خود بھی تو نادانی ادا کم عقلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔" اس کے  
باوجود گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ گھڑی سنبھال ادا اسی وقت اڈریا نوبل کی حدود  
نکل جا، سر دیالے بادشاہ سے مل کر میری طرف سے کہہ دے کہ سلطان نے کہلے تیری  
پوری کر دی گئی ہے اب وہ اسلین کو تھکے والے نہ کر دے۔"

سلطان کی باتوں کا مطلب ایجنل کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے گھڑی سنبھالی، کھ  
سلطان کی خلاف توقع عفو و درگزر نے ایجنل کے دل کو گداز کر دیا تھا، اس سے ڈبڈ  
انکھوں سے سلطان کی طرف دیکھا، سلطان نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تھا ایجنل  
ادب سے جھک کر سلطان کو الوداعی سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی سلطان نے تالی بج کر خدمت گاروں کو طلب کیا اور اس  
دیا: "ایجنل! کو بحفاظت اڈریا نوبل کے باہر چھوڑ دیا جاتے۔"

اس حکم کی صرف یہ حرف تعبیل کی گئی ادا ایجنل کو اڈریا نوبل کی حدود سے  
نکل دیا گیا۔ گھڑی کا معر اسے ہر نشان کئے ہوئے تھا، اس نے موقع پاتے ہی ایک  
کے ملے میں دم باندھ کر گھڑی کو کھول کر اس کا جائزہ لیا۔ اس میں سلطان کا عجیب و  
بہاں دکھا ہوا تھا، اس سامان کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی لکھا تھا۔

”یہ ہے وہ سامان جو تجھے پہلے لئے دیا گیا تھا۔ جا، اسے غلام  
سرو دیا کی خدمت میں پیش کر دے اور اس سے اپنی پہلین حاصل کر لے اگر  
بادشاہ ہجیر کرے تو اس سے کہہ دینا کہ میں عنقریب سرو دیا بھی پہنچ رہا ہوں  
اور خدا بد عہدوں اور عہدو پیان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔“  
اینگل کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی اور وہ سلطان کی فرخ دلی کا دل ہی دل میں قصیدہ پڑھنے لگا۔

\*

\*

\*

شاہ سرو دیا نے اینگل سے سلطان کی نشانیاں لے لیں اور اسٹیکل کی بابت دریافت  
کیا، اور جب اسے اسٹیکل کی حد تک موت کا علم ہوا تو اس کے غم و غصہ کی حد نہ رہی، اس  
نے کہا ”اسٹیکل میری بہن کا بیٹا تھا، میں اپنی بہن کے بیٹے کے قاتل سے اپنی پہلین کہہ  
کس طرح دالبستہ کر سکتا ہوں اور پھر اس صورت میں کہ تجھے سلطان کی جو نشانیاں  
مروانہ دار لانا مقصود تھیں انہیں تو نے حد بڑھ کر میرے سے حاصل کیا ہے پھر تو پہلین کا حقدار  
کس طرح ٹھہرا۔“

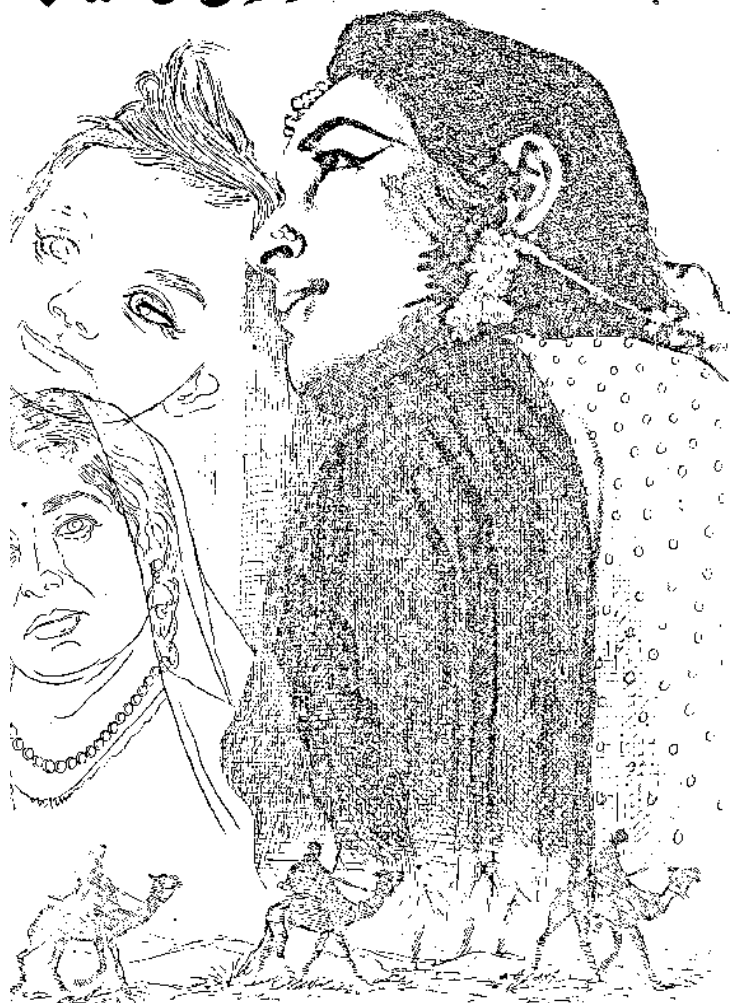
اینگل شاہ سرو دیا سے بحث نہ نہیں کر سکتا تھا اس نے چپکے سے سلطان کا پرچہ اپنے  
بادشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ بادشاہ نے پرچہ پڑھ کر اینگل کو ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ”وہ سرو دیا  
کا رخ کرے گا، اگر اس نے ایسی غلطی کی تو اسے مزہ چکھا دیا جائے گا اور جہاں تک میری  
بیٹی پہلین کا تعلق ہے۔ اسے منگرنی کے ایک شہزادے سے منسوب کیا جا چکا ہے اب تو اس کی  
صورت تک نہیں دیکھ سکتا۔“

اینگل کے دل کو ایک دھککا سا لگا۔ سرو دیا کے بادشاہ نے اسے اسی وقت نکلوا دیا۔  
اس المیہ کے عالم میں دوسری دیم کے لئے مشہر ادوی بادیر کا خیال بھی آیا۔ لیکن اس خیال  
کے ساتھ ہی اس کے سامنے جسم میں خوف اور پکپی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اکیسوا تو دل کی دلیسی  
اور شہزادی بادیر تک رسائی۔ اس کی دانست میں یہ ایک شاہراہ تھی۔ جو اسے موت  
کے دروازے تک پہنچا دیتی۔ اس دروازے کے اس پار نہ تو بادیر تھی اور نہ ہیسلین،  
وہاں کیا تھا یا کیا ہے؟ اس کا جواب تو راضی میں کسی نے دیا ہے اور نہ مستقبل میں دیا  
جا سکتا ہے۔

اینگل نا کام و نامراد ہی رہا لیکن سلطان کی یہ پیشین گوئی کہ ”خدا بد عہدوں اور  
عہدو پیان سے پھر جانے والوں کو معاف نہیں کرتا۔“ جو دیر ہی ہو گئی کیونکہ دس سال کے اندر  
ہی سرو دیا کو سلطان کی مملکت میں شامل کر دیا گیا۔

\*

# رشتوں کی صلیب





ہارون اور منیرہ خوش و خرم زندگی گزارنے لگے۔ عامر بھی بہت خوش تھا۔ شروع  
 سے منیرہ نے اپنی کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ عامر کو اپنے ہاتھوں سے غسل دینا،  
 فٹننگ رکھنا اور کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا، یہ سب اس کے روزمرہ میں داخل تھا  
 دل کو سونے سے پہلے وہ عامر کو دلچسپ حکایتیں سناتی رہتا، عامر کسی بات پر رد نہ کرتا تو  
 وہ سر جھٹ کر کے منالیتی ہارون کا باپ یہ سب بڑی دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔  
 وہ کی ہر بات اچھی لگتی تھی مگر ایک بات وجہ نزاع تھی۔ وہ مال دوز اور درہم دوزینہ کو  
 ہی قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات منیرہ کو نا پسند تھی کہ اس کے ہوتے ہوتے یہ  
 بھلا آدمی اس کے گھر کا مالک و مختار بننا ہی چاہتا ہے۔ وہ ہارون کے باپ کو ہر طرف سے  
 دخل کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے عامر کو اس بڑی طرح اپنے قبضے میں کیا تھا کہ اب وہ  
 کے پاس جانے ہوتے گھر لے لگا تھا۔ دادا کو یہ بات ناگوار گزر رہی تھی لیکن اس کے  
 بدلے منیرہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ اس نے ابھی تک مال دوز اور درہم دوزینہ  
 کوئی سروکار نہیں رکھا تھا۔

ہارون خراسان واپس مابا چاہتا تھا لیکن جانے سے پہلے چند خطرات اس سے  
 زدہ کر رہے تھے۔ وہ اپنے ہمنوی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا اور ہمیشہ یہ خدشہ محسوس  
 رہتا تھا کہ وہ کسی دقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔ حملے کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ نہیں جانتا تھا  
 نے اپنے باپ کو بھی مابا باری سمجھایا کہ وہ اپنے دادا سے ہوشیار رہے اور منیرہ کو بھی  
 کہ کیا کہ اس کے ہمنوی سے بچنا کہ رہے لیکن منیرہ جواب میں کہتی کہ اب ڈرنے کی کوئی بات  
 مابا دلی تو ہو چکی۔ ہاں اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو خوف کی بات تھی۔

ہارون نے سمجھایا: منیرہ! وہ چوٹ کھاتے ہوتے سانپ کی طرح اپنی ناکاسی کا  
 لینے کی کوشش کرے گا۔



بیٹی کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔“

ہارون باپ کی باتوں پر رٹا جاسا تھا۔ وہ کھانا بھول گیا، بولا: ”بادا جان! یہ آپ باتیں کر رہے ہیں؟ منیزہ کا باپ ہمارا مہمان ہے اور مہمانوں کی دل آزاری گناہ ہے۔“  
باپ نے جواب دیا: ”ہارون! میں نے کسی کی بھی دل آزاری نہیں کی۔ میں نے ایک نکتہ دیکھا ہے۔ رونا بھی مشہور ہے، احمق بُرا (سچائی کٹھڑی ہوتی ہے)۔“  
منیزہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ بولی: ”بادا جان! آپ کل ہی یہاں سے چلے جاتے۔ یہ باتوں کے لیے تنگ ہے۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کہا: ”مہمانوں کے لیے نہیں، منصوبہ یانڈوں کے لئے کہہ رہا ہوں۔ تیرے باپ کے اندروں سے ابھی طرح حائف ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

منیزہ کے باپ نے جواب دیا: ”میرا کوئی مقصد نہیں، میں اپنی بیٹی کو خوش و خرم اچاہتا ہوں، اگر میں لالچی ہوتا تو اس وقت تک اپنی بیٹی کی ہارون سے شادی ہی نہ کرتا۔ میں اس کو الگ رہنے پر آمادہ نہ کر لیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔“ پھر کھانا ایک کپڑے سے پونچھتے ہوئے بولا: ”اس وقت میں کہ میں یہاں آکر مہمان ہوں۔“  
بالفاظ طبع اور خود غرضی کی خباثتوں پر ذرا ابھی غور کر لیتا تو شاید اس شرمندگی اور ذلت سے محفوظ رہتا۔“

ہارون کے باپ نے غصے میں کپکپاتے ہوئے کہا: ”خوب۔ یعنی میں خود غرضی کا معنی میں ہوں۔ میرے ہی گھر میں میری برائی کرنا یہ تو کوئی تجھی سے۔۔۔۔۔“  
ہارون دونوں کی تلخ کلامی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ باپ کی بات کا ٹٹا ہوا، بادا جان! ویسے یہ ہے بڑی زیادتی کا بات آپ نے واقعی اپنے مہمان کی دل آزاری کی پک کو اپنے مہمان سے معذرت کرنا چاہیے۔“

باپ بیٹے پر برس پڑا: ”تو چپ رہ۔ معذرت کا مطلب ہے معافی مانگ لوں؟ یا ہو سکتا، قیامت تک ایسا نہیں ہو سکتا اور اب میرا فیصلہ بھی سن لے۔ تو نے منیزہ ادا کی ہے، اس لیے یہ منیزہ کا گھر ہے۔ منیزہ کا باپ یہاں نہ تو رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ رہ سکتا ہے۔ اسی گھر میں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ ہوگا۔“

منیزہ کا باپ تھکا کر چیخا: ”جی بھر کے باتیں کر لے، مجھنا چاہے تو اتار دے لیکن یہ بھول، کبھی کے دن بڑے کبھی کی باتیں نہ کرانی تو ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب میں تجھے

تیری اپانتوں کا جواب دے سکوں۔“

مینرہ نے اپنے باپ کو سمجھایا۔ ”بادشاہ! میں شرمندہ ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد بھی کمزور نہیں نہ نہ ہو گی اور آپ کو میری وجہ سے یوں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا تو میں شادی ہی نہ کرتی۔“

بادشاہ کو اپنے باپ پر غصہ آ رہا تھا، بولا، ”بادشاہ! ہماری مہمان نوازی تو مشہور ہے، آپ خدا تعالیٰ سے کام لیجئے، اس گھر میں آپ ہی کا حکم چلے گا لیکن آپ اپنے حکم کو عدل و انصاف کے دائرے میں چلائیے۔“

باپ نے ایک بار پھر بیٹے کو ڈانٹ دیا، ”مجھے تیرے مشوروں کا کوئی ضرورت نہیں، بادشاہ! تو سنا، میں وہ دینے میں تیرے خلاف بھی جنگ کا اعلان کر دوں گا۔“

مینرہ کو رونا آ گیا۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر ایک کمرے میں چلی گئی اور وہاں رونے لگی۔

بادشاہ کے باپ نے عامر کو گرد میں اٹھالیا اور اسے لے کر باہر چلا گیا، اس کے ساتھ میں چند بھجوریں دے دیں، عامر خوش ہو گیا۔ بادشاہ کے باپ نے عامر سے پوچھا، ”بیٹے عامر! میں کیسا ہوں؟“

عامر نے خدا جواب دیا، ”بہت اچھے۔ سب سے اچھے۔“  
 باپ نے سرگرمی میں دوسرا سوال کیا، ”ادبیدہ دوسرا لڑکا جو مینرہ کا باپ ہے، تجھے کیسا لگا؟“

عامر نے فی الفور جواب دیا، ”بھلا! آپ سے لڑتا جو ہے۔“  
 دادا نے پوتے کی پشت تھپتھپائی اور تیسرا سوال کیا، ”تیری یہ نئی ماں کیسی ہے؟“  
 عامر نے جواب دیا، ”اچھی بہت اچھی۔“

اور وہ رونے لگا، ”بے اختیار بھڑک بھڑک کر کمزور ہونے کے باپ کو شہر گزرا کہ شاید مینرہ کا سلوک عامر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اس لیے عامر مینرہ سے متعلق سوالات پر ہر دسے لگا۔ اس نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور تسلی دیتا ہوا بولا، ”میرے بچے عامر! تو مت گھبرا، اگر مینرہ نے تجھ کو مٹا لیا ہے تو اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔“

عامر نے بہاں کر جواب دیا، ”داؤ جان! آپ معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہیں میں تو اس لیے مدد رہا ہوں کہ میں میری بہ ماں بھی مجھ سے دو ٹھٹھ کر نہ چلی جاتے۔“  
 دادا اس جواب پر چونک پڑا، اسے اپنے سارے منصوبے و مہم بہرہم ہوتے نظر

آئے، بولا: ”میرے معصوم نا سمجھ بیٹے! تو ان چالاکیوں اور عیاںوں کو ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ حق پرستوں کی محبت کے پیچھے کدھر لے جاسکتا ہے؟ لیکن تو فلا اور فلا ہوتے تو میں ان سب کی اچھی طرح نشان دہی کر سکوں گا۔“

مینرہ کے باپ نے ہارون کے باپ کو عامر سے باتیں کرتے دیکھ کر بدبختی کو سمجھا یا۔ مینرہ تو ہوشیار رہا یہ عیاں انسان اپنے پوتے کو معلوم نہیں کیا بسکھا پڑھا رہا ہے۔ میرا خیال ہے اس گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس پر تو اعتبار کرے۔ عامر میں زیادہ سرکھیا نے کی ضرورت نہیں ہے۔“

مینرہ نے بڑا ان کہہ جواب دیا: ”بادا جان! میں آپ کی یہ بات کبھی نہیں مانوں گی، میں امر کو چاہتی ہوں، انجدا، بہت زیادہ ادھر یہ نامکن ہے کہ عامر محبت کا جواب محبت سے نہ دے۔“

باپ نے افسوس سے کہا: ”میری یہ بات ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ تو یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ عامر تیرا بیٹا نہیں ہے، تو اس کے غائب کچھ بھی کر لے، اس کا کوئی بھی خیال نہیں کرے گا۔ ہاں اگر تیری اپنی اولاد ہوگی تو تو اس پر تو دیکھ کر طرح اعتبار کر سکتے گی۔ تو اپنی محبتیں، اپنی مائتا، اپنی خدمت اپنی اولاد کے لیے محفوظ رکھ۔“

لیکن باپ کی نصیحتیں بے اثر رہیں اور وہ اپنے دل سے عامر کی محبت نہیں نکال سکی۔

کچھ دیر بعد سب دادا کا در غلایا ہوا عامر مینرہ کے پاس آیا تو اس کے دل میں مینرہ کی محبت کا طوفان برپا تھا، آج اس وقت اس کو مینرہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اسی طرح مینرہ بھی آج عامر کو زیادہ حسین، زیادہ معصوم اور زیادہ پرکشش محسوس کر رہی تھی۔ اس نے بے اختیار عامر کو گود میں اٹھا لیا اور بھینچ بھینچ کر پیاد کر مئے لگی۔ عامر بھی مینرہ کی گود میں پیوست ہوتا چلا گیا۔



ہارون خندان چلا گیا، وہاں وہ شور مٹاؤں اور دنگاڑوں میں لپکا اٹھا ہوا کہ گھر کا خوش ہی نہ رہا۔ کبھی کبھی اس خیریت سے مینرہ کو مطلع کر دیا کرتا۔ دوسری طرف مینرہ کا باپ آخر باتجربہ کیا ہوا تھا۔ وہاں اس نے چند ایسے کد نامے دیکھائے کہ خلافت کی طرف سے لغام و سہم کی بوجھاڑ کر دی گئی۔ مہیں ہارون کا بہنوئی بھی تھا۔ اس نے مینرہ کے باپ



سے بڑی شکایتیں کیں اور کہا: "تو اگر یہ سمجھتا ہے کہ منیزہ ہارون کے پاس خوش رہے گی تو یہ تیری غلط فہمی یا خوش فہمی ہے۔ منیزہ سب سے زیادہ آزدہ اور ناشائش اسی گھر میں رہے گی کیونکہ اس گھر میں ہارون کا ایک بچہ پہلی بیوی کا بھی رہتا ہے۔ تیری بیٹی اسی گھر کے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوتی رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے اندازہ شکایت جواب دیا: "میرا خیال ہے تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے تیرے ساتھ بڑی انصافی کی، اگر میں ایسا نہ کرتا تو منیزہ آج تیری بیٹی ہوتی اور میں یوں ذلیل و خوار نہ رہ رہا ہوتا۔"

بہنوئی نے کہا: "ایک بات میری بھی یاد رکھ، وہ یہ کہ ایک سازش کے زیر اثر تیری بیٹی ہمیشہ اولاد سے محروم رکھی جائے گی۔"

منیزہ کا باپ چونک کر بولا: "یعنی یہ بات، مجھ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟" بہنوئی نے جواب دیا: "مجھ کو یہ بات کون احمد کیوں بتائے گا مجھے تو خود بخود یہ باتیں معلوم ہو گئیں۔"

منیزہ کے باپ نے اصرار کیا: "اچھا اولاد اس کی وضاحت کر دے کہ منیزہ اولاد کیوں رہے گی اور یہ کہ اس کے خلاف اگر اس قسم کی محاذ آرائی ہو رہی ہے کہ میرا منیزہ کو لالہ رکھا جائے تو اس کا سبب کیا ہو گا؟"

بہنوئی نے ادھر ادھر دیکھ کر گھڑی میں کہا: "اگر تو اجانت دے تو گفتنی اور ناگفتنی کھل کر کہہ ڈالوں۔"

منیزہ کا باپ ہارون کے بہنوئی کی باتوں سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اس نے بمشکل دریا منت کیا کیا ایسا ممکن ہے کہ تو کسی رشتے کے احترام یا لحاظ کے بغیر ہر بات صاف صاف بتا دے؟"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں؟" ہارون کے بہنوئی نے جواب دیا: "جناب دالا، ہارون اور اس کے گمرو پیش رہنے والوں نے ہارون کو یہ منورہ دے رکھا ہے کہ منیزہ کو بے اولاد رکھا جائے۔ اس سے ہارون کو یہ فائدہ رہے گا کہ اس کے بیٹے حاکم کو ہمیشہ منیزہ کی محبت حاصل رہے گی۔"

منیزہ کے باپ نے دل ہی دل میں شادی کی مدت کا سبب لگایا تو معلوم ہوا کہ شادی کو ڈھائی سال گزر چکے ہیں مگر منیزہ اولاد سے محروم ہے۔ اس کو ہارون کے بہنوئی کی باتوں پر یوں یوں یقین آ گیا اور وہ غصے اور نفرت کی آگ جس جھلنے لگا آہستہ سے بولنے لگا: "تو یہ

بات ہے۔ سازش، لیکن میں اس سازش کو ناکام بنادوں گا۔ اور دیکھوں گا کہ میری منیرہ اولاد سے  
کس طرح محروم رکھی جاتی ہے۔“

اس کے بعد اس نے اپنی بیٹی کو ایک خط لکھا جس میں اس شاندار کتابوں میں یہ معلوم  
کرنے کی کوشش کی تھی کہ شادی کے ڈھائی سال بعد بھی وہ اولاد سے محروم کیوں ہے وہ اس  
نے منیرہ کو ہدایت کی کہ وہ چند ماہ بعد محض پہنچ مہا ہے اس لیے وہ بھی محض پہنچ جاتے  
ہا کہ چند نہایت ضروری باتیں کی جاسکیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ اس کو اچانک ایسی  
راز کا پتہ چلا ہے جو منیرہ کے خلاف شادی سے پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی اور یہ اسی سازش  
کا اٹھ ہے کہ منیرہ ڈھائی سال بعد بھی بے اولاد ہے۔

منیرہ کو جب یہ خط ملا تو وہ پریشان ہو گئی۔ منیرہ اپنے دل میں اولاد کی شدید خواہش  
میں کمر باندھ چکی تھی۔ لیکن وہ مجبور تھی۔ اس کو اپنی اولاد کی ضرورت یوں اور زیادہ محسوس  
ہوئی تھی کہ عام کر اس کا دل اور آخری طرح وہ غلاتا رہتا تھا۔ دادا کی پوری کوشش یہ تھی کہ عامر کا  
لی منیرہ کی محبت سے خالی اور محروم نہ رکھے ماس نے سب سے سب سے یہی باور کر دیا کہ منیرہ  
کی اپنی ماں ہمیں ہے اور اب تک وہ جس محبت کا اظہار کرتی رہی ہے محض بناوٹی ہے۔  
اس طرح اپنی محبت کا فریب دے کر اس فکر میں ہے کہ کسی طرح عامر کے اس بال ذمہ  
بد مذہم دردینارہ پر قبضہ کرے جو اس کو اپنے باپ سے حد سے زیادہ ملنے والا ہے۔ اس نے  
عامر کو یہ سب بھی پڑھایا کہ عقل مند لوگ دولت اور مذہم دینارہ کے معاملے میں کسی پر  
تیار نہیں کرتے۔

جب اچھے بیٹھے سوتے جاگتے بھی سبق دیتے گئے تو عامر کے دل میں بھی خدا سا  
وقا آگیا، اب وہ منیرہ کے طرز عمل میں اس کے نقص، معیاری اور فریب کو تلاش کر رہا تھا اور  
عامر ان میں سے کوئی نہ کوئی فی منیرہ میں پالیا کرتا تھا۔

ہاں وہ خواہان میں رہتا تو رہا تھا مگر گھر کی طرف سے بہت فکر مند تھا یہاں اس کو  
تک اپنے بہنوئی کا خیال آگیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا بہنوئی نہ تو کسی سانپ کی طرح ہے جو کسی  
انت بھی حملہ کر سکتا ہے، چنانچہ اس نے منیرہ کو خط لکھ دیا اور اس میں بطور خاص یہ ہدایت کی  
اس کی عدم موجودگی میں اگر بہنوئی آئے تو منیرہ اس کے سامنے نہ جاتے اور نہ اس سے نہ ہی اس  
کے کسی قسم کی بات کرے۔ کیونکہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔

اس خط کے ساتھ ہی دوسرا خط اپنے باپ کو لکھا اور باپ کو صاف صاف لکھ دیا  
اس کے بہنوئی کی طرف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس نے یہ دھمکی دے رکھی

ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح میرے خاندان پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اس خط میں ذرا سا کھڑا عالم کے لئے بھی تھا جس میں ہارون نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے حاد کا خاص خیال رکھے اس بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔

اس خط کی آخری سطروں نے خیزہ کو بڑا دکھ دیا۔ وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں جس عامر پر اپنی محبتیں بٹھا کر کرتی رہی، اس کو ہارون یہ ہدایت دے رہا ہے کہ وہ اپنے دل کا خاص خیال رکھے، کیونکہ بڑھاپے میں دادا کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔ خیزہ نے سوچا، وہ محمد جن تنہائی اور اکیلے پن کے کب سے دوچار ہے کیا اس میں کسی کی محبت اور دل جوئی کی ضرورت ہی نہیں؟ اس نے چڑھ کر ہارون کو دکھ دیا۔

”ہارون! میں چند ماہ کے لیے محض جا رہی ہوں۔ کیونکہ وہاں میرا باپ آؤں یا بیجان سے بچ رہا ہے۔ میں محض تنہا جا رہی ہوں کیونکہ عاشر کا اپنے حاد کے پاس رہنا بہت ضرور ہے میرا بھی یہی خیال ہے کہ عامر کو اپنے دماغ کا بہت خیال رکھنا چاہیے کیونکہ اسی بڑھاپے میں ان کی دل جوئی بے حد ضروری ہے۔“

ہارون! میں نے تیرے بیٹے کو اب تک جو پیارا دیا ہے اور اس کا جتنا خیال رکھا ہے تو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ میرے اس پیار اور خیال کی روشنی میں تیرا فرض تو یہ تھا کہ عامر کو لکھتا کہ وہ میرا خاص لکھے اور مجھے اکیلا نہ محسوس ہونے دے لیکن تو نے بھی مجھ کو نظر انداز کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس کا شکوہ کس سے کروں؟ بہر حال میں محض جا رہی ہوں، اور یہ گئی یہ بات کہ تیرے مہنوی کے سامنے نہ جاؤں اور اس سے بات نہ کر دوں، تو یہ سب فضول باتیں ہیں۔ اگر تو یہ سب نہ بھی لکھتا، میں تب بھی یہی سمجھ کر کرتی۔“

ہارون! میں بہت ادا اس ہوں اور یہ ادا اسی طرح دہر ہو سکتی ہے کہ وہ تو خود جلا آ، یا پھر مجھے اپنے پاس ہی بلا لے اور ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ عامر کی طرح مجھے بھی ایک بیٹا دے دے کیونکہ میں اب اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنے بیٹے میں کو بیٹا کہہ سکتی ہوں، اسی پر ناز کر سکتی ہوں اور اس سے امیدیں وابستہ کر سکتی ہوں۔ میرے بیٹے کو تیرا باپ در غلا نہیں سکے گا اور میرا بیٹا ہی مال دذر اور درہم و دینار کہ جبراً تقسیم کر اسکے گا جس پر تیرا باپ سانچہ کی طرح بیٹھ گیا ہے۔ اس وقت میری سب سے بڑی ضرورت ایک بیٹا ہے جس کو میں حاصل کر لوں گی، آج جلد، تاکہ میں سمجھ سے ایک بیٹا، کم از کم ایک بیٹا حاصل کر سکوں۔“

خبر اسان میں جب بیخظ ہارون کو ملا تو اس کو شبہ گنہگار کہ منبرہ کو اولاد سے محروم رکھنے کی سازش سے کسی نے مطلع فرمادیا ہے ورنہ وہ اس طرح ایک بیٹے کی خواہش نہ کرتی وہ اپنے بہنوئی سے بہت زیادہ خود غرض تھا اور اس کو یقین تھا کہ منبرہ کچھ بھی لکھے لیکن اس راز کا افشا اس کے بہنوئی نے ہی کیا ہوگا۔

ہارون کی خواہش تھی کہ جب تک وہ خود مشتق نہ پہنچ جاتے منبرہ دشمن نہ بھڑے اسے جس خود پہنچانا چاہتا تھا اور منبرہ کے ساتھ محض میں وہ خود بھی پہنچا جاتا تھا کیونکہ اس کو قطعی یقین نہیں تھا کہ اس کا بہنوئی اس کی عدم موجودگی میں محض پیچھے اور منبرہ اور اس کا باپ دونوں ہی اسے اپنے گھر میں داخل نہ ہوتے دیں اس نے لجھلت منبرہ کو لکھ دیا کہ جب تک میں داہس نہ آؤں، وہ دمشق نہ چھوڑے اور اگر محض جاننا ہی چاہتی ہے تو حاصر کو اپنے ساتھ لینی جاتے۔

یہ خط ابھی راستے ہی میں تھا کہ منبرہ نے سفر کی تیاریاں مکمل کر لیں عامر منبرہ کی لا تعلقی اور بے پروائی سے پریشان ہو رہا تھا اس نے کئی بار کوشش کی کہ منبرہ سے باتیں کرے لیکن منبرہ نے سرد مہری سے اس کو خاموش کر دیا اس نے بدست بندیلی کو ہارون کا باپ بھی محسوس کر چکا تھا۔

ہارون کے باپ کو بھی پتہ نہ تھا کہ منبرہ کہاں جا رہی ہے۔ منبرہ نے بستر اور ضروری سامان اندھکے ایک طرف رکھ دیا اور وہ دانے بھر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے لگی عامر دودھ کھڑے بہ حسرت اس پر یہ منظر دیکھ رہا تھا

ہارون کا باپ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر بہت سے کچھ بوجھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ شام کو مغرب کی نماز کے بعد منبرہ چپ چاپ اپنے کمرے میں جا کر پڑھ رہی۔ حاصر بڑی درمیز تک اپنے بستر پر پڑا کمرے میں بدلتا رہا لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ جانتے کے لیے بے چین تھا کہ اس کی نئی ماں کہاں جا رہی ہے اور اس کو اپنے ساتھ لے جاتے گی یا نہیں۔ ہارون کا باپ خود بھی تھا کہ اس کے گھر سے دبا نکلی جا رہی تھی۔

رات کے اندھیرے میں سامر چپے سے اٹھا اور منبرہ کے دروازے پر دھلیز سے ٹک کر پیچھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور حاصر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دستک دے کر کھٹکوا لیتا اس رات منبرہ کو بھی عامر کی یاد بہت سارہ ہی تھی، اس کو وہ بھی اس کا عامر نئی طرح یاد آ رہا تھا جو کئی سال پہلے شادی سے قبل اس کی یاد میں مہلک کیا تھا اس کی نصیبیں بھراؤں اور دل ہی دل میں وہ ہارون کے باپ کو برا بھلا کہنے لگی جس نے ان

دوڑوں کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی تھی۔

حامر دہلیز پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ بارون کا باپ خنجر اٹے لے رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں منیزہ کو کمرے کے دروازے پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیز اٹھی اور کمرے کا دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلی کسی چیز سے ٹھک کر کھڑکی پر گر گئی۔  
کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”کون ہے“

جواب میں حامر کی آواز سنائی دی۔ ”ماں! میں ہوں عامر۔“  
منیزہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”عامر! مگر تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“  
حامر نے جواب دیا۔ ”ماں! میں آپ کے پاس آیا تھا مگر کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر دہلیز پر ہی بیٹھ گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی اور میں بیٹھے بیٹھے گر گیا۔“  
منیزہ نے عامر کو سینے سے لگا لیا۔ ”یہاں دہلیز پر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آواز دی تو دستک دے لیتا۔“

منیزہ اٹھ کر کمرے میں لیے چلی گئی۔ اس نے شمع کی روشنی میں حامر کے چہرے پر آنسوؤں کے نشانات دیکھے۔ شرمیلی سے پوچھا۔ ”کیا تو رو رہا تھا؟“  
عامر کی آنکھیں ایک بار کھپکھپنے لگیں۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“  
منیزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے باپ کے پاس حمص۔ کیوں؟ تو نے یہ سوچا کیا؟“

عامر نے پوچھا۔ ”کیا آپ تنہا جا رہی ہیں؟“  
اس نے جواب دیا۔ ”ہاں۔ کیونکہ میں حمص سے اکیلی ہی آئی تھی۔“  
عامر نے دیکھا منیزہ یہ جواب دیتے دیتے کپکپاتی تھی اور اس کی نظریں خلا گڑ گڑ رہ گئی تھیں۔ عامر نے پوچھا۔ ”میں کس سے پاس رہوں گا؟“  
منیزہ نے جواب دیا۔ ”اپنے دادا کے پاس، کیونکہ میں بہر حال تیرے لئے غیر حامر نے خوشامد کہا۔“ آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیے، یہاں نہیں رہوں گا میں دادا کی بات نہیں مانوں گا۔“

منیزہ نے عامر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ عامر کی رو نہیں کر سکتی تھی مگر بارون کے باپ کا بائیں سننے سننے اس کا دل پک گیا تھا۔ ”ابلی۔“  
تو صند نہ کر اور اپنے دادا کے پاس رہ۔ میں جلد ہی ہا والیں آجاؤں گی۔“  
عامر اس سے چمٹ گیا۔ ”میں آپ کے ساتھ ہا جاؤں گا۔ آپ کے بعد یہ گھر فرما

اچھا نہیں لگے گا۔“

اسی وقت خوابیدہ حالت میں حامر کا دادا کمرے میں داخل ہوا اور جا ہی لیتے ہوئے کہا: حامر! تو یہاں کیوں آیا تھا؟ چل، زیادہ رات تک جاگنا اچھی بات نہیں۔  
حامر نے جواب دیا: عاقل جان! آپ جا لیئے اندازاً سو بجتے ہیں یہیں اسی کمرے میں رہوں گا۔“

دادا نے انگڑائی لیتے ہوئے ذرا سختی سے کہا: حامر! تو خوب جانتا ہے کہ اس دنیا میں تیرے والد ہی مغفل ہیں، ایک تیرا باپ ہمارا دن اور دوسرا میں خود دن دو کے علاوہ میں کسی اور کو نہیں جانتا۔“

حامر نے کہا: آپ سب کا ارشاد سراسر آنکھوں پر۔“  
دادا نے پوچھا: میں نے اب تک جو کچھ بھی تجھے بتایا اور سمجھایا ہے اس کی آہستہ آہستہ تصدیق ہوتی چلی جلتے گی۔ اس وقت بھی تو نے یہی بات محسوس کی ہوگی کہ تو تو منیرہ کے پاس رہنے اور اسی کے ساتھ جانے کی ضرورت ہے لیکن منیرہ تجھے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتی۔ بیشہ! حقیقی ماں کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔“  
منیرہ دل محسوس کر رہ گئی، بولی: دادا جان! آپ ایسی باتیں نہ کیجئے جس سے حامر کا مستقبل ہی متاثر ہو جائے۔ آپ حامر کو جو کچھ محسوس کرنا چاہتے ہیں اس سے کچھ آڑی تباہی برباد ہو جا رہے ہیں گے۔ میں حامر کی دشمن ہرگز نہیں، حالانکہ آپ اس معصوم کو یہی باور کرا رہے ہیں۔“

ہارون کے باپ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا: میں کچھ بھی باور نہیں کر رہا، حامر تجھ کو وہی سمجھے گا جو تو اپنے طرز عمل سے ثابت کرے گی۔ تو حرمیوں ہے اور تو نے میرے بیٹے کے درہم و درہم دیکھ کر اس سے شادی کر لی۔ اب اگر تو حامر کو نظر انداز کرے گی اور حامر کے امراء کے باوجود حمص اکیلی ہی چلی جاتے گی تو اس کا مطلب کیا ہو گا؟ اس سے میں یا حامر کسی نتیجے پہ پہنچیں گے۔ یہی ناکہ تجھ کوئی دلچسپی نہیں۔ تو اپنی خواہشات کی غلامی ہے۔۔۔۔۔“

منیرہ رونے لگی، بات کاٹ کر بولی: بس بس اب میں آپ کی مزید باتیں نہیں سن سکوں گی۔ میں حامر کو اپنے ساتھ اس سے نہیں لے جانا چاہتی کہ آپ اس کی مخالفت کریں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے کا اعلان کر کے عین روانگی کے وقت اس نداشت سے نہیں دوچار ہونا چاہتی جو حامر کو جبراً روک کر آپ میرے چہرے پر مل دیں گے۔“

بارون کے باپ کو ایک دم اتنا غصہ چڑھ گیا کہ وہ اپنے ہوش و حواس ہی پر  
 سدا۔ اس نے عامر کو میزہ کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی گود میں لے لیا۔ بولا: "عامر! ادھر  
 میرے ساتھ چل، میں تجھ کو ادھر زیادہ ذلیل نہیں ہونے دوں گا۔" پھر میزہ کو بطور خا  
 حکم دیا: "ادھر لڑکی! تو حصّہ اس طرح جارہی ہے کہ ابھی تک مجھ سے حصّہ ملنے کی اجازت  
 تک نہیں لی، تو اپنی مٹنی سے جا رہی ہے اس لیے تو اس وقت تک حصّہ میں رہ جب  
 ہمارے خراسان سے واپس نہ آجائے؟"

میزہ نے وقت سے جواب دیا: "آپ کو داپسی کی بات کہہ بھی رہے ہیں لیکن  
 ایسا نادرہ کی بات تو یہ ہے کہ میں اب داپسی کا کوئی ارادہ ہی نہیں رکھتی۔ اس جہنم میں  
 دوبارہ نہیں لاپس آؤں گی۔"

عامر کا دادا تاملہ اسدہ گیا۔ اس نے عامر کو گود میں اٹھالیا اور یہ جادہ جا، بڑا  
 ادب سے بھلا بھلا ہوا وہ خیراً ہی وہاں سے دفعان ہو گیا۔

کئی دن بعد میزہ اس طرح حصّہ روانہ ہو گئی کہ اس کا ایک بڑوسی دودانہ  
 اس کا سر پرست تھا اور وہ عم زدہ اور اندرہ میزہ کو تسلیاں دینے میں مشغول رہا۔  
 بادشاہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے مشیتِ ایزدی کے مطابق۔  
 اس لیے میزہ کو شکایت نہیں کرنا چاہیے۔

حصّہ میں وہ اپنے گھر میں اتر گئی، یہاں اس کے چند رشتے داروں نے خوش آہ  
 کہی۔ اس کے باپ کا رشتہ تھا ایک بہن اور اس کے شوہر نے میزہ کو محبت اور عزت۔  
 اتارا اور اس کی خاطر مدارات میں لگ گئے میزہ کو رہ رہ کر دشتی، عامر اور بادون کی یہ  
 ستانی مڑی۔ دشتی جہاں اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ عامر جس پر اسے کوئی اختیار حاصل نہ  
 ہا۔ دن جہاں اس سے بہت دور خراسان میں بیٹھا تھا۔ وہ حصّہ کی فضا میں چھائے ہوئے بادلوں کی  
 حسرت سے نگہ رہتی۔ ان کالے کالے اور بھید سے بامستی بادلوں میں بڑا کیف تھا لیکن مزہ  
 کا زخمی اور غم زدہ دل اس کیف کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ وہ شام سے ذرا پہلے جب دروا  
 یا چھت سے سولہویں کے گلے آبادی میں داخل ہوئے دیکھتی تو معلوم نہیں کیوں یہ سوچنے  
 کہ یہی تمام مناظر اس کا شوہر ہا۔ دن بھی خراسان میں ہر شام دیکھتا رہتا ہوگا۔

ایک دن علی الصبح اس کا باپ بھی آندہ با تہان سے آ گیا۔ باپ کے ساتھ ہا  
 کا بہنوئی بھی آیا تھا۔ اس کی نظریں میزہ پر جو بڑی خوشگوار لگا اور اناشادوں انا  
 میں مانی الضمیر سمجھانے لگا۔ اس نے میزہ کو پھر شوق نظروں سے دیکھا اور عاجزی سے سوال

مینرہ: کیا بات ہے تو پریشان کیوں ہے؟ کیا ہامدن کے باپ نے تجھ کو نکال دیا؟  
مینرہ نے ضبطِ غم کی بڑی کوشش کی لیکن برداشت نہ کر سکی اور آنکھوں کے  
شے بھینکے لگے: "مہنیں ایسی تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی چلی آئی، ہامدن کا باپ مجھ  
کو لے گیا ہے۔"

مہنڑی نے طنزاً پوچھا: "عامر کہاں ہے؟"  
مینرہ نے چمک کی طرح جواب دیا: "درشتی میں اپنے دارلکے پاس۔"  
مہنڑی نے منہ نہ مارا پوچھا: "وہ تیرے ساتھ کیوں نہیں آیا؟"  
اس نے جواب دیا: "وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے ضد کر رہا تھا لیکن میں نے یہ  
سچ کر اس کو اپنے ساتھ نہیں لیا کہ اس کا دارا تنہائی سے آتا جاتا اور وہ اپنے پوتے سے بڑی  
تکبرتا ہے۔"

مہنڑی کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا، بولا: "مینرہ! تو سوچا ہے کہہ نے لیکن میں تیری  
پر یقین نہیں کر سکتا۔ ہامدن کا باپ بڑا ہی محذی ہے۔ جس طرح کا پیکر اگر تجھے یہ بات ابھی  
نہیں معلوم تھی تو آج مجھ سے میری زبان سے سن لے۔"  
مینرہ دم بخود کسی معصوم شامالی کی طرح منہ مڑی کی صورت دیکھتی اور باتیں  
کی جاتی۔

ہامدن کا مہنڑی کو شک تھا۔ "مینرہ! سادہ لوح اور بھولی بھالی لڑکی! سخی راجب بھی  
تجھ کو دیکھتا ہوں، یہی سوچتا رہا جاتا ہوں کہ مقدّمہ بھی کوئی چیز ہے، تقدیر بھی کوئی  
ہے۔۔۔۔۔"

لیکن اسی وقت مینرہ کا باپ بھی آگیا۔ اس نے ہامدن کے مہنڑی سے پوچھا: "کہیں  
بری بیٹی کو صرغاً تو نہیں رہا؟" پھر مینرہ سے پوچھا: "بیٹی! کیا بات ہے؟ تو بول کیوں ہے؟"  
مینرہ نے جواب دیا: "پدر! ہمدرد کوئی بیک سبب اداسی کا ہو تو بیان بھی کر دوں۔  
ہامدن سے شادی کر کے مصیبتوں کا جو دروازہ کھول چکی ہوں، اس کو بند کرنے کی قدرت  
میں رکھتی؟"

باپ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا: "کیا مطلب؟"  
ہامدن کا مہنڑی بول اٹھا: "مطلب کیا ہے؟ وہی مطلب ہے جس سے ہم  
دونوں ہی واقف ہیں۔ سامی گھر میں اگر ہامدن کا باپ نہ ہوتا تو گھر مرنا یا جنت بہتا لیکن  
وہ گھر۔۔۔۔۔"



مینرہ رونے لگی، بولی: "میں اس بوڑھے کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے حد کر دی  
مینرہ کے باپ نے اصرار کیا: "پھر بھی اس کا کیا بہ کچھ تو رہتا ہے میں اس ذلیل انسان  
شک کر سکتا ہوں۔"

مینرہ نے جواب دیا: "اب میں رشتہ واپس نہیں جاؤں گی۔"  
ہارون کے ہنسنے مینرہ کے باپ سے کہا: "مینرہ کے اس جھلب میں کہ لب  
واپس نہیں جاؤں گی، سب کچھ آگیا، اس سے کچھ پوچھنا بے کار ہے۔"  
مینرہ کے باپ نے کہا: "اچھا اب تو رافعی رشتہ واپس نہیں جائے گی۔ تو محرم  
میں رہے گی، ہارون بھی نہیں آئے گا اور ہمیں رہے گا۔"  
مینرہ نے اشک بار نظروں سے باپ کو دیکھ کر پوچھا: "اور عامرہ حاتمہ  
رہے گا؟"

مینرہ کے باپ نے نفرت سے جواب دیا: "میں نہیں جانتا کہ حاتمہ کہاں رہے گا؟  
وہ ہمارے ساتھ رہے پاس نہیں رہے گا۔" پھر ہارون کے ہنسنے سے کہا: "تو کچھ  
لیے باہر چلا جا، میں مینرہ سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"  
وہ باہر چلا گیا، مینرہ کے باپ نے آہستہ سے کہا: "یہ تو بار بار عامرہ کا نام کیڑ  
ہے یہ یاد رکھو وہ تیرا بیٹا نہیں ہے۔ ہارون کا باپ اپنے پوتے کو سکھا پڑھا کرتا ہے  
تیا بہرہ دے، افسوس کہ تو اولاد سے محروم ہے اور تیرا مستقبل تیری اولاد ہی محفوظ  
رکھنے کی، اور نہ کچھ بھی نہیں، تم دونوں، ہارون اور تم کسی وقت بھی ایک دوسرے  
سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہو۔"

مینرہ ان باتوں کا کیا جواب دیتی لیکن باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اپنے  
کی شہید خواہش کا ایسا چراغ روشن کر دیا جو اپنی پوری آب و تاب کی گری سے اس کے  
ادب پرست وجود کو پگھلا دے دے مانتھا۔

مینرہ کے باپ نے دے دے لیے اور اخلاصوں کنایوں میں پوچھا: "مینرہ مجھے  
اولاد سے محرومی کے پیچھے کوئی سازش، کوئی خاص منصوبہ کا ذرا نظر آتا ہے، ہو سکتا ہے  
خیال غلط ہو لیکن میرے اس خیال کی روشنی میں تجھ کو غور و فکر کرنا ہو گا اور ہارون کی  
کی کوشش کرنا ہوگی۔"

مینرہ کوئی جواب دینے بغیر باپ کے سامنے سے ہٹ گئی لیکن تنہائی میں لیٹ  
نے ہارون کی غلوں کا بڑا دیانت داری سے جائزہ لیا اور ان لمحوں کو بکھریا بہاں ہا

دن سے کام لے کر انتہائی نازک، خاص اور لطیف موقعوں پر خود کو بہ محبت منیزہ سے  
 لیا تھا اور یہی وہ قیمتی اور نازک لمحے ہوتے تھے جن میں اسے ادلا دل سکتی تھی۔  
 وہ ہارون کے اس فعل کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی تھی لیکن اب وہ ماضی کے اس  
 میں توجہ اور پابندی عرصہ میں کہہ کر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس خوف نے غصے اور اشتعال  
 اختیار کر لیا اور اس نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ایسا نہیں ہونے دے گی اور  
 حاصل کمر کے رہے گی۔

دوسری طرف ہارون کا بہنوئی اس فکر میں تھا کہ وہ کسی طرح ہارون اور منیزہ میں  
 فاصلہ پیدا کر دے۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتا جب وہ منیزہ سے ٹھیلے  
 بند رہا تین کمرے۔

منیزہ کے باپ کا خلافت کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ اس کو دمشق میں طلب کر لیا گیا تھا  
 بلوائے کو مانی رہنا چاہتا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے خطرناک نتائج بھی  
 سکتے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ ہارون کے بہنوئی کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتا جائے لیکن اس  
 مانعہ جانے سے انکار کر دیا۔ آخر مدبرہ جہ مجبور ہوئی اس کو اپنی بیٹی کو سمجھا پا بڑا، کہا۔  
 منیزہ میری بیٹی، میں چند دنوں کے لئے دمشق جا رہا ہوں، ہارون کا بہنوئی یہیں رہے  
 با اچھا ہو گا کہ یہ بھی میرے ساتھ ہی چلتا۔

منیزہ خاموش رہی، اس کا باپ سمجھ تو قف کے بعد مزید بولا لیکن میں اس کو ساتھ  
 پر مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ہالہ مخلص ہے۔ اس لیے اگر وہ میری عدم موجودگی میں  
 نہ جائے تو میں اسے مت بھی نہیں کر سکتا۔

منیزہ باپ کی صورت دیکھنے لگی کہ آخروہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ باپ کہتا ہے لیکن  
 مل تو رہے کہ ہارون اپنے بہنوئی سے خوش نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ تجھ سے خادی  
 اچھا تھا اور اگر ہارون ذرا یہ تاخیر پہنچتا تو آج ہارون کے بجائے اس کے بہنوئی  
 میوی ہوتی۔ پس اس واقعے نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔۔۔

منیزہ نے کہا۔ "باوا جان! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ جو کچھ کہنا ہے فی الفور کہہ دیجئے  
 مگر کہہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

باپ نے جواب دیا۔ "میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو ہارون کی میوی ہے، ہارون  
 واقعت بھی اس کا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جب ہارون یہاں آئے تو اپنے بہنوئی کو تیرے  
 گرد و پیش میں مشغول ہو جائے تو عموماً اس طرح جیسے ہارون بھی نہیں کہیں تو خود

ہے اور وہ تیری حرکات و سکنات پر نظر کر کے کہتے ہیں؟

منیزہ نے کہا: "میں جانتی ہوں، پھر بھی مزید خیال رکھوں گی۔"

منیزہ کا باپ دمشق چلا گیا۔ ہارون کا بہنوئی اس گفتگو سے لاعلم تھا اس لیے نے ایک اور ہی منصوبہ بنا لیا تھا وہ ابھی تک منیزہ کی طرف سے ایسے نہیں ہوا تھا کہ مشکل یہ پیش آنے لگی تھی کہ منیزہ اس سے بچتی پھر رہی تھی۔ اس کو کئی ایسے موقع ملے کہ منیزہ کو درگلا سکتا تھا لیکن منیزہ نے ان موقعوں کو ضائع کر دیا۔

منیزہ علی الصبح اٹھ کر نماز پڑھتی اس کے بعد کچھ دیر تلاوت میں لگاتی پھر کمرے کاموں میں مشغول ہوجاتی لیکن ایک دن اس کے معمولات میں فرق آگیا۔ منیزہ نے دن سے پریشان کر دکھا تھا، وہ اس کو ٹال رہی تھی لیکن ایک دن وہ بستر پر گر گئی۔ بھی ہو گیا، رات بھر نیم مہوشی میں معلوم نہیں کیا بڑ بڑاتی رہی۔ ہارون کے بہنوئی اس کے قریب جانے کا موقع مل گیا۔ صبح کی نماز بھی قضا ہو گئی، بہنوئی اس کے سر پر کھڑا ہوا، پوچھا: "منیزہ اب کیسی طبیعت ہے؟"

منیزہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا اور اپنے سامنے اٹھ کر دیکھ کر بٹھک گئی، پوچھا: "آپ یہاں کب آتے؟"

بہنوئی نے جواب دیا: "منیزہ! میں تیری مجبور یوں سے واقف ہوں لیکن میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ تو ظنی مجبور نہیں ہے، اس سے زیادہ مجبور ظاہر کرتا ہے سنی ہے۔ کہ خود اسے باہر آ جانا چاہیے؟"

منیزہ نے جواب دیا: "بھائی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ میں خود کو مجبور محسوس کرتی ہوں اور نہ ہی میں نے اپنے اس پاسی کوئی خول چڑھا رکھا ہے جو اس باہر آ جاؤں؟"

بہنوئی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا، شوخی سے بولا: "تجھے تو جھوٹ بول کر دھو میں مزہ آنے لگا ہے؟"

منیزہ نے غصہ کر کہا: "یہ آپ کی سوچ کا کمر شہ ہے درنہ میں بالکل بے لاش! مطمئن ہوں؟"

بہنوئی نے کہا: "منیزہ! میں تجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں؟"

منیزہ نے جواب دیا: "بھائی! پھر بھی باتیں کر لینا، مجھے اچھا ہو جانے دو؟"

بہنوئی نے منہ بنا کر کہا: "ان باتوں کے لیے اس سے بہتر موقع نہیں ملے گا"

منیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور عدم دلچسپی کا اظہار کیا، بولی: "جوابات کمری ہوں  
مرا جلد ہی کمر لیں کیونکہ طبیعت باتیں کمر لے یا سننے پر رعب نہیں ہوتی ہی"  
بہنوئی نے بوجھا: "منیزہ! تو سر پرچ پرچ بنا، کیا تو موجودہ حالات سے خوش اور  
تن ہے؟"

منیزہ نے جواب دیا: "اگر ہارون میرے پاس ہوتا تو میں خوش بھی ہوتی اور مطمئن  
تین اس کی عدم موجودگی میں خوشی اور اطمینان کا اقرار نہیں کر سکتی"  
بہنوئی تنکلا گیا بولا: "تو غلط بیانی سے کام لے رہی ہے، کیونکہ میں کیا جو بھی تجھے  
بے جانتا ہے خوب سمجھتا ہے کہ تو بالکل ناخوش اور غیر مطمئن ہے اور اگر ہارون  
پاس بھی ہوتا تب بھی موجودہ کیفیت برقرار رہتی"  
منیزہ نے کہا: "بس یہی بات کہنا تھی یا کچھ اور بھی؟"

بہنوئی سخت مایوسی تھا بولا: "پہلے تو اس کا اقرار کر کہ تو نے میری بات کے جواب  
دے کچھ کہا، وہ غلط ہے، جھوٹ ہے اس کے بعد میں چند اہم نگہ کام کی باتیں کروں گا"  
منیزہ نے بڑی سنجیدگی اور مضبوط لہجے میں جواب دیا: "بھائی! میں تمہیں کس  
یقین دلاؤں کہ میں جہ کچھ کہہ رہی ہوں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں جھوٹ کہوں بڑوں  
ہاں اگر تم میری زبان سے وہی سب سننا چاہتے ہو جو یہ جبر کہہ لو لے یہ مقرر ہوا تو میں  
خوش کرنے کے لیے کبے دری ہوں کہ میں ناخوش بھی ہوں اور غیر مطمئن بھی۔ اب  
پہلے کچھ"

بہنوئی نے کہا: "اگر ہارون اور تیرے درمیان ہارون کا باپ اور عامر موجود  
رہتے تو میں یقین سے کہہ سکتا کہ تم دونوں بہت عورتی ذخرم ہو لیکن ایسا ہے نہیں  
لیے میں۔۔۔۔۔"

منیزہ نے جواب دیا: "بہر حال میں بہت مطمئن اور خوش ہوں، جو مفقود طری  
میں بخشیں آ بھی گئی ہیں ہم دونوں کے دل دماغ میں تو وہ چند دنوں کے ساکھ میں  
جائیں گی"

بہنوئی نے کہا: "لیکن میں اسے ناجائز سمجھتا ہوں۔ منیزہ! اگر تو نے اپنے  
ناہاں میں ہاں نہ ملائی ہوتی تو آج تو میری بیوی ہوتی اور شہاٹھ کی زندگی گزار  
ہوتی"

منیزہ نے جواب دیا: "اے بھائی! یہ شہاٹھ کی زندگی کیسا ہے ہوتی ہے؟ مجھے

کیسے معلوم ہو؟

ہنونی نے ہنس کر کہا: تو ہارون سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لے! پھر  
بھود میری باتوں کا جواب مل جائے گا۔  
مینہ غصے میں اٹھ کر بیچھڑ گئی۔ طیش میں بولی: بھالی! یہ تم کیسی باتیں کر  
لگے، اگر تم سے شادی کرنا ہوتی تو ہارون سے شادی کیوں کرتی؟ میں ہارون سے  
کسفی ہوں۔“

ہنونی نے طنز کیا: محبت کوئی ہے ہارون سے! خوب مینہ یہ بالآخر مجھ کو  
بتا رہی ہے یا پھر تو بہت سیڑھی سادھی لڑکی ہے، کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں  
ہارون سے نالائ ہے۔ اس کے باپ اور بیٹے سے تو پریشاں اور سنا جاتا ہے اور میرے  
تہا تیری آمد اور موجودگی اس کی گواہ ہے کہ تو ہارون سے دل برداشتہ ہو چکی ہے  
ہے تو نے کبھی اس سے محبت کی ہو لیکن فی الحال تو ہارون سے متفرق ہے یہ بات میں  
یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔“

مینہ نے برا مان کر کہا: ”میرے پاس تمہاری فضول باتوں کا کوئی جواب نہ  
تم یہاں سے چلے جاؤ تا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں۔“  
ہنونی نے ہنس کر جواب دیا: اور میں بھی اس وقت تک یہیں موجود  
کر رہوں گا جب تک تو اپنے غم سے بلہ نہیں آجائے گی۔“  
مینہ چہرہ کر بیچھڑ گئی۔ سر کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر بولی: ”میرا سر درد کر  
خدا کے لیے میرا بیچھا چھوڑ دے بھالی! دیر میں دیوانے سے مسکرا لوں گی۔“  
لتنے میں مینہ کی پھوپھی بھی آگئی۔ اس نے مینہ کو بستر پر بیٹھ کر جو دیکھا  
اس سے پوچھا: ”کیا بات ہے مینہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

پتہ میں ہنونی بولی پٹا: ”مینہ کی طبیعت خراب ہے اور میں بڑی دیر سے  
کو یہ دوائے دے رہا ہوں کہ کسی طبیب سے رجوع کر لیکن یہ آمادہ اس نہیں ہوتی  
پھوپھی نے کہا: ”یہ ٹھیک تو کہتا ہے تمہارے پاس کا کہنا مان لینا چاہیے مینہ!۔“  
نیا وہ دونوں تک دبلے رکھنا خطرناک بات ہے۔“  
مینہ نے جھنجھلا کر کہا: ”پھوپھی جان! آپ بھی بھالی کی ہاں میں ہاں ملائے  
رہی ہیں۔“

پھوپھی نے جواب دیا: ”معقول بات ہوگی تو ہر شخص ہاں میں ہاں ملائے گا۔“

بہنہ نے پھوپھ سے کہا: "میں طبیب کو لاتا ہوں، آپ منیزہ کو حکم دیں کہ یہ اس  
 بھانے میں چمن و چراغ کرے۔"  
 پھوپھ نے سختی سے کہا: "تو طبیب کو بلالا، میں دیکھوں گی یہ علاج کس طرح  
 ن کر رہے گی۔"

بہنہ نے طبیب کے پاس چلا گیا اور منیزہ نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ ہانوں کے  
 بی کو اتنا حبث نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے جی میں آئی کہ جب ہانوں واپس آجائے  
 یا کو ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر مدہل گئی کہ اس کا نتیجہ بہت  
 نکلے گا۔

کافی دیر بعد جب واپس آیا تو طبیب نے اس کے ساتھ آیا نہیں، ہاں چند روایتیں  
 اس کے ہاتھ میں تھیں، انہیں منیزہ کی طرف بڑھا دیا، بولا: "منیزہ: میں نے تیرا حال کہہ  
 دیا ہے یہ روایتیں لی ہیں۔ اب تو کیسی ہے؟"  
 منیزہ نے بے زاری سے جواب دیا: "بھائی! تمہارے بلا وجہ زحمت کی اب میں بالکل  
 اب ہوں۔"

بہنہ نے ادھر ادھر دیکھ کر یہاں غلغلہ لگایا کہ پھوپھ کا کہیں پرہیز نہیں ہے۔ بولا۔  
 "وہ! میں تجھ سے جو بات چاہتا ہوں، یہ تو تو بھی طرح بغین کرے کہ ہانوں کا باپ ہمیشہ  
 پرہیز سے گا۔ کل عامر بھی بڑا ہو جائے گا اور ایک نیا ایک دن عامر بھی مصیبت بن جائے  
 یہ بات کہ تو خود صاحب اولاد ہو جائے، ناممکن ہے۔ ہانوں ایسا کبھی بھی نہ ہونے دے  
 مرا کہ یہ لغزش ہو بھی گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ پیدا نش کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جائے  
 یا تیری آنکھیں تیری اپنی اولاد سے محروم ہی رہے گی۔ پھر وہ اور زیادہ بے شری بہتر  
 ہو گا۔ ہانوں نے اب تک یقیناً نکل کیا ہو گا؟"

منیزہ ہچکچاہٹ رہی ہو گئی۔ اس نے غصے میں کئی ہاتھ رعبہ کر دیے، بولی: "بے شری  
 ان! تو اسی دولت دفعہ ہو جا نظروں سے دہنہ کوئی بہرہ نہیں حادثہ رونما ہو جائے گا۔"  
 لیکن بہنہ نے بھی آمالی سے زہر ہو جانے والا شخص نہیں تھا اسکا رازا ہوا ہوا منیزہ  
 اصرار مند ہوں اس لیے یہ فرقت بھی برداشت کر لوں گا۔ میں انتہائی خلوں سے تجھ کو یہ  
 کہنا چاہتا ہوں کہ تو ہانوں اور اس کے حالات کو سمجھنے میں سخت غلطی کر رہی ہے۔  
 تاکہ تو جس جگہ کھڑی ہے وہاں سے واپسی آسان ہے لیکن آگے گرنے ہو ش مندی سے  
 نہ لیا اور آنکھیں بند کیے اسی راہ پر چلتی رہی تو بدستختی سے وہ دن بھی آجائے گا۔

جب تو واپس نہیں جاسکے گی اور ساری زندگی خجالت اور اندامت میں گزار دے گی۔  
مینرہ نے پتھ میں کھڑے ہنونی کو دھکا دے کر ماہ سے ہٹا دیا، پوئی "میرا  
چھوٹا دے اور خبیث انسان، تو جو کچھ کہہ رہا ہے یا جو کچھ فریاد کر رہا ہے گا میں نہیں سنا  
اور ہارون کو تیری یادہ کوئی سے آگاہ کر دوں گی پھر وہ دے گا تیری باتوں کا صحیح جواب  
کہ تو اتہائی غلط انسان نکلا۔"

مینرہ بھاگ کر پھر پانی سے پاس چلی گئی۔ ہنونی کچھ دیر سکھڑا اس کی داپہو  
کرتا رہا۔ بالآخر وہ بھی داپہو سے ہٹ کر باہر چلا گیا۔ اب اس کو ایک فکر بھی لاحق ہو گئی تھی  
مے سوچا اگر مینرہ نے یہ جب کچھ ہارون کو بتا دیا تو کیا ہر گاہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔  
اور آخر کار یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ اس سے انکار کرے گا لیکن اگر انکار  
ہو تو وہ ہارون کا مقابلہ کرے گا اور اس مقابلے میں وہ ہارون کو بے شکست دینے کی کوشش  
کے گا۔

دوسری طرف مینرہ کو اب تنہائی سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ دا  
گر ہاتھوں سے دعا مانگ رہی تھی کہ عسایا تو باپ کو دشمنی سے واپس بلا دے ورنہ با  
ہی کر داپہو سے بلا لیا جاتے۔

یہ دعا اس طرح مقبول یا نہ گاہ ہوئی کہ دوسرے ہی دن اس کا باپ آ گیا۔ با  
دیکھتے ہی اس نے سکھ کا سامان لیا اور اس کے سینے سے لگ کر نادر وقت کر دے لگی۔  
نے اس کی پشت پر شفقت سے ہاتھ پھر کر پوچھا "بیٹی مینرہ! کیا ہوا کیا یہ یہ تو سو کیوں  
خیر بت لو ہے؟"

مینرہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے جواب دیا "باوا جان! میں آپ کی نصیحتوں کو یاد  
رہ رہی ہوں جو آپ دشمنی جانے سے پہلے کر رہے تھے، اس عمر میں اب میں نے یہ سمجھا  
بزدلوں کو شاید اسے والے واقعات کا قبل از وقت ہی علم ہو جاتا ہے۔"

باپ نے پوچھا "کیا کوئی خاص بات ہو گئی ہے؟"  
مینرہ نے جواب دیا "نہیں، ابھی تک تو نہیں۔"

باپ نے شوخی سے مینرہ کے سر پر ہاتھ پھر کر کہا "کوئی بات بھی نہیں ہوئی  
بزدلوں کو اسے والے واقعات کا قبل از وقت علم بھی ہو جاتا ہے۔ اب تو ذرا نہ گھبرا، میں  
ہوں؟ کچھ سوچ کر پوچھا: مینرہ! پتھ صبح بجا اس نے تجھ کو سنا یا تو نہیں ہے؟"  
مینرہ مدد لے لگی۔ "باوا جان! یہ شکھ قابل اعتبار ہرگز نہیں۔"

باپ نے چونک کر پوچھا۔ ”تو رو کیوں رہی ہے؟“ اس نے کیا کیا ہنسنے لگا۔  
 منبرہ نے پھر جوش آواز میں کہا۔ ”یہ کرتا کیا، اگر یہ کچھ کرتا تو میں اس کا برا حشر کر دیتی۔“  
 باپ نے بادباد اور مختلف طریقوں سے وہ بات معلوم کرنا چاہی جس نے منبرہ کو  
 لادیا تھا لیکن اس نے نہیں بتایا آخر وہ ہارون کے بہنوئی کو تلاش کرتا ہوا وہیں پہنچ گیا  
 ہاں وہ ہارون کی طرح چھپا کھڑا تھا، منبرہ کے باپ نے طنزاً پوچھا۔ ”تو یہاں کھڑا کیا کر  
 رہا ہے؟“ میں تو تجھے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔“

بہنوئی کی جان میں جان آگئی، بولا۔ ”جناب والا! آپ مجھ کو کہاں تلاش کر رہے تھے؟“  
 بڑی دیر سے کھڑا آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

منبرہ کے باپ نے منہ بنا کر ہارون کے بہنوئی پر یہ بات واضح کر دی کہ اس کا دل  
 میں سے صاف نہیں ہے، اس لیے وہ اب اس پر اعتبار نہیں کرے گا۔ ہارون کے بہنوئی نے  
 ہی منہ بنا کر نشیست پھیری اور دل ہی دل میں کچھ بچنے میں مشغول ہو گیا۔

\*

\*

\*

ہارون شرعاً ان سے چلا تو پہلے دمشق پہنچا۔ وہاں اپنے بیٹے حاکم کو سینے سے لگا لیا۔  
 ام باپ کو دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور منبرہ کی شکایت کر دی۔ ”جیکیاں لینے ہوتے  
 تھے۔“ وہ تنہا محض چلی گئی مجھ کو نہیں لے گئی، حالانکہ میں نے اس کی بڑی خورگام کی تھی۔“  
 باپ کو اپنے بیٹے سے ہمدردی ہوتی، ابھی وہ اس سے فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ اس  
 باپ بھی اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ ”یہ عامر تجھ سے کیا کہہ رہا تھا؟“  
 ہارون نے جواب دیا۔ ”اپنی ماں کی شکایت کر رہا تھا۔“

باپ نے منہ بنا کر کہا۔ ”ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ شکایتوں میں حق بھی انب ہے، میں  
 ابھی اس کی سفارش کی تھی کہ اپنے ساتھ لیتی جائے مگر منبرہ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ  
 نامرغ سے محض چلی گئی۔ تنہا، اکیلی۔ میں نے پہلی بار اس کی خود سری محسوس کی۔“

ہارون نے تلملا کر پوچھا۔ ”باوا جان! اس نے آپ کی بات بھی نہیں مانی؟“ یعنی اس  
 نامرغ خود سری آگئی تھی۔ میں یہ تو معاف کر سکتا ہوں کہ اس نے عامر کا دل توڑ دیا، یہ معاف  
 میں کر سکتا کہ اس نے آپ کا حکم بھی نہیں مانا۔“

باپ نے ہنسا کر پوچھا۔ ”میں نے ہرگز سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے  
 یہ معاف کر دیا۔“



لیکن اس سے ہمدون کا ہارہ پڑھ چکا تھا۔ وہ منیرہ سے سخت ناراض تھا اور دل آ  
 دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ پہلے تو وہ منیرہ کو سمجھائے گا، اگر وہ اپنے کئے پر مشرمت ہو گئی تو کو  
 بات نہیں دے وہ طلاق کی دھمکی دے دے گا۔

منیرہ کی کٹھنی کا ایک خاص سبب بھی اس کی سمجھ میں آئے ہا تھا۔ اس نے سوچا کہیں یہ  
 تو نہیں ہے کہ اس کے بہنوئی نے کسی طرح منیرہ کو درغلا یا ہوا وہ منیرہ کا حمص جانا بھی کہیں  
 اس سلسلے کی کوئی گڑھی تو نہیں۔ وہ ابا بھائیوں کے اپنے دل و دماغ میں بہتے ہوئے عامر کو  
 کہ حمص مولد ہو گیا۔ منیرہ ان دونوں کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس وقت ہمدون  
 بہنوئی بھی گھر ہی میں موجود تھا۔ بہنوئی نے سلام میں پہل کی اور ہمدون کو سلام کر کے  
 عامر کی طرف بڑھا ہمدون نے سلام کا جواب نہیں دیا، تکیے پر بے پروا ہو گیا تو گھر میں مزاح  
 ہے اگر یا میرا اندازہ غلط نہیں نکلا۔

بہنوئی نے بڑی محبت سے عامر کو گود میں اٹھلنا چاہا مگر ہمدون نے عامر کا ہاتھ  
 کر اپنی طرف کھینچ لیا اور بہنوئی سے کہا: "بہن مر گئی، میرا تیرا دشتہ ختم ہو گیا اس لئے کہ  
 بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کر۔"

بہنوئی نے نہ ہر خند کیا، بولا: "ہمدون! یہ تجھ کو ہو گیا گیا؟ تو کیسی باتیں کر  
 ہے؟"

ہمدون نے جواب دیا: "مجھ کو کچھ نہیں ہوا مگر کیا تجھ کو بھی کچھ نہیں ہوا؟"  
 بہنوئی نے کہا: "تو معلوم نہیں کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہا ہے؟"  
 اس کے بعد اس نے ایک بار پھر عامر کو گود میں اٹھانے کی کوشش کی مگر ہمدون  
 نے سختی سے منع کر دیا: "کیا حیرانی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟ میرا تیرا دشتہ ہی کیا اب  
 دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں؟"

بہنوئی مشرمتہ اور دل برداشتہ ہو کر باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ہمدون نے  
 سے پوچھا: "منیرہ! تیرا باپ کہاں چلا گیا؟"  
 منیرہ نے سنا گواری سے کہا: "میرا باپ گویا تیرا تو کچھ ہے ہی نہیں۔ وہ بازار  
 ہو رہا ہے۔"

ہمدون نے بڑی تیکھی نظروں سے منیرہ کو گھورنا شروع کر دیا۔ منیرہ نے ایک آد  
 باہر اس کو اسی طرح گھورتے دیکھ لیا اور سمجھ گئی۔ منیرہ نے عامر کو اپنی گود میں بٹھا لیا اور  
 سے گھر کی غیرت معلوم کرتا رہا ہمدون نے تلخی سے کہا: "منیرہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں

کہ میرے جاتے ہی اُڑا تھی بدل جلتے گی۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”میں خدا بھی نہیں بدلتی۔ تجھ سے یہ کس نے کہا کہ میں بدل گئی ہوں؟“

ہارون نے کہا: ”میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے مہنوی کا اس گھر میں کیا کام ہے؟ یہاں کیوں رہتا ہے؟“

منیزہ نے جواب دیا: ”ہارون! تو شاید یہ بات بھول گیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے یہ میرے باپ کا گھر ہے اور یہاں ہر وہ شخص آکر رہ سکتا ہے جس کو والد صاحب اپنے ہاتھ رکھنا چاہے۔“

ہارون دانت پیستا ہوا بولا: ”اگر یہ بات سچی تو تجھے اپنے باپ کو صاف صاف یہ بتانا چاہیے تھا کہ میں اپنے مہنوی کو سخت نا پسند کرتا ہوں اس کو اس گھر میں دیکھ کر میں زحیراں بھی ہوا اور پریشان بھی۔“

منیزہ خاموش رہی اور محبت سے عامر کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

ہارون نے کہا: ”امسوزیں کہ میں نے تجھ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا اور میں یہ امید لے رہا تھا کہ تجھ سے اور میرے متعلقین سے ہمیشہ بہت اچھی طرح پیش آتی رہے گی لیکن نے تو عامر تک کا خیال نہیں رکھا، اسے چھوڑ کر اکیلی محض چلی آتی۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”ہاں“ وہاں میں بہت پریشان تھی اور اس وقت تک میرے پاس میری پریشانی کا کوئی حل بھی نہیں تھا۔ اس لیے میں محض چلی آتی۔“

ہارون نے منہ بنا کر کہا: ”میں تیری ساری باتیں سمجھ چکا اب تو میری بات بھی سن۔ میں دمشق سے یہ فیصلہ کر کے چلا آؤں کہ یا تو تو میری فرماں بردار بن کر رہے گی یا پھر میں تیرا طلاق دے دوں گا۔“

اس تلخ ترین اعلان نے منیزہ کو بدحواس کر دیا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا، کانوں پر ہن نہیں آیا۔ اس نے نرمی سے جواب دیا: ”فرما برداری؟ کس قسم کی فرما برداری؟ کس فرما برداری؟“

ہارون نے کہا: ”تجھ کو باتوں میں یہ پہلا منیزہ! تو نے میری باتوں کا مطلب اس سے زیادہ سمجھ لیا ہے جتنا میں سمجھانا چاہتا تھا۔“

منیزہ کو غصہ تو بہت آیا ہوا تھا مگر بات ختم کرنے کے لیے وہ ہارون کے سامنے ہٹ گئی، بولی: ”ہارون! میں محسوس کر رہی ہوں کہ اسی وقت تو اپنے ہوش و حواس میں

نہیں ہے اس لیے میں اس وقت کوئی بات ہی نہیں کروں گی۔ پھر کسی وقت ہی بھر کے باتیں کروں گی۔“

ہارون دیکھنا کا دیکھتا رہ گیا۔ مینرہ اپنی پھوپھی کے پاس چلی گئی، دوسرے کمرے تک جاتے ہوئے ایک جگہ ہارون کا ہمنوی نظر آگیا۔ وہ شاید اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ مینرہ کا خفگی اور غم میں ڈوبا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے بوجھا۔ مینرہ: کیا بات ہے؟ میرا خیال اس اچھا انسان نے تیرا دل بھی دکھادیا۔“

مینرہ نے ڈانٹ کر جواب دیا: ”گو چپ ہو جا اور مجھ سے بات نہ کرو۔“ ہارون کی ناراضی کا اصل سبب تو یہ ہے، ہارون سمجھتا تھا کہ مینرہ اس کی لیے وہ اکٹری اکٹری باتیں کر رہا ہے۔“

ہارون کا ہمنوی خفا مٹش ہو گیا۔

سہ پہر کو مینرہ کے باپ سے بھی ملاقات ہو گئی، اس نے اپنے ذلیل کو بڑی خوشی اور غلصہ سے خوش آمدید کہی مگر ہارون اب بھی روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مینرہ کے باپ نے کہا: ”میں تو نیرا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا، خدا کا ہے کہ تو آگیا۔“

ہارون نے بد مزگی سے کہا: ”کیا میں بوجھ سکتا ہوں کہ اس گھر میں میری مرحوم کے شجرہ کا کیا کام ہے؟ اس کا رشتہ تو ختم ہو چکا۔“

مینرہ کے باپ نے برے سکون سے جواب دیا: ”ہارون بیٹے! تیرا ہمنوی کتنا؟“

پھر اسی لیکن یہ میدان جنگ کے اس دستے میں تھا جس میں خود شامل تھا۔ پھر وہ کے کہہ لیا: ”میں نے یا مینرہ نے تیرے ہمنوی کو تیرے ہی ذریعے پہچانا ہے اور اس گھر میں اکی جتنی بھی قدر و منزلت ہے اس کی بنیادی سبب وہی ہے جو میں نے بیان کر دیا۔“

ہارون نے کہا: ”اگر یہ بات درست ہے کہ تو نے میری مرحوم بہن کے شوہر کو یہ تعلق اور میرے رشتے سے پہچانا ہے تو اب اس رشتے اور تعلق کا واسطہ دے کر یہ کہہ رہا

کہ اس گھر سے اس کو ہمیشہ کے لئے نکال باہر کیا جائے۔“

مینرہ کے باپ نے انہوں سے کہا: ”مگر سن طرح؟ اس سے تیری وطنی کا تعاقب سبب وجہ؟“

ہارون نے جواب دیا: ”میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ میں نے جو کچھ دیا۔ اس پر عمل ہونا چاہیئے۔“

منیزہ کے باپ نے ذہن پروردہ دے کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنا فیصلہ کن جواب دے ملا۔ "اگر میں کہہ دوں کہ میرے ہی گھر میں کچھ اس طرح باتیں کر رہا ہے تو میں تیرا غلام ہوں اور تو میرا آقا۔ کچھ کو گفتگو کا سلیقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ تو منیزہ کو اپنے ساتھ لے جا اور مجھ کو میرے حال پر کچھ بتا دے۔ میں سو کے حکم بہت نہیں چل سکتا۔"

شاہد ہارڈن کو بھی اپنی تلخ کلاسی کا احساس ہو گیا۔ خدا دے سے بولا۔ "پدر بزرگوار! میں جب بھی اپنے ہنسوزی، شعلہ دیکھتا ہوں مجھے ہنسوزی کی عیادیں اور ہنس زیادہ سے لگتی ہیں، اس لیے میں اس شخص کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا: "گربلا کا جلد بانی اور حساس انسان ہے۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد کہ میں کچھ سے۔۔۔۔۔"

لیکن ہارڈن نے بات کا ٹکڑی لہلاہ: "آپ کچھ بھی کہیں مگر میں اس شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

منیزہ کے باپ نے جواب دیا: "میں کب کہتا ہوں کہ تو اس پر اعتبار کر۔" اس کے بعد وہ ہارڈن کو باہر لے گیا، بولا: "میرے ساتھ چل ہم دونوں تھیلے میں باتیں کریں گے۔"

منیزہ کا باپ اسے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹے سے باغ میں لے گیا۔ باغ میں انگوٹھ کا ہیلوں کے سامان پھیلے ہونے سے اوروں اور فالسے کے درختوں کی کثرت تھی۔ منیزہ کا باپ اس کو کئی کسان کے سائے میں لے کر بیچھو گیا اور گفتگو کا آغاز کیا: "ہارڈن! گو مروجہ دیا ہو گا کہ میں تجھ کو یہاں کیوں لایا اور باتیں کے لیے میں نے گھر کو کیوں نہیں پستہ کیا؟"

ہارڈن نے جواب دیا: "ہاں، میں نے اس پر غور تو کیا ہے مگر حیران ہو کر نہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جہت سی باتوں کے لیے گھر کی چاندنی لاری موزوں نہیں ہوتی۔"

منیزہ کا باپ ہنس دیا: "بالکل میرے دل کی بات کہہ رہی۔ مداخلتی میں جو بات کہنا چاہتا تھا اس کے لیے بینا کستان کی خلعت بہترین جگہ ہے۔"

ہارڈن نے لاپرواہی سے جواب دیا: "آپ تو کسی سنسنی خیز باتوں کے حامی ہیں یا پھر سیدھی سی بات یہ ہے کہ میرے ہنسوزی کا حامد کام کر گیا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں منیزہ سے قطع تعلقی کر لوں اور آپ منیزہ کو میرے ہنسوزی کے حوالے کر دیں۔"

منیزہ کے باپ نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور گھبرا کر کہنے لگا: "یہ ایسی کوئی

بات نہیں۔ میں تو تجھ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شادی کے کتنی سال بعد بھی تو لا ولہ کیوں ہے؟“

ہارون نے جواب دیا: ”یہ سوال تو خدا سے کیجئے۔ داد دینا یا نہ دینا تو اس کے اختیار میں ہے۔“

مینوہ کے باپ نے ایک دم جھنجھلا کر کہا: ”میں خدا سے جو بچ چھٹا ہوں وہ اس سے تعلق نہ رکھتے ہیں لیکن اب جو میں پڑ چھوں گا اس کا تعلق تجھ سے اور مینوہ سے ہو گا اور تجھ کو اس کے جوابات دینا پڑیں گے۔“

ہارون نے کہا: ”جو کچھ بھی پوچھنا ہے جلد از جلد پوچھو، ورنہ شاید اس کا بھی تروہ ہی سہائے اور میں واپس چلا جاؤں۔“

مینوہ کے باپ نے کہا: ”مینوہ کب تک نیرے بیٹے عامر کی پرورش کرتی رہے گی وہ اپنے بچے کی پرورش کب کرے گی؟“

ہارون نے جواب دیا: ”جب تک عامر بڑا نہیں ہو جاتا تیری بیٹی اس کی پرورش کرتی رہے گی جس دن یہ خود ماں بن جائے گی تو اپنے بچے کی پرورش بھی کرے گی۔“

مینوہ کے باپ نے خدا کو دردمے کر پوچھا: ”وہی تو ہیں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کب بنے گی؟“

ہارون نے جواب دیا: ”جب خدا چاہے گا۔“

مینوہ کے باپ نے کہا: ”اس میں خدا کو تو کیوں شامل کر رہا ہے، کیا یہ جھوٹ ہے تو اپنے عامر کی خاطر میری بیٹی کو لا ولہ سے محروم رکھے جو تے ہے؟“

ہارون نے جواب دیا: ”اس کا جو رنک پڑ گیا تھا، تیرے سے بولا۔ یہ جھوٹ ہے یہ کس نے بتایا؟ آپ کو؟“

مینوہ کے باپ نے جواب دیا: ”یہ جھوٹ نہیں ہے، اگر وہ میان میں عامر نہ ہوتا آج میری بیٹی کی گود میں سچے ضرور ہوتا۔“

ہارون نے غصہ ظاہر کیا: ”یہ ساری شراعتیں میرے جہنمی کی طرف سے ہو رہی ہیں انہیں کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

مینوہ کے باپ نے بھی سختی سے کہا: ”ہارون! تو نے مجھ پر احسان کیسے کئے ہیں اس کا یہ صلہ دیا کہ اپنی بیٹی کو عین اس وقت تیرے حوالے کر دیا جبکہ وہ کسی اندر کے دل میں ہی بیٹھی تھی۔ اب تجھے یہ زب نہیں دیتا کہ تو اپنے بیٹے عامر کی خاطر میری بیٹی کو لا ولہ

سے محروم رکھے۔ میں زیادہ بے مشرقی نہیں اختیار کروں گا لیکن تجھے یہ یقین رکھنا چاہیے کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں، ایک ایک بات۔“

ہارون نے بڑھچھا: ”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ ذرا اٹھل کر کہیے۔“  
مینرہ کے باپ نے جواب دیا: ”یہ کہ اب تو اپنی سازش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“  
”خیر کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مینرہ کو چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر تو مینرہ کو واقعی چاہتا ہے تو تو اس کو دل دے، درد و مشقت واپس چلا جا اور عام کرو اپنے ساتھ لیتا جا۔“  
ہارون نے کہا: ”یہ فضول سی شرط ہے، میں مینرہ کو لینے آیا ہوں۔“

مینرہ کے باپ نے حملہ دیا: ”مینرہ تیرے ساتھ جانے کی اور ضرور جائے گی لیکن اسی وقت جبکہ اس کی محرومی میں اس کا اپنا بچہ بھی ہو گا۔“ تو اس وقت تک محض ہی میں رہے گا۔ جب تک کہ عام کے علاوہ ایک اور بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔“  
ہارون نے کہا: ”مجھے کب تک یہاں رہنا ہوتا ہے؟“

مینرہ کے باپ نے جواب دیا: ”سال بھر، دو سال، تین سال۔ جب تک کہ مینرہ کے بچے کا بھی باپ نہیں بن جاتا۔“

ہارون نے کہا: ”یہ تو بڑی بڑی شرط ہے، میں مینرہ کو جبراً لے جاؤں گا۔“  
مینرہ کے باپ نے جواب دیا: ”اگر جبراً لے جا سکتے ہو تو ضرور لے جاؤ۔ مینرہ اتنی آسان بات بھی نہیں ہے۔“

ہارون نے کھڑے ہوتے ہوئے بڑھچھا: ”تو آپ اتنی سی بات کے لیے یہاں لاتے تھے مجھے؟“

مینرہ کے باپ نے جواب دیا: ”تیرے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے تو ہوا کرے میں اس کو بہت بڑی بات سمجھتا ہوں۔“

ہارون نے کہا: ”مینرہ میری بیوی ہے، آپ اس کو اس کی مرضی کے خلاف نہیں روک سکتے، میں اس سلسلے میں پہلے مینرہ سے بات کروں گا اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔“

مینرہ کے باپ نے کہا: ”تو مینرہ سے بھی بات کر لے۔ میں نے کب منع کیا ہے۔“

وہ دونوں چپ چاپ اٹھے اور گھر کی طرف چل پڑے۔ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی راستے میں کوئی بات نہ کی۔

منیزہ کے باپ کو اس دقت بڑی شرمندگی ہوئی جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ منیزہ اور مادون کا بہنوئی دونوں کمرے میں تنہا باتوں میں مشغول ہیں، عامر باہر کھڑا باپ کا انتظار کر رہا تھا۔ منیزہ کے باپ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر مادون نے اس کو پکڑ لیا اور سرگوشی میں کہا: "اس طرح نہیں پہلے ان دونوں کی باتیں سن لی جائیں کیونکہ میں اپنے شہادت کو یقین میں بدل دینا چاہتا ہوں، اگر ان دونوں میں کسی قسم کے عہد و پیمان ہو رہا ہے ہیں تو مجھ کو کنوارہ کٹھی اختیار کر لینا چاہیے۔"

منیزہ کا باپ بہت شرمندہ تھا، بولا: "لیکن رسول اللہؐ نے کسی کی جستجو کرنے سے منع کیا ہے۔"

مادون نے جواب دیا: "لیکن میں کسی کی جستجو کر بھی کب دم ہوں میں تو اپنی بہری کی باتیں سننا چاہتا ہوں۔"

منیزہ کے باپ نے کہا: "مادون! اگر تیرا شہد یقین میں بدل گیا تو میں تیرا ساتھ دوں گا کیونکہ میں ایک غیرت مند باپ ہوں اور میں یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ منیزہ ہم دونوں کو دھوکا دے۔"

مادون نے اپنے سر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "خاموش رہتیے، ہماری سرگوشی کی ڈا کہیں اندر تک نہ پہنچ جائے۔"

یہ دونوں دمدار نے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے لیکن منیزہ کے باپ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

اندرا آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ مادون کا بہنوئی کہہ رہا تھا: "منیزہ! بات بگڑنا نہیں چاہیے۔ میں مادون کا بہنوئی مرہ چکا ہوں اس لئے میں مادون سے بھی محبت رکھتا ہوں۔ ہاں، اس سے ضرور اختلاف ہے کہ اس نے ایک حادثہ کے ذمہ اثر تھج کو اور اور محرم کر رکھا ہے۔"

منیزہ نے افسردہ لہجے میں جواب دیا: "لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اسی پر یقین رکھتی ہوں لیکن میں مادون کی جہانی برداشت نہیں کر سکتی اور پھر داسر تو میرا اپنا ہی بیٹا ہے۔"

باہر منیزہ کے باپ کا دھڑکتا ہوا دل کسی حد تک قابو میں آ گیا وہ جو کچھ سن چکا تھا، اس سے وہ ایک بڑی شرمندگی سے بچ گیا تھا۔ لیکن دل میں کہیں یہ جو رب بھی موجود تھا کہ کہیں وہ دونوں ایسی باتیں نہ کرنے لگیں جو اس کے

ہاں سننا نہیں چاہتے۔ منیرہ کے باپ نے ہارون کو فائنڈ انڈا میں دیکھا، بولا: "میں  
پس دونوں کی باتیں، دوست ہیں تو ڈر رہی گیا تھا کہ میں آج میرے چہرے پر سیاہی نہ چھتکتا"  
ہارون نے کہا: "ڈرنا تو وقف سے کام لیتے۔ ابھی دستک نہ دیتے گا۔"

لیکن اندر دلوں کو ان کی آہٹ بل چکی تھی۔ اندر سے دردناک کھل گیا اور دونوں  
ہارون اور منیرہ کے باپ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر ہر لیشان ہو گئے۔

منیرہ نے پوچھا: "یہ آپ دونوں یہاں جھوٹ کی طرح کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟"  
ہارون نے جواب دیا: "یہی سوال میں تجھ سے کہہ سکتا ہوں کہ منیرہ! یہ تم دونوں  
جھوٹ کی طرح اندر بند ہو کر کبھی باہر نہیں کر رہے تھے؟"

دونوں کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ہارون کے مہنوی نے کہا: "ہم دونوں تجیلے  
میں موجود تو ضرور تھے لیکن باتیں تجیلے کی نہیں ہو رہی تھیں۔"

منیرہ البتہ منتر مند تھی باپ سے بولی: "آپ دونوں اتنی جلدی دلائیں آگے؟"  
ہارون نے طنزاً کہا: "ہاں، حالانکہ تو سمجھ رہی ہو گی کہ ہم دونوں آدھا دل گزار  
کر رہے ہیں؟"

منیرہ کھیلا ہوتی مٹھی بولی: "میں، میں ایسا نہیں سمجھ رہی تھی۔"  
ہارون نے اپنے مہنوی اور منیرہ کے باپ سے کہا: "آپ دونوں باہر چلے جائیں  
میں منیرہ سے فیصلہ کن باتیں اسی وقت کر لینا چاہتا ہوں۔"

منیرہ کے باپ نے جواب دیا: "لیکن اس کا خیال اسے کہ میری بیٹی نے میرے مہنوی  
سے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جس کا تو طعنہ دے یا جواب طلب کرے۔ ہاں وہ تجیلے  
میں باتیں کرنے کی البتہ گناہ گار ہے۔"

ہارون کے مہنوی نے اعتزاز کے لہجے میں کہا: "ہارون! تجیلے میں میں ہی لایا  
خاندانہ منیرہ نہیں آئے ہیں تھی اس لیے اس سلسلے میں منیرہ کو طعنہ نہ کرنا۔"  
ہارون نے جواب دیا: "منیرہ میری بیوی ہے، میں اس سے جو بھی باتیں کروں گا  
تم لوگوں کی رہنمائی اور مشورہ دل کے بغیر کروں گا۔"

منیرہ کا باپ ہارون کے مہنوی کو نے کر چلا گیا۔ سستے میں کہا: "تو نے یہ اچھی  
ت نہیں کی۔ تو نے ہارون کو بلاوجہ شک و شبہ میں ڈال دیا۔"  
اندر ہارون نے جب دردناک بند کرنا چاہا تو منیرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا: "دردناک  
نہ نہ کر کیا کھلے کرے میں باتیں نہیں ہو سکتیں؟"



ہارون نے منیزہ کی خواہش پر مکرے کو بند نہیں کیا، بولا: ”تو مجھ سے خوفزدہ  
منیزہ نے جواب دیا: ”نہیں تو“

ہارون نے کہا: ”نہیں، تو مجھ سے خوفزدہ ہے۔ کیونکہ لوکرے کو اندر سے بند  
میں خوف محسوس کر رہا ہے۔“

منیزہ نے موضوع بدل دینا چاہا۔ ”ہارون! تجھے جو باتیں کرنا ہیں وہ کر کے گا  
سے کچھ حاصل نہیں۔“

ہارون نے جواب دیا: ”منیزہ! بات دیا اصل یہ ہے کہ اگر ہم دونوں تمہارا  
اور کسی کو اپنے معاملات میں دخل دینے کا موقع نہ دیں تو ہم دونوں زیادہ خوش رہ  
گے۔ کم از کم میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگوں نے تو انرا اور احمد  
یس یہ کہی ہے کہ میرے ساتھ جو زیادتی ہو رہی تھی اس سے مطلع حکم دیا اور اس سے یہ  
یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خاندان کے لوگ بہت ضروری ہیں کیونکہ یہ لوگ غلطیوں اور کوتاہیوں  
نشانہ ہیں کہ تا دیر ان پر قائم نہیں رہنے دیتے۔“

ہارون نے کہا: ”اپنے اپنے تجربے ہیں۔ کوئی بات ایک کو نقصان پہنچاتی ہے تو  
کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے۔“

منیزہ نے کہا: ”اب کام کی بات کر، تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“  
ہارون نے پوچھا: ”کس سلسلے میں؟ کس بات کا فیصلہ؟“

منیزہ نے جواب دیا: ”سچی لوگ معترض ہیں کہ شادی کے کئی سال بعد بھی  
اولاد سے محروم کیوں ہوں۔“

ہارون کو ہارون طرف سے ایک ہی بات سننا پڑ رہی تھی۔ وہ بوکھلا گیا۔  
تو نے اس کا کیا جواب دیا؟

منیزہ نے کہا: ”میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں، جواب تو تجھے دینا ہے۔“  
ہارون نے کہا: ”کیونکہ جب تو نے عاسکو اپنا بیٹا مان لیا ہے تو پھر اس پر

اصر رکھوں؟“  
منیزہ نے جواب دیا: ”اپنی اولاد کی بات ہی کچھ ادر ہے۔ میں اپنا بیچہ چ

ہوں اپنی اولاد۔“  
ہارون نے تھکے تھکے لہجے میں کہا: ”منیزہ! لوگوں کے دماغ نے میں نہیں آنا

درد نہ بیٹے ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات میں خوشگوار ہی اسی وقت تک ہے جب کہ تو اپنے بچے کی ماں نہیں بن جاتی۔ تو اس بات کو سمجھ نہیں رہی ہے، لوگ وہ سب نہیں دیکھ سکتے جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔“

منیرہ نے اٹل ہجے میں کہا: ”لیکن میں بچہ چاہتی ہوں اپنا بچہ، جو میری کوکھ سے پیدا ہوا ہو، جسے میں نے اپنے خون سے پالا ہو۔“

ہارون نے کہا: ”اگر میں انکار کروں تو؟“

منیرہ نے جواب دیا: ”تب پھر میں حاکم کو بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔“

ہارون ایک دم چونک پڑا: ”تو حاکم کو اپنے پاس نہیں رکھے گی، کیوں؟“

منیرہ نے جواب دیا: ”سوائے تلخ اموتی ہے۔ میں اور تقریباً سبھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حاکم کی وجہ سے اولاد سے محروم ہوں اور پھر یہ ایک حقیقت بھی ہے اس لیے میں اپنی بے اولادی کے سبب کو درد کروں گی۔“

ہارون نے حیرت سے دم نہ کمر کہا: ”لیکن ابھی کچھ دیر پہلے تو تو حاکم کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی۔“

”ہاں، میں حاکم کو اپنا بیٹا کہہ رہی تھی اور ہمیشہ اس کو اپنا بیٹا سمجھا بھی ہے لیکن میں اپنے حقیقی بیٹے کی خواہش میں حاکم کی جدائی گوارا کر لوں گی۔“

ہارون نے کہا: ”منیرہ، تو جو فیصلہ بھی کرے یہ سوچ کر کہ اگر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے تو تو اس کی سے بھگت لے۔“

منیرہ نے جواب دیا: ”ہارون! میں نے اس سے زیادہ سوچ رکھا ہے۔ میں اس وقت تک تجھے درد نہ ہوں گی جب تک کہ میں میرے بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔ میں تجھ کو اپنے ساتھ رہنے کا ایک ماہ دوں گی، اس کے بعد تو چلا جاتے گا اور اس وقت تک تو میرے پاس نہ رہے گا جب تک کہ میں ایک بچے کی ماں نہ بن جاؤں۔“

ہارون نے پوچھا: ”اگر میں تجھ کو باؤس کر کے چلا جاؤں تو؟“

منیرہ نے جواب دیا: ”تو اس صورت میں، میں تیرا دو سال انتظار کروں گی کہ شاید تو اپنا فیصلہ بدل دے اور میری خواہش کے احترام میں حاکم کو ایک بھائی یا بہن عطا کر دے۔“

ہارون نے پوچھا: ”اور اگر میں دو سال بعد بھی اپنے فیصلے پر قائم رہا تو؟“

منیرہ نے ایک سرد آہ بھری بولی: ”تب پھر میں اپنی سوچ بدل دوں گا اور تجھ سے امیدیں ختم کر کے تیری جگہ کسی اور کو دینے کی کوشش کروں گی۔“

ہامدون نے انسوؤں سے کہا: "نیزہ! انسوؤں کہ میں آج تک اس غلط فہمی یا فہمی میں رہا کہ ہم مردوں میں ایک مثالی محبت پائی جاتی ہے، یعنی ہم دونوں کی سوجھیں کے لطیف جذبوں سے سرشار ہیں لیکن اس وقت یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا کہ تو میری جگہ ادا کر بھی دے سکتی ہے!"

نیزہ نے خشک لہجے میں جواب دیا: "انسوؤں کہ ابھی تک میں بھی اسی خوش میں تھی، لیکن جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ نیری نظر میں عام مجھ سے زیادہ اہم ہے تو ٹوٹ گیا اور میں ماہوسوں کے گہرے سمندر میں بیٹھتی چلی گئی اور مجھ کو مجبوراً یہ فیصلہ پڑا جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے۔"

ہامدون اپنے مفردے کو بہت مضبوط سمجھ رہا تھا مگر جب دلائل اور براہین جنگ چھڑی تو وہ شکست کھا گیا، شکست فاش۔ اس نے بے دلی سے پوچھا: "تو یہ تیرا اور آخری فیصلہ ہے کہ اولاد سے محروم رہ کر تو مجھ سے علیحدگی اختیار کرے گی؟"

نیزہ نے جواب دیا: "میں تجھ کو اپنے ساتھ ایک ماہ رکھ سکتی ہوں اس کے بعد فیصلہ کر دوں گی۔"

ہامدون نے کہا: "لیکن میں بھی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا، میں تجھ کو کسی پر بچوں کی ماں بنا کر عامر کی بد نصیبی کو آواز دینا پسند نہیں کرتا۔ میں یہاں ایک ماہ بھی کیوں جبکہ میں یہ قطعی فیصلہ کر چکا ہوں کہ جب تک عامر جوان نہ ہو جاتے ہیں کسی دوسرے باپ نہیں بنوں گا۔"

نیزہ نے دغیر جذبات میں آنکھیں بند کر لیں اور بولی: "تب پھر تو اسی وقت جا اور دو سال تک اپنی اس غلطی پر سوچتا رہ، اگر اسی عرصے میں تو نہ اہمیت محسوس کرنے اور میری گود بھی آباد کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو میں تیری دلچسپی پر خوش آمدید کہوں گی اور دو سال بعد بھی تو خود کو نہ بدل سکے تو ازراہ مہربانی مجھ کو طلاق دے دینا تاکہ میں آزاد جاؤں اور اپنے بارے میں کوئی اور فیصلہ کر دوں۔"

ہامدون نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ وہ اپنے دو سال بعد والے فیصلے کا بھی اسی اعلان کر دے لیکن وہ نیزہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ سبب وہ یہ سوچتا کہ اس کی نیزہ کسی اور کی آغوش میں چلی جائے گی تو وہ ایک عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا۔ دوسری طرف اس کا باپ اور بیکر دونوں ہی خیالوں میں اس کو منع کر رہے تھے اور ہاتھ کے اشاروں پر اس کو روک رہے تھے کہ خیر وار جو تو نے نیزہ کو اولاد دی کیونکہ جب بھی تو ایسا کرے گا۔

نہ ہو جاتے گا۔

ہری طرف دل کے اندر معلوم نہیں کون یہ مستزہ دے رہا تھا کہ دو سال تک صبر  
نہ کرے میں خود منیزہ کو اپنی بے جا خدمت پر حسوس ہو اور شرمندگی کا اظہار کر کے  
ہو جاتے۔

وہ اس کے چہرے پر نظریں گاڑے اچیر و بیم کی افیت جھیل رہی تھی۔ وہ ہارون  
پر ہمارا امید ہو گئی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کے کان  
چسنا چاہتے تھے، دل وہ مفہوم پاچا کا تھا۔ ہارون کی کچھ و بیم کی خاموشی اس  
برداشت ہو گئی۔ بے چینی سے بول اٹھی: "ہارون! مجھے پریشان نہ کہادو اپنے  
ی آگاہ کرو۔"

نہ نے محبت بھری نظروں سے منیزہ کو دیکھا اور مسکرایا گو کہ اس مسکراہٹ میں  
کا احساس بھی شامل تھا مگر اس احساس کو منیزہ محسوس نہ کر سکی۔ ہارون نے  
قادر لہجے میں کہا: "منیزہ! انہوں نے کہ میں تجھ کو بے جا میا ہوتا ہوں اور اس پر  
کہ اگر کسی وجہ سے تجھ کو تجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانا پڑے تو میں زیادہ  
ہوں گا۔"

نہ بات کاٹ دی، بے اختیار بولی: "تو اسی کا یہ مطلب ہوا کہ تو نے اپنا فیصلہ بدلنا  
نہ اپنے بچے کی ماں بن جاتے گی؟"

نہ نے جواب دیا: "نہیں، یہ بات نہیں، میں اپنے فیصلے پر اب بھی قائم ہوں۔  
بے تجھ سے جدا ہو جاتا ہوں۔ تو یہ دو سال اسی امید میں گزار دے گی کہ شاید  
نئی ہوا درمیں اس ہجر کو یوں برداشت کر لوں گا کہ اگر تو مجھ سے واقعی محبت  
کرن ہے کہ تو خود ہی اپنے فیصلے سے منحرف ہو جاتے اور میرے پاس

لے آتے ہیں بند کر لیں اور بستر پر گر گئی، بولی: "تو کچھ تو میرے سے اسی وقت  
بعد مجھ سے ملاقات کو، لیکن میرے بارے میں ہمیشہ اس یقین پر عمل کرنا  
کہ کوئی سمجھوتہ کر لوں گی تو یہ تیری معمول ہو گی؟"

ایک دم کھڑا ہو گیا، بولا: "اچھا منیزہ! اب میں یہاں نہیں ٹھہروں  
نہ ساتھ لے جا رہا ہوں۔ دو سال بعد تیرے فیصلے کے بارے میں معلوم

منیزہ کو یہ یقین نہیں تھا کہ ہارون فورا ہی رختِ سفر باندھ دے گا۔ بلکہ اگر تو چاہے تو ابھی ایک ماہ تو رہ سکتا ہے۔  
ہارون نے جواب دیا: "میں نے کہہ جو دیا کہ میں اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا  
یہ لڑنا ہی نہیں تو پھر ایک ماہ بھی کیوں رہوں؟"

منیزہ نے ہونٹ پیچھے لیے، بولی: "تیری مرضی، اب میں بھی اصرار نہیں کر  
ہارون کمرے سے باہر نکلا تو اپنے ہنٹوی اور منیزہ کے باپ کے اندازے  
ان دونوں نے بھی اس کی باتیں سن لی ہیں کیونکہ دونوں میں سے کسی ایک نے بھی  
کہ اندر کیا فیصلہ ہوا؟  
اس نے عامر کا ہاتھ پکڑا اور بڑے دکھ سے کہا: "آؤ بیٹے دمشق چ  
داؤا کے پاس۔"

عامر نے معصومیت سے پوچھا: "اور میری نئی ماں؟ کیا وہ نہیں چلیں گی  
ہارون نے اپنے غم کو سینے میں دبا لیا، بولا: "ہاں بیٹے، منیزہ نہیں آئے  
یہیں رہے گی اور ممکن ہے کہ وہ اب ہمیشہ ہی یہیں رہے اور ہماری پھر کبھی  
ملاقات ہی نہ ہو۔"

منیزہ کا باپ آگے بڑھا اور بولا: "ہارون! میں تیرا انتظار کر دوں گا۔"  
ہنٹوی نے کہا: "بہر حال میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا اور اس حوالی کو  
رہا ہوں۔ منیزہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"  
ہارون نے جواب دیا: "بہر حال یہ جو کچھ ہوا یا جو کچھ ہوگا اس میں  
کار فرما ہے۔"

ہنٹوی نے کہا: "اگر یہ شک نیرے دل میں بیجھ گیا ہے کہ اس اختلاف  
میں میرا کچھ کام کر رہا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں، مجھ کو معاف کر دے  
بعد عامر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: "یہ معصوم انسان گاموں میں کیوں شامل ہو؟ پھر  
سوال کیا: "عامر بیٹے! کیا تو ہمارے معاملات جانتا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تو  
ہی رہ جائے میں تیری پرورش کر سکتا ہوں۔" پھر ہارون سے پوچھا: "کیا تو  
ساتھ ہی لے جاتے گا؟"

ہارون نے جواب دیا: "ہاں میں عامر کو اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔"  
ہنٹوی نے کہا: "میری طرف سے منیزہ اور خجہ کو ایک پیش کش ہے۔"

نے پوچھا۔ ”کون سی پیش کش ہے؟“  
 بی نے جواب دیا۔ ”تیرے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے اگر تو چاہے تو عامر  
 سے کہہ دے، میں اس کو بڑے پیار سے رکھوں گا، اس طرح تو منیزہ کی خواہش  
 پوری ہو جائے گی۔“

بی نے پوچھا۔ ”پھر یعنی اس سے مجھے کیا سہارا ملے گا؟“  
 بی نے جواب دیا۔ ”اس سے یہ سہارا ملے گا کہ تو عامر کی طرف سے بے نیاز ہو  
 کر رہ سکتی ہو۔“

بی نے جی میں آئی کہ وہ اسی وقت عامر کو اپنے ہمنوی کے حوالے کر دے اور  
 اس واپس جاتے اور ہنس کر یہ خوش خبری سنا دے کہ وہ منیزہ کی ہر خواہش  
 پوری ہے۔

پھر اچانک اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور عامر کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس  
 سے کہے دے کہ کھڑی ہارون کو جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ منیزہ کا باپ اور  
 با دوڑوں ہی اس کو جلتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو  
 کر دو باہر گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

\*

\*

دن روشن واپس گیا اور اپنے باپ کو پوری تفصیل بتادی۔ باپ ساری رات سو  
 رہا، آخر میں پوچھا۔ ”پھر کیا ہو گا؟ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں۔“  
 بی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے، آپ ہی بتا رہے  
 ہیں۔“

نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ”تو خراسان یا کسی اور محاذ پر چلا جلتے گا، عامر کی دیکھ  
 سے گا۔“

بی نے کہا۔ ”میں خود بھی یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں۔“  
 بی نے کہا۔ ”تو منیزہ سے کہہ دیا ہوتا کہ دو سال بعد بھی میں اپنے امادوں پر  
 اس لئے جو فیصلہ کرنا ہے ابھی کہہ لے۔“

بی نے جواب دیا۔ ”باوا جان! میں نے یہ بات کہہ دی تھی مگر اس نے کہا کہ نہیں،  
 کہ نہیں مانگی کیونکہ دو سال بعد یہ جذبات نہیں ہوں گے جو اس وقت ہیں

اور جب یہ جذبات نہیں ہوں گے تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوگا، اس لیے اس وقتی ہنگامہ اور جذباتی فیصلے کو میں نہیں مانتی۔“

باپ نے کہا: ”تب پھر تو منیزہ کو طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے۔“  
 ہارون ہنس دیا: ”میں دوسری شادی کیوں کر لوں گا، اس کا قاتل ہے۔“  
 باپ نے جواب دیا: ”اس کا قاتل یہ ہوگا کہ عامر کی پرورش اور نگہداشتہ طرح ہو جائے گی۔“

ہارون نے کہا: ”اور جب یہ دوسری بیوی بھی مجھ سے اولاد کی خواہش کرے اس وقت میں کیا کروں گا؟“

باپ پھر سوچ میں پڑ گیا، بولا: ”عامر کی فلاح اسی میں ہے کہ کسی اور لڑکی سے تیری اولاد نہ ہو۔“

ہارون نے کہا: ”افسوس کہ میں خمدان واپس جاؤں گا، عامر کے پاس رہ اس کو کس کے پاس چھوڑ جاؤں؟“

باپ کا دماغ بھی کام نہیں کر رہا تھا۔  
 ہارون کی عدم موجودگی میں اس کے بہنوئی نے بڑی کوشش کی کہ منیزہ کو ہر آوازہ کر لے لیکن وہ اس مؤذوغ پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے اپنے باپ کو کہہ دیا کہ اگر یہ شخص اسی طرح باتیں کرتا رہا تو وہ درشتی میں اپنے شوہر ہارون کے چلی جائے گی۔

ہارون نے خمدان چلتے ہوئے عامر کو اپنے ساتھ لیا کیونکہ وہ عامر کے سلیس باپ کو نہیں پریشان کرنا چاہتا تھا۔ وہ عامر کو لے کر خمدان کے چپے چپے میں گھوم رہا۔ اس کو اپنے باپ سے یہی ایک معمولی سی شکایت تھی کہ وہ ہارون کو مشورہ تو لیا دے دیتا جن کی اذیت مسلم تھی، لیکن اس پر عمل نہ کرتا تھا۔ ہارون بمشکل ڈیڑھ گھنٹہ گزار سکا اس کے بعد وہ سیرھا حمص پہنچا اور منیزہ کے سامنے وہ زروال ڈھیکہ اس نے مختلف جنگوں میں انعام و اکرام اور مال و غنیمت سے حاصل کیا تھا۔ منیزہ اس کا تو کرم ہی تھی لیکن اتنی بے چینی سے نہیں کیونکہ اس کے اپنے حساب کے مطابق ہارون ٹھیک دو سال بعد واپس آنا تھا۔ جب منیزہ کے سامنے مال و زرد کا ڈھیر لگایا گیا تو باپ کی مال ٹیک پڑی اور اس نے بیٹی کو حکم دیا: ”ہارون تھکا ہوا ہوگا اس لیے اسے غسل اور آرام کا انتظام کر دے۔“

عامر بھی ان دونوں کے سامنے ہی تھا مگر اس پر دونوں میں سے کسی ایک نے بھی توجہ نہیں دی۔ ہارون نے عامر کو حکم دیا کہ عامر! تو نے اپنی ماں کو سلام نہیں کیا؟

عامر نے جھپکتے ہوئے تمہایت تکلف سے منیزہ کو سلام کیا۔ منیزہ نے بھی کسی قدر تکلف سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سلام کا جواب دے کر پوچھا: تو ٹھیک ٹھاک تو ہے؟ عامر نے گمردن ہلا کر جواب دیا: بالکل ٹھیک ہوں ماں!

ہارون نے اچھرا دیکھ کر پوچھا: منیزہ! میرا ہنوتی کہاں چلا گیا؟ منیزہ نے جواب دیا: اس نے دوسری شادی کر لی!

ہارون نے اطمینان کی سانس لی، بولا: منیزہ! تو نے بہت بڑی خوشخبری سناؤ! دورے میں اس کی طرف سے بہت فکر مند رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو ناچاقیاں ہوتی ہیں ان میں میرے ہنوتی کا بڑا ہاتھ تھا!

منیزہ نے جواب دیا: لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی!

ہارون نے پوچھا: وہ آج کل کہاں رہ رہا ہے؟

منیزہ نے جواب دیا: یہیں، اسی گھر میں میرے پاس ہی!

ہارون نے کہا: خوب! تو اس نے ابھی پچھا نہیں چھوڑا!

منیزہ نے پوچھا: تو دمشق گیا تھا؟

ہارون نے جواب دیا: نہیں، میں ابھی دمشق نہیں گیا، سیدھا تیرے پاس آیا ہوں، اب یہاں سے تمہارے کمرہ دمشق جاؤں گا!

منیزہ نے کہا: ہم دونوں میں دو سال کی مدت طے ہوئی تھی۔ تو نے کیا فیصلہ کیا؟

ہارون نے جواب دیا: میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہارے کمرہ دمشق چلا جاؤں!

منیزہ نے کہا: لیکن میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی جب تک کہ میں

اس پر یقین نہ کر لوں کہ اب میں بے اولاد نہیں رہوں گی!

ہارون نے عامر کی طرف دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا، بولا: منیزہ! کچھ تو لحاظ کر

اس موضوع پر کچھ بات ہو جائے گی۔ اب ہم دونوں کے درمیان سے میرا ہنوتی بھی نکل

گیا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے اب ضد نہیں کرنا چاہیئے!

منیزہ نے جواب دیا: یہ تو بار بار ہنوتی کا ذکر ہے۔ میں کیوں لے آتا ہے میں اس کو

نہیں جانتی، میرا مطالبہ اس سے صرف "تعلق نہیں رکھتا!"



منیزہ کا باپ جو خدا سی دیکھ کے لئے مل گیا تھا اور بارہ آگیا۔ ہارون نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "اس کو تمہیں اندر رکھو اور بیٹھے۔"

منیزہ کا باپ سالان اٹھانے لگا۔ ہارون کے آنے کی خبر سن کر سپاس پڑوس بھی ہو گئے۔ ان میں اس کا بہنوئی بھی تھا۔ ہارون کو دیکھتے ہی فخر و خوشی میں لپٹ پڑا۔ ہارون نے یہ گورکب آیا بہ خوب: "اس کے بعد عامر کی طرف مڑ گیا" اور: "کیسا ہے؟"

عامر نے بھی بھی مسکراہٹ میں جواب دیا: "اچھا ہوں۔"

منیزہ اٹھ کر جانے لگی تو ہارون نے پوچھا: "کہاں؟"

منیزہ نے جواب دیا: "میں ابھی آئے ہوں تم لوگ باتیں کرو۔"

ہارون نے بہنوئی سے باتیں کرنے لگا، کہا: "تم نے شادی کمری اور مری بھی نہ چلا۔"

بہنوئی نے جواب دیا: "ہاں، میں پوری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتا تھا اور اس شادی کی اطلاع دینا سہا تھا تو کہاں دیتا؟"

ہارون نے کہا: "یہ اچھا کیا۔"

بہنوئی ہنس دیا، کہا: "ہاں" اچھا ہی کیا کیونکہ جب تک میں شادی نہ کرے گی اور ہوتا۔ تلوار کی طرح تیرے سر پر تلکار ہوتا۔"

ہارون نے کھسیا کر جواب دیا: "ایسی بات نہیں تھی بھائی، لیکن میں کچھ شے میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا۔"

بہنوئی نے کہا: "بقیہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، بعد میں کر لوں گا، لیکن میں چند ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو منیزہ کی موجودگی میں شاید نہ کہ سکوں۔"

ہارون نے کہا: "ہاں ہاں، بھائی ضرور کرو، میں تیار ہوں۔"

بہنوئی نے پوچھا: "میرا خیال ہے کہ منیزہ کی دی ہوئی مسرت سے؟"

آگیا ہے؟

ہارون نے جواب دیا: "ہاں، تقریباً چھ ماہ قبل۔"

بہنوئی نے پوچھا: "کیا تو نے یہ فیصلہ کر لیا کہ منیزہ کی خواہش پوری کر دو؟"

ہارون نے جواب دیا: "بھائی! میں منیزہ کو نہیں چھوڑ سکتا اور عامر سے بھی نہیں بدواشت کر سکتا، اس لیے تم ہی کوئی مشورہ دو کہ میں کیا کروں؟"

ہندی نے کہا: "تو منیزہ کی خواہش پوری کر دے کیونکہ میں نے اس مردِ ران  
 طرح شہل کو یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ وہ مجھ چاہتی ہے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی"  
 ہارون نے پیشانی کو انگلیوں سے مہلایا، پوچھا: "بھائی! اگر میں منیزہ کی خواہش  
 مدد کر دوں تو زیادہ اپنے بچے کی موجودگی میں عامر کو نظر انداز نہیں کر دے گی؟"

ہندی نے ذہن پر دھڑساؤ کر دے کہ جواب دیا: "اگر یہ خطرہ نہ ہوتا تو تجھ  
 یہ مشدہ کبھی نہ دیتا کہ تو منیزہ سے کوئی بچہ نہ ہونے دے لیکن اب صدمتِ حال بدل  
 ہی ہے اور منیزہ بچے کی خواہش میں دیوانی ہو رہی ہے تو اب اسے زیادہ دلوں تک  
 میں بہلایا جاسکتا اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ تو اس کی خواہش پوری کر دے ورنہ  
 باعامر تو اس کو میرے پاس چھوڑ دے، میں اس کو خوش رکھوں گا اور کوئی کمی نہیں  
 سوچیں ہونے دوں گا۔"

ہارون نے کسی قدر یں دپیش سے کہا: "بھائی! پہلے مجھے عذر کر لینے دو، اس  
 بعد میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔"

ہارون نے اپنے ہندی کی سختی کو بھی دیکھا اور بظاہر ایک سیڑھی سا فکا عورت  
 لڑ آتی تھی۔

تین دن تک ہارون نے منیزہ سے مزید کوئی بات نہیں کی، اس کے اعزاز میں رعنائی  
 کافی تھی اور ہارون انہیں اڑانا رہا۔ ہندی نے عامر کی دلجوئی مندرجہ کردہ اور اس  
 اپنے پاس ہی رکھ لیا عامر بھی اپنے بچہ یا میں خلیص اور محبت محسوس کر رہا تھا۔ اس  
 منیزہ کو اپنی طرف سے کھینچا کھینچا محسوس کیا تو پھر منیزہ کے پاس جانے کی ضرورت ہی  
 میں محسوس کی۔

منیزہ نے چوتھے دن ہارون کو ایک بار پھر گھیر لیا اور پوچھا: "ہارون! میں مستقل  
 جینی محسوس کر رہی ہوں، تو نے ابھی تک مجھے نہیں بنایا کہ تو نے کیا فیصلہ کیا؟"  
 ہارون بہت خوش تھا، مسکراتا ہوا منیزہ کے سامنے کھڑا ہو گیا، بولا: "میں نے  
 فیصلہ کر لیا ہے کہ تجھ کو اپنے حاتمہ لے کر دمشق چلا جاؤں، اور حاتمہ اس واپس جانے کے  
 سو بے کوڑہن سے نکال دوں۔"

منیزہ نے جواب دیا: "لیکن میں دمشق اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک کہ  
 اولاد والی نہ ہو جاؤں۔"

ہارون نے کہا: "اگر میں تیریں خواہش پوری کر دوں تو تو یہ خاکہ عامر کا کیا

ہے گا وہ کہاں سے گا؟

مینرہ نے جواب دیا۔ "ہارون! یہ خدیشہ تو اپنے ذہن سے نکال دے کہ میں اپنے  
کی موجودگی میں عامر سے زیادتی کروں گی، میں نے عامر کو ہمیشہ اپنا ہی بٹھا سمجھا ہے  
ہمیشہ ہی بیٹھا سمجھتی رہی ہوں گی، سمجھ کر اس کی طرف سے فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"  
ہارون نے خوشی کا اظہار کیا، بولا۔ "اگر یہ بات ہے تو میرا فیصلہ بھی سن لے۔"  
میں یہاں آیا ہوں، اس وقت تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ میں نے تیرے ر  
وافقی بڑی زیادتی کی ہے اور اب اس کی تلافی چاہتا ہوں۔ عامر میرے ہی پاس رہے گا  
یاد رکھو کہ اگر اس کو کوئی شکایت ہوگی تو میں بھی بے مروتی اختیار کر لوں گا۔"  
یہ عبرت مینرہ کے باپ کو بھی مل گئی۔ اس نے خدیشہ کا بے پایاں اظہار کیا۔

اب ہارون کی اس گھر میں جو قدر در منزلت تھی، اس سے پہلے اس کو نصیب  
بھی نہ ہوا تھا۔ مینرہ کے قبضے اور شوخیاں پھر عود کر آئی تھیں۔ مینرہ کا باپ ہارون  
کی ناتو برادر لیوں میں لگا رہتا۔ ہارون کا بہنوئی بھی بے حد خوش تھا۔ ہاں اگر ان سب  
کوئی رنجیدہ تھا تو وہ عامر تھا۔ وہ معلوم نہیں کس سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مینرہ ہارون  
دکھانے کے لیے اگر کسی وقت عامر کی طرف پیادہ محبت سے منہ نہ جھکی ہوگی تو اس میں وہ  
شرمت اور گریہ نہ ہوگی جو پہلے سمجھی ہوا کرتی تھی۔ عامر اس کی ہر عیب کو سدھاتا تھا لیکن  
ہارون اس سے بے خبر تھا۔ ہارون کا بہنوئی بھی عامر کے خلاف کو محسوس کر رہا تھا۔ وہ  
کبھی کبھی دے لفظوں میں عامر کو سمجھانے لگتا۔ "بیٹے عامر! تیرا باپ تجھ سے چھٹی گیا  
تو ذرا بھی فکر نہ کر، میں جو موجود ہوں۔"

عامر کہتا۔ "لیکن پھر پاجاں! میری نن ماں مینرہ پہلے تو ایسی نہیں تھی، اب اب  
کہہ کیا ہو گیا ہے؟"

پھر پاجاں دیر۔ "ہاں پہلے وہ تجھی سے پیادہ کرتی تھی، مگر اب وہ اپنی عیب  
کا ذخیرہ اپنے بچے کے لیے محفوظ کر رہی ہے۔ اپنے اس بچے کے لیے جو منور عامر میں ہے  
آنے کے لیے بازو ہلا رہا ہے۔"

پھر پاجاں سمجھ میں عامر کی باتیں تو آ رہی تھیں مگر پھر پاجاں باتیں عامر کی  
میں بالکل نہیں آ رہی تھیں۔

کئی ماہ حص میں رہنے کے بعد ہارون اور منیرہ نے دمشق جانے کا منصوبہ کیا۔ اب منیرہ کے باپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہارون کو اب ایک ہی فکر تھی، وہ اس کا باپ منیرہ کو بارہ در دیکھ کر خوش نہیں ہوگا۔ اس نے کئی رائیں اس فکر اور تشریش گزار دیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے باپ کو جواب کیا دے گا؟

جب جانے کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو منیرہ نے ہارون کو مستورہ دیا۔ ہارون! سچ دن سے تجھ کو ملل اور فکر مند محسوس کر رہی ہوں، کیا میں بوجھ سکتی ہوں کہ یہ سب ہے؟

ہارون نے جواب دیا۔ ”منیرہ باب میں تجھ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاؤں گا میں سچ رہا ہوں کہ میرا باپ جب تجھ کو امید سے دیکھے گا تو تجھ پر ہر ہمت برہم ہوگا۔ میں چ رہا ہوں کہ میں اس کے جواز میں کیا کہوں گا؟“

منیرہ کا سنہ ٹٹک گیا۔ بولی۔ ”تیرے باپ کو یہ سوال کرنا ہی نہیں چاہیے۔“ ہارون نے کہا۔ ”میرے باپ کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے، یہ ان میں سمجھا سکتا ہے۔ میری دعت تو یہی سوچنا ہے کہ میرا باپ تجھ کو اس حال میں دیکھ راضی نہیں ہوگا۔“

منیرہ نے بھلا سا سنہ بنایا۔ ”تجھ کو اس حال میں دیکھ کر اگر وہ خوش نہیں ہوتا اور تجھ کو اس کی پردہ بھی نہیں، تو اس کا یہ مطلب بھی ہو کہ میں دمشق میں زیادہ نہیں رہ سکوں گی۔“

ہارون نے تسلی دی۔ ”بہر حال میں کسی نہ کسی طرح اس کو سمجھا لوں گا اور ایک بھی ہے کہ میرا باپ کہیں عامر کو اپنے پاس ہی نہ روک لے کیونکہ اس کو فخر ہے کہ وہ میرے گاہک اب عامر پر پوری توجہ نہیں دی جا رہی ہوگی۔ میں اپنے باپ کے سے یہ شبہ کس طرح نکالوں گا اور پھر یہ ارکان بھی موجود ہے کہ میرا باپ عامر کو اس ہی روک لے اور اس کو تیرے خلاف کرنا شروع کر دے۔ انہی فکروں نے بلکان اور پریشان کر رکھا ہے۔“

منیرہ نے چٹکی بجا دی۔ ”اس کا حل ہے میرے پاس؟“

”اس کا کیا حل ہے؟“

”اس کا حل یہ ہے کہ دمشق میں زیادہ قیام ہی نہ کیا جائے اور عامر کو حص لکھا جائے۔ تیرا ہنونی اس پر خصوصی توجہ دے رہا ہے۔“

ہارون نے اپنے ذہن پر زور ڈال کر دیا تو منیزہ کی یہ تجویز نہ ہمت اچھے  
 بولا۔ "لیکن اس میں ایک خیراتی بھی ہے۔"

لہٰذا کون سی خیراتی ہے میں بھی تو سنوں اس خیراتی کے بارے میں تفصیل  
 ہارون نے جواب دیا۔ "اس میں خیراتی یہ ہے کہ اگر عامر حمص میں رہا تو  
 ہفتے سے دل پر یہ اثر ہو گا کہ ہم دونوں نے اس کو نظر انداز کرنا شروع کر  
 اور وہیں سے اس میں احساس محرومی پیدا ہو جائے گا۔"

منیزہ نے کہا۔ "یعنی گھرائیوں میں مت جا ہارون۔ میرا کہنا مان اور  
 اپنے بہنوئی کے پاس اس چھوٹے علاقہ میں اخیال ہے تیرا بہنوئی حاکم کرنا خوش  
 گا کہ وہ ہم دونوں کو بھول جائے گا۔"

ہارون نے جواب دیا۔ "بہر حال اس پر خوب اچھی طرح غور کر  
 قدم اٹھانا ہو گا۔"

منیزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے یہ کب کہا تھا کہ جو بھی کرنا ہو تو  
 کر ڈالو۔"

ہارون نے عامر کو لے جانے یا نہ لے جانے پر خاصہ غور و فکر سے کہا۔  
 بالآخر اسی نتیجے پر پہنچی کہ عامر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی فائدہ نہیں، نہ  
 نقصان ہے۔ ان نے خاموشی سے منیزہ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دیا، بولا۔ "میں  
 میں تیرے ہی فیصلے پر عمل کروں گا۔ ہم دونوں دمشق چلیں گے عامر ہمیں ہم  
 پاس ہی رہے گا۔ اس طرح میرے باپ کو درغلانے پھسلانے کا موقع نہیں  
 وہ عامر کو روک بھی نہیں سکے گا۔"

منیزہ کا چہرہ خوشی سے تھماتے لگا، بولی۔ "میں ہمیشہ تمہیں کو دہی  
 گی جس سے تمہیں نقصان نہ پہنچے۔ میں تیری شریکِ حیات ہوں، بیوی، زندہ  
 ساتھ میں ہمیشہ تیرے لئے دہی چاہوں گی جو تمہیں اپنے لیے پسند کروں گی،  
 کہ تمہیں پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

ہارون نے منیزہ کو آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔ "انہوں نے کہ میں نے  
 سمجھنے میں بڑی غلطیاں کی ہیں لیکن اب یہ غلطیاں نہیں ہوں گی۔"

منیزہ نے ہارون کی گرم سانسوں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو وہ  
 بند کر لیں، بولی۔ "ہارون! کوئی انسان بھی غلطی نہ کرے اگر اس کو دوسرے

لمطیان کمنے پر مجبور نہ کر دیں۔ تو معصوم اور پاک باز انسان ہے جب کہ دوسرے  
کے اور عیار تھے۔ ان چالاکوں نے قہر کو درغلا کر مگر اسے دیا تھا اس لیے محمد کو  
یہ کوئی شکایت نہیں، مجھ کو ان لوگوں سے شکایت ہے جو دوسروں کے معاملات  
خواہ مخواہ دخل دے کر انہیں تباہی اور بربادی کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔  
میں کہ تیرا باپ بھی انہی میں سے ایک ہے۔“

ہارون شرار ہاتھ دہ کوئی جواب نہیں دے سکا اور شرار کہہ سکیں  
بر لیں۔

عامر نے ابھی تک یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اس کا باپ اور منیرہ لے چھوڑ کر مشق  
جائیں گے۔ پھوڑ پانے بڑی تسلیاں دیں لیکن عامر کا دکھ دور نہیں ہوا۔ دوسری طرف  
نہ بھی عامر کی کسی محسوس نہ رہا تھا مگر منیرہ نے تسلی دی اور سمجھا یا کہ عامر کو کبھی  
اتنا چھوڑ کر اس میں خود اعتمادی پیدا ہونے کا موقع نہ رہے۔ ہارون کو غم کے ساتھ  
خوف بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا باپ اس کی اس حرکت پر نہ خوب خوب لعن  
کہہ رہے گا۔

عامر کا یہ حال تھا کہ کئی دن تک اس کی ٹھوک پیاس اڑتی رہی۔ لیکن اس کا  
باپ ہر دل جوئی ہمت نہ رہا۔ عامر اب بار ٹھنڈی حالتیں بھر کے پوچھتا: ”یہ باد حیاں  
لپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے، مجھے یہاں کیوں چھوڑ گئے؟“  
پھوڑ پانے محبت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور جواب دیا: ”بیٹے عامر! اب تیرا  
ہے اپنے باپ کو تیرا وہ نہ یاد کرے۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا۔ تیرا باپ ایک اور  
فکر میں ہے۔“

ایک اور عامر کی فکر کا مطلب عامر کی سمجھ میں نہیں آیا اور اس سلسلے میں اس  
کی سوال بھی نہیں کیا۔ وہ نہ یادہ تر باتیں اپنے آپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا اسی  
وال کیے بغیر ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔

ہارون اور منیرہ کو عامر کے بغیر دیکھ کر یاد رکھ کے باپ کو حیرت بھی ہوتی اور  
جیسا کہ عامر کا ہی ایک لابیجی ان جانا خوف بھی محسوس ہوا، لیکن جب اس کو یہ  
اہوا کہ عامر خیریت سے ہے اور محض میں اپنے پھوڑا کے ساتھ نہ رہا ہے تو ہارون  
جسٹے میں رہ گیا اس نے ہارون کو مال و نہر اور سامان کے بغیر دیکھا تو اور زیادہ  
مان ہو گیا، پوچھا: ”کیا اس بار تو خانی ہاتھ آیا ہے؟“

ہارون نے جواب دیا: "نہیں با دادا جان میں خالی ہاتھ تو نہیں آیا۔ کچھ لایا تھا اسے حمص میں چھوڑ آیا۔"  
 "حمص میں چھوڑ آیا کیا مطلب؟ حمص ہن کس کے پاس چھوڑ آیا؟"  
 ہارون نے جواب دیا: "حمص میں منیرہ کے گھر کیونکہ میں خداسا سیدھا حمص گیا تھا۔"

باپ نے تلقی سے کہا: "لیکن حمص میں تیرا اپنا گھر تو نہیں ہے۔ یہ کسی دیکھ رہا ہوں میں سمجھ میں۔"

ہارون نے جواب دیا: "ہاں با دادا جان! مجھ میں کچھ نذر بلیاں بچ چکی ہیں۔ باپ نے سر سے پاؤں تک پیٹے کو بغور دیکھا: "عامر کو بھی اپنے ساء لایا۔ اپنا مال و نذر بھی حمص ہی میں چھوڑ آیا، تمہارے عجیب سی تبریلیاں دیکھ رہی ہیں۔"

ہارون نے جواب دیا: "ہاں با دادا جان! میں نے ڈیڑھ سال تک اپنے ساء غنہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ میں غلطی پر ہوں! مجھ کو اپنے مسائل کا حل خود چاہیے۔ مجھے اپنے معاملات کا خود ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔"  
 باپ نے بوکھلا کر پوچھا: "یعنی، یعنی کیا مطلب؟"

ہارون نے منیرہ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، دونوں ہی کے چہرے مسکراہٹ سے چوڑے ہوئے۔ پھر باپ سے کہا: "مطلب یہ کہ میں منیرہ کو ناخوش نہ کر سکتا۔ وہ جن کی عمر میں ختم ہو چکی ہیں اور عیس کی سرحد پر کھڑے ہیں ان لوگوں کے مشورہ کس طرح دیں گے جو لفظ ہر عیس کی سرحدوں سے دور ہیں۔ میں منیرہ سے محروم نہیں رہ سکتا۔"

باپ نے ہارون کی باتیں بڑے تحمل سے سنیں اور کسی قدر لا پرواہی سے دیا: "اپنے غلط فیصلوں کے نتائج بھی تو خود ہی سنبھالنے گئے۔ میں جانتا تھا کہ تو ایک دن بڑوں کے فیصلوں سے متخوف ہو جاتے گا۔"

ہارون نے کہا: "میں بڑوں کے فیصلے سے متخوف نہیں ہوں، بلکہ فیصلہ غلطی سے بچنے کی کوشش کی ہے۔"

باپ نے ان دونوں میں دیکھی ہی نہیں لی، انہیں ان کے حال اب ہارون اور منیرہ کا بیشتر وقت حالتِ ساجھ گندہ تھا۔ ان کی مح

ن ہو گئی تھیں۔ احتیاط اور ہدایات کی طاعتیں کھل گئی تھیں اور انہیں پہلی  
ت اور آزادی کے نقشے اور لذت کا صحیح علم ہوا تھا۔ وہ دونوں کچھ دن و مشق  
ہے اور پھر حمص چلے گئے۔ حمص میں بھی یہ دونوں آزادی سے ادھر ادھر گھومتے  
رہے۔ ہارون کے بہنوئی نے عامر کی ذمہ داریاں بڑی محنت اور محبت سے نبھائی  
جب عامر کو اپنے بہنوئی کے پاس خوش و خرم دیکھتا تو اس کی طمانیت اور سکون  
میں اضافہ ہو جاتا۔ دمشق میں ہارون کا باپ تنہا رہ رہا تھا۔ وہ اکثر ان حسین اور  
مل سے پھر پھر دونوں کو یاد کرتا رہتا تھا۔ اس گھر میں ہارون کی پہلی بیوی،  
ہارون کی بہن اور وہ سرے لوگ سرگرم عمل رہتے تھے۔ انہی میں منیرہ بھی  
آئی، لیکن منیرہ کی یاد سے وہ ملول ہو جاتا۔ ہارون نے اپنے باپ کو تقریباً نظر انداز  
تھا۔ منیرہ کو یہ سوچ سوچ کر خوشی ہوتی تھی کہ آخر کار اس نے اس بوڑھے  
لے لے لیا۔

ایک سال بعد منیرہ بھی ایک بچے کی ماں بن گئی۔ ہارون لڑکے کا نام عامر کے  
برعکس رکھنا چاہتا تھا لیکن منیرہ نے اس نام کو تاپسند کیا اور اس کا نام ابراہیم  
پا۔ یہ بیات عامر کو بھی معلوم ہوئی، تو اس کو دکھ پہنچا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں  
کہ منیرہ اس سے نفرت کیوں کرتی تھی۔ ابراہیم کی ولادت کی خبر جب ہارون  
کو پہنچی تو وہ رونے لگا اور ہارون کو خط لکھا کہ عامر کو اس کے پاس بھیج  
تے تاکہ اس کی تنہائی ختم ہو جائے، لیکن عامر کو اس کے پھوپھو پانے بھیجنے سے  
رجا۔

ہارون کو ایک بار پھر حمص چھوڑنا پڑا، لیکن اب اسے موصل کے آس پاس  
سے جنگ کرنا تھی۔ وہ غیر معینہ مدت کے لئے جریرہ اور اس کے مضافات  
میں دیا گیا۔ ہارون کے بہنوئی نے عارضی طور پر سپاہ گری چھوڑ دی اور حمص  
م کی طمانیت اختیار کر لی۔ وہ عامر پر بڑی توجہ دے رہا تھا۔ یہ عامر کی خوشنودی  
مستثنیٰ کی اس کا پھوپھا والدہ سے محروم تھا چنانچہ دونوں سیاں بیوی نے عامر  
ادلد کی طرح رکھا اور منیرہ کی عدم توجہی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔ مگر دونوں  
رج عامر کے دل میں جھانک سکتے اور انہیں کوئی ایسا وسیلہ حاصل ہوتا جس سے  
انہیں اسات معلوم کیے جاسکتے تو وہ عامر کے دل میں نفرت کا ایک ایسا شعلہ  
باد دیکھتے جو بڑھ کر بڑی سے بڑی شے کو جلا سکتا تھا۔



ہارون اپنی بیوی کو خطوں میں یہی لکھنا دیتا تھا کہ اب ابراہیم کی موجودہ  
 منیہ پر یہ فرض عام ہو گیا ہے کہ عامر کا بھی اتنا ہی خیال رکھے جتنا وہ ابراہیم  
 ہو گا۔ وہ ابراہیم کے لیے جو کچھ بھی دہی عامر کے لیے بھی بھیجتا لیکن منیہ  
 بھی نہ لیتی اور عامر کو اس کی ہر انگ نہ دیتی۔ وہ عامر کے ذکر پر یہی  
 لگتی کہ یہی وہ ذات ہے جس کی درجہ سے کئی سال تک اس کو اپنی اولاد سے  
 رکھا گیا۔ اس کا یہ اندازہ کر اس کے دل میں عامر کے خلاف نفرتیں بڑھاتا جا رہا  
 اب جب کہ اس نے یہ دیکھا کہ ہارون ابراہیم کا تنہا نہ کر بھی بھی نہیں کرتا، اس  
 عامر کا ذکر ضرور کرتا ہے، اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ  
 اب حصص میں نہیں رہنا چاہیے۔ کیونکہ عامر جب تک حصص میں رہے گا، ہارون  
 کے لیے ابراہیم پر خاص ترجیح نہیں دے سکے گا۔ لیکن اب مشکل یہ تھی کہ عامر  
 ساتھ نہیں دیتا تھا، ہارون کے ہمنوی کے پاس وہ رہا تھا اور ہارون کے ہمنو  
 سکونت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

دوسری طرف ہارون کا ہمنوی منیہ کے حسد کو بڑی ہی طرح محسوس  
 منیہ عامر سے جتنا زیادہ حسد کرتی، ہارون کا ہمنوی اس کا قدر و ارزش ہوتا اور  
 فرائض اور عنایوں کی بارش کم دیتا۔ وہ منیہ کو اس طرح جلا جلا کر ایک  
 لذت حاصل کر دیتا تھا۔

ایک دن جب وہ حصص کے حاکم کے پاس سے اٹھا تو گھر میں داخلے  
 اس کی ایک اجنبی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ شخص سامان کی پریشانی منیہ کے  
 بہتہ پرچھو ہاتھ۔ منیہ کا باپ اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ اس نے اس شخص  
 احترام سے اپنے گھر میں بٹھایا اور اپنا تعارف کرایا۔ "میں ہارون کا ہمنوی ہوں،  
 کا کوئی پیغام تیرے پاس ہے تو مجھے دے دے۔"

اس شخص نے تپاک سے ہاتھ ملایا اور پریشانی اس کے حوالے کر دی  
 ہارون نے سمجھو اتی ہے اس میں ایک خط بھی ہے اور کچھ رقم بھی، اس کے  
 کپڑے بھی ہیں۔"

اس نے پریشانی اور ہارون کا خط پڑھنے لگا۔ اس میں منیہ  
 کیا تھا۔

"صبح کی شفق کی طرح گلنا اور مشرقی افق پر سے طلوع ہونے وا

حسین منیرہ! میں غمگین واپس آ رہا ہوں لیکن ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی لگا ہے کہ کہیں کوئی خارہی میرا کام تمام نہ کر دے کیونکہ مردوں پہلے میں ایک خارہی میں آ گیا تھا۔ ہم تین ہزار سپاہی خارہیوں کی تلاش میں ادھر ادھر مارے مارے تھے کہ رات کو خارہیوں نے ہم پر شب خون مار دیا۔ ان کے اچانک اور خوفناک حملے میں اتنا بے حس و حال ہو گیا تھا کہ ہم میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں رہی، آپس میں بے بسی سے قتل کرتے رہے، ہمارے غیموں کی طنائیں کاٹ کر انہیں آگ لگا دی اور ہمارے گھوڑوں پر قبضہ کر لیا۔ میں نے ذرا سی دیر میں اپنے پیادوں طرف بے قرارے چھوٹتے دیکھے، ان غیموں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی جس نے بھی ہتھیار سنبھالا، اسار جیوں کے ہاتھیں مارا گیا۔ اس ہنگامہ دار و گیر نلوم نہیں کس طرح میں نے یہ تدبیر کی کہ قتل ہونے والوں میں مردوں کی طرح کیا۔ ساتھ جیوں نے ہم پر غیب خون کے قرارے چھوٹتے دیکھے، ان غیموں کی چیخ و پکار نے قیامت صغریٰ برپا کر رکھی تھی۔ اپنا پاؤں میرے منہ پر نہ رکھ دیا اور ہوا لنگ گیا۔ میں دم مار رہے افیت کی پرواہ کیے بغیر مرنے کی طرح پڑا رہا۔ اپنے جگہ سے حرکت نہ کر سکا جب تک کہ مجھ کو یہ یقین نہیں ہو گیا کہ سارے اہل چکے ہیں، اور اب وہ واپس نہیں آتے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پانا چھپتا چھپتا اصل پہنچا اور خارہیوں کے خوفناک شب خون کی حکومت برپا کر دی۔

منیرہ! مجھے حیرت ہے کہ میں زندہ کس طرح بچ گیا؟ شاید تیری، عامر براہیم کی وجہ سے۔ کیونکہ ان تینوں کو میری ضرورت ہے۔ حکومت نے مجھے انعام سے نوازا دیا ہے کیونکہ میں نے حکومت کو یہی تائید دیا ہے کہ میں نے خارہیوں کا ہر دست مقابلہ کیا اور ان کے خطرناک حملے سے ہر دست نہ بچنے لگنے میں کامیاب رہا۔

منیرہ! تو دعا کرتی رہ کہ میں خارہیوں سے محفوظ رہوں ورنہ یہ وہ بھری بوجھ جن کے چند افراد میں گھڑوں بلکہ ہزاروں کوشکست دے دیئے ہیں۔ بڑے غریبہ کاروں کا یہ قول ہے کہ ان جیسے بہادر روتے زمین پر نہیں اترتے پہلے تھے۔

مجھ کو تیری، ابراہیم اور عامر کی یاد آتی رہتی ہے۔ میں چند ہفتے ہی ٹھہرے

بھج رہا ہوں، ان میں کے دو نیلے پائے عامر کے لیے ہیں کیونکہ عامر کو نیلا رنگ پسند ہے۔ بقیہ تو اپنے اور ابراہیم کے لئے رکھ لے۔

میں نے اس سے پہلے جو سلیپر میں روانہ کی تھیں، وہ پسند آتی یا نہ کرانی سلیپر کیسی لگی؟

منیزہ! میں تجھ کو خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو عامر کا خاص ابراہیم کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ وہ قبر ایشاہ کے لیے سمجھا جائے تو اس کا خیال بہر حال نہ رکھے گی مگر عامر کے لیے اس لیے لکھ رہا ہوں چند سالوں سے ہماری توجہ سے محروم ہے، میرے ہمنوی نے اس کی ذمہ داریاں سمجھ کے ہم دونوں کو کسی حد تک بے نیاز کر دیا ہے مگر میں اس بے نیازی کو ناپا ہوں۔ میں نے تیری خواہش پوری کر دی اور ابراہیم سے تیری گور بھری، اب میری خواہش پوری کر اور عامر پر وہی نوازہ نہیں بے سادہ سے جو کبھی دمشق پر کرتی تھی۔

میرے خوالوں اور خیالوں کی پٹا اسرارہ ساحرہ! کیا تو جانتی ہے کہ دمشق باپ بیماری جھیل رہا ہے، اندر اس کے اس وقت میں اس کے پاس نہیں، لیکن اسی میں تجھے لے کر دمشق چلا جاؤں گا، اگر تو اپنے باپ کے ذریعے میرے ہیامہ با خبر گیری کر سکے تو ضرور کہہ میں تیرا عمر بھر احسان مند رہوں گا۔

ہارون کے ہمنوی نے اس شخص کو یہ خصیت کر دیا پھر خط اور سالانہ کو منیزہ کو بھیجا دی۔ اس نے منیزہ پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ اس نے ہارون کا لیا ہے۔ منیزہ خط کو لے کر کمرے میں چل گئی اور کچھ دیر بعد جب باہر نکلی تو اس اترا ہوا تھا، ہمنوی نے پوچھا: "کیا کوئی مخاص بات ہو گئی؟"

منیزہ نے جواب دیا: "ہاں ہارون بہت جلد رکنے والا ہے۔ وہ خارجہ ہاتھوں قتل ہوتے ہوئے بچے گیا۔"

اس نے پوچھا: "اور کچھ؟"

منیزہ نے جواب دیا: "اور یہ کہ ہارون کا باپ دمشق میں لڑیاں لڑ رہا ہے تو عامر کو ساتھ لے کر لڑا، دمشق چلا جا، کیونکہ یہ میری نہیں ہارون کی خواہش ہے۔ منیزہ کے جھوٹ پر حیران رہ گیا، پوچھا: "اور کچھ؟"

منیزہ نے جل کر جواب دیا: "اور کچھ نہیں، کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

وہ جبری درمیر تک مینزہ کے پاس ہی بیٹھا تھا کہ شاید درمیشمی پارچے عامر  
لے کر دیتے جانتی لیکن مینزہ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ عامر بھی یہ خبر سن  
با کہ کچھ گیا کہ اس کے باپ کا خط آیا ہوا ہے، لیکن مینزہ نے اس کی موجودگی  
نظر انداز کر دیا اور کنگھیوں تک سے درمیکھنا گوارا نہ کیا۔ اس نے عامر کو  
کے لیے ابراہیم کو گود میں اٹھا لیا اور اس کو بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہوتی ہوئی  
ماتیسے باپ نے تھک کر پیار رکھا ہے اور ہدایت کی ہے کہ میں سنجہ کو خوب بھینچ  
رہتا ہے باپ کی طرف سے پیار کروں۔“

بہنوں نے عامر کی طرف دیکھا جو کھڑیا کھڑیا، گم صدمہ یہ منظر دیکھ کر دل  
میں درد سا اٹھا۔ بہنوں نے پوچھا: "کیا ہارون نے عامر کے لیے کچھ بھی  
بھاء"

میزہ نے چونکہ کمرہ باریک دوزوں کی طرف دیکھا اور ہمارے پھوپھو پاکو  
 دیا " نہیں، عامر کے لیے کچھ بھی نہیں لکھا اور پھر ابراہیم سے عامر کا کیا تقابل  
 غنت کی طرف بڑھ رہا ہے اور ابراہیم ابھی ماں کا دودھ پی رہا ہے چنانچہ  
 رخسار جس محبت اور توجہ کا مستحق ہے عامر تو اس توجہ اور محبت کا مستحق  
 نہ سکتا۔"

جہنم کی آگ نے خواب دیا: "میزب: اتیرا اندازہ فکر درست نہیں، ایک باپ کی نظر دھڑے بھڑے بچے میں کتنی فرق تم میں ہوتا، میں خوب جانتا ہوں کہ ہانڈن عام بڑی محبت کرتا ہے اور اگر اس نے اپنے خط میں عام کی بات کچھ نہیں لکھا تو ہے"

منبرہ نے ہر مان کر رکھا۔ "میں تجھ سے ایک بات کچھ عرصے پہلے کہہ چکا ہوں۔ لیکن اب کہہ دوں گی۔"

ہمنو نے جواب دیا: "تو ضرور کہہ ڈال کیونکہ جب دیون میں کدورت پیدا ہو  
سناقت سے بچنا چاہیے۔"

مینرہ نے پوچھا کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تو اس گھر میں کیوں رہ

اس نے جواب دیا: "میں اس لیے رہ رہا ہوں کہ گونے اور تیرے باپ نے مجھ کو کھانا کھا ہے۔"

منیزہ نے کہا: ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تو اس طرح سوچ رہا ہے تو سوچ رہا ہے اب تجھ کو یہاں سے چلا جانا چاہیے۔“  
اس نے جواب دیا: ”میں تیرے کہنے سے تو ہرگز نہیں جاؤں گا، مجھ کو غصے سے شبہ تھا کہ ایک نہ ایک دن تو مجھ سے اس قسم کی باتیں ضرور کہے لیتے ہیں۔ میں نے عامر کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اب جب تک عامر میرے ساتھ ہے میں یہ نہیں عاقلں گا۔“

منیزہ نے کہا: ”عامر کو میں اپنے پاس رکھ لوں گا تو یہاں سے چلا جاؤ۔“  
بہنوئی نے عامر کے سر پر ہاتھ رکھ دیا: ”اس کو تو اپنے پاس رکھ لے گی کہ تو رکھے گی؟ خوب! کیا تجھ کو عامر کا کوئی خیال ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں، اور بھی عامر کو تیرے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔“  
منیزہ نے جواب دیا: ”اس کا فیصلہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ اردن آنے کی دیر ہے، پھر میں عامر کو جبراً اپنے پاس رکھ لوں گی۔“  
بہنوئی نے کہہ کر کہا: ”ہاں صرف اس صورت میں کہ خود عامر بھی تیرے رہنے پر آمادہ ہو جائے۔“

منیزہ نے تن کر کہا: ”میں عامر کو تجھ سے زیادہ محبت دے سکتی ہوں۔“  
نیا دہ اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔“  
بہنوئی ہنس دیا اور لایا: ”بیشک، بیشک، مجھ کو یقین ہے جو عورت ع ملیہ میں غائب کردے اور نشیمی پارچے اٹا دے وہ واقعی بڑی محبت سے کر سکتی ہے۔“

منیزہ دنگ رہ گئی، کٹ سی گئی، گرم ہو کر بولی: ”بد اخلاق انسان! وہ مطلب ہوا کہ تو میرے خطوط بڑھ لیتا ہے۔ مجھ کو تو اس کا پہلے ہی شبہ تھا اور یہ سیلپہ اور ریٹھی پارچوں کو دبا کر بیٹھ گئی تھی اور یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ تو خطوط بڑھتا ہے یا نہیں، چنانچہ آج اس کا انکشاف ہو گیا، بھانڈا پھوٹ گیا۔“  
بہنوئی نے کہا: ”اب فضول باتیں نہ کہو جب تیری چوری پکڑی گئی تو اس کی میٹھی میٹھی باتیں کر لے لگی۔“

منیزہ نے عامر سے پوچھا: ”عامر! سچ بتا تو کس کے پاس رہنا گوارا گا، میرے پاس یا اپنے پھوپھ کے پاس؟“

عامر نے بغیر کسی پس و پیش کے جواب دیا: ”پھوپا کے پاس!“  
 منیزہ نے غصے میں جھنجھلا کر پوچھا: ”یعنی میرے پاس نہیں؟“  
 عامر نے جواب دیا: ”ہاں آپ کے پاس نہیں۔“  
 منیزہ غصے میں کھڑی ہو گئی بولی: ”کوئی بھی میرا نہیں، میں کتنی احمق تھی  
 ابک تجھ کو اپنا بیٹا سمجھتی رہی۔“  
 عامر نے جواب دیا: ”آپ نے کبھی اپنا سمجھا ہر مجھے تو وہ مجھے یاد نہیں لیکن  
 نا اچھی طرح یاد ہیں اور زندگی بھر یاد رہے گی کہ آپ نے مجھ سے حسد کرنا  
 نہ کر دیا ہے اور مجھ میں ایک قسم کا احساس محرومی پیدا کر دیا ہے۔“  
 پھوپا کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی اور وہ سارا دن گن رہا کہ کب گھر آوے گا  
 میں اس کو ہر چیز اچھی نظر آتی۔ منیزہ کو یہ کوفت کھاتے جا رہی تھی کہ اگر عامر نہ  
 تو ہارون کا سب کچھ منیزہ اور ابراہیم کو ملتا لیکن اب یہ ناممکن تھا۔  
 منیزہ غصے میں اٹھ کر دروازے کے پاس چلی گئی اور ہارون کا ہنسنے  
 اور دونوں اپنے گھر چلے آتے۔

\*

\*

\*

ہنسنے اور خود یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ عامر کے ساتھ دمشق چلا جائے گا اور  
 ہارون کے والد کی خاداری میں مشغول ہو جائے گا۔  
 اس کے اس منصوبے سے شہر شخص لا علم ہی رہتا لیکن ہنسنے نے زیادہ گہرا نہیں  
 دیکھے اس نے ایک ایک کو اس کا راستہ دیکھ کر بتانا شروع کر دیا اس  
 کو دادا کی بیماری کی خبر دی اور کہا کہ ہم دونوں بلکہ میری بیوی کو بھی چند  
 کے لیے دمشق چلا جانا ہے تاکہ تیرے بیمار دادا کی شاندار تیمارداری کی جاسکے۔  
 چکے چکے عامر کو منیزہ کی وہ ساری باتیں بتا دیں جو اس نے ہارون کے خط میں  
 لکھی تھیں۔ اس نے عامر سے کہا: ”عامر! تجھ کو منیزہ اور اس کے پاس سے جو مال و نقد  
 کل مالوسا ہر جانا چاہیے کیونکہ اس سہریلے عورت کے پاس سے کچھ نکلنا ناہیا  
 ہے۔“

لیکن عامر اپنے باپ کی طرف سے بہت فکر مند تھا، اس نے پوچھا: ”پھوپا  
 یہ خارجی کون ہیں؟“

پھوپھو پانے ہنس کر پوچھا۔ "یہ کیا ایک تجھ کو خوار جیوں کا کیا خیال آگیا؟" عامر نے جواب دیا۔ "مجھ کو ان کا یوں خیال آگیا کہ امہو نے میرے کو مار تے مار تے چھوڑ دیا اور میرے باپ نے آپ کے بقول ان کی بہادری کی تعریف کی ہے۔"

پھوپھو یا معلوم نہیں کیا سوچ کر ایک دم اچھل سا پڑا، بولا۔ "بیٹے عامر خانہ جیوں کی مہارت بس تو یہ سمجھ لے کہ یہ ایماندار اور بہادر لوگ ہیں، اس رد نہیں پر اپنا ثانی نہیں رکھتے۔"

عامر نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا یہ لوگ اچھے ہوتے ہیں؟ آپ نوان کی تعریف کر رہے ہیں؟"

پھوپھو پانے جواب دیا۔ "ہاں میں ان کی تعریف کر رہا ہوں اور اس لیے کہ وہ تعریف سے مستحق ہیں۔ تیرے باپ نے بھی اپنے خط میں ان کی تعریفیں کی ہیں۔"

عامر نے پوچھا۔ "اگر وہ اتنے ہیں اچھے ہیں تو حکومت ان سے جنگ کیوں کر ہے؟" عامر نے ان کے خلاف ہتھیار کیوں اٹھاتا ہے؟" پھوپھو پانے جواب دیا۔ "ان میں کچھ برائیاں بھی ہیں، بس ان برائیوں کے جنگ کی جاتی ہے۔"

عامر نے کسی قدر تذبذب سے کہا۔ "برائیاں کہاں نہیں ہیں، کس میں ہیں؟" پھر جنگ سب سے کیوں نہیں لڑی جاتی؟"

پھوپھو پانے قانعانہ شان سے کہا۔ "نوان باتوں پر مت سوز کر، عشق چہ تیاری کر، ہم دونوں عشق چل کر تیرے دادا کی تیمارداری کریں گے، اگر ہم نے کیا تو میزہ پہنچ جائے گی اور تیرے دادا کے سارے مال و زر پر قبضہ جملے گا لیکن عامر کو مال و زر سے دلچسپی نہیں تھی، بولا۔ "میں و عشق اس لیے سکتا ہوں کہ وہاں میرا دادا ایسا ہے اس کی تیمارداری کر لوں گا لیکن مال و زر کی ہوا کو ہرگز نہیں سادوں گا۔"

پھوپھو پانے کہا۔ "کسی طرح چل تو سہی۔ مال و زر کی ہوس نہ کر، مگر اس مال کو غلط شخص کے پاس بھی مت جانے دے۔"

پھوپھو پانے اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے لیا۔ جب یہ تینوں بالکل تیار ہوئے۔

منیزہ کو مطلع کر دیا، بولا: "منیزہ! تو خوش ہو جا کہ میں قری رضی پوری کی ہے ہوں۔"

منیزہ نے پوچھا: "میری رضی؟ کون سی رضی پوری کر رہا ہے؟" اس نے جواب دیا: "منیزہ! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب یہاں نہ رہوں، جامدہ ہوں۔۔۔۔۔"

منیزہ نے بات کاٹ کر پوچھا: "اور عامر؟ یہ عامر کہاں رہے گا؟ کس کے گاہ؟"

اس نے جواب دیا: "افسوس کہ عامر تیرے پاس نہیں رہنا چاہتا، وہ بھی اٹھ ہی جاتے گا۔"

منیزہ نے کہا: "تم دونوں نے یہ مہمت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ تم لوگ چلو چند رہیں بھی پہنچ رہی ہوں۔"

چنانچہ دودن بعد یہ لوگ دمشق روانہ ہو گئے۔ عامر کو منیزہ سے حلالی کا لالہ تھا بلکہ وہ خوش تھا۔ کئی دن بعد یہ تینوں خوشگوار موسم میں دمشق پہنچے۔ لودھی اور ہلکی ہلکی بونہا یاد رہی ہو رہی تھی۔ پھر کیف ہوا تو جسم میں شور و غلا رہی تھیں۔ شہر کے لوگوں نے ان تینوں کو ذرا غور سے دیکھ کر یہ اندازہ برپا کیا کہ یہ کسی مقصد سے دمشق آئے ہیں۔ یہ تینوں پھر بیچ رہتے ہوئے اس مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے جہاں عامر کا دادا اکیلا سا انیس لے رہا تھا۔ یہ تینوں اندر داخل ہو کر قریب المارگ بوڑھے کے چند پردیوں کے بیچھے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے پوچھا: "تم لوگ کون ہو سے آئے ہو؟"

ہاسون کے ہنسنے نے جواب دیا: "میں اس بوڑھے کا داماد ہوں۔" پھر عامر کی رہ کیا: "اور یہ لڑکا اس بوڑھے کا پوتہ ہے۔"

پھر وہی ادھر ادھر کھسکے نکلے۔ عامر اپنے دادا پر جھپک گیا اور بڑی محبت سے کہا: "میں عامر آ گیا، اب آپ کیسے ہیں؟"

دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا اور شاید وہی ان نہ سکا۔ دوسرے ان کے دونوں شانے پکڑ لیے اور خود بھی ان کے سینے اور ہر جہرے باور بولا: "دادا جان! مجھے آپ نے بلایا تھا، میں عامر آپ کا پوتا ہوں۔"



دادا نے بمشکل کہا: "ہارون؟ کیا تو ہارون ہے؟"  
 عامر نے جواب دیا: "نہیں، میں ہارون نہیں، میں ہارون کا بیٹا عامر  
 دادا کی حافی ہوتی سانس واپس آگئی۔ ایک بار پھر آنکھیں کھلا پھا  
 ان نینوں کی طرف دیکھا اور ہنسنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بوجھایا: "تو تو ہے  
 تو مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑا ہے؟"

عامر نے ایک بار پھر دادا کو سمجھانے کی کوشش کی: "دادا جان! یہ بھڑ  
 ہیں، میرا باپ اور آپ کا بیٹا ہارون آنے ہی والا ہے، آپ فکر نہ کریں!"  
 دادا کو دنا آگیا: "مجھ کو سب نے چھوڑ دیا۔ عامر میرے سینے سے  
 جاتا کہ میں برسوں کے تنہا اور اس دل کو سکون پہنچا لوں۔ مجھے سب نے بھڑ  
 چھوڑ دیا، تنہا چھوڑ دیا!"

عامر دادا کے سینے سے لگ گیا۔ عامر کے بوجھنے دادا کی سانس میں ف  
 پیدا کر دیا جس سے وہ کھانسنے لگا۔ عامر سینے سے الگ ہو گیا اور ادب سے اس  
 پاؤں دلائے لگا۔

دادا کو کسی کسی لمحہ ہوش آجاتا لیکن یہ ہوش بھی مدہوشی سے کم ہ  
 مال دند کا اس دنیا میں جو مقام ہے بوڑھا شخص مدہوشی میں بھی اسی کی ف  
 قیمت کا بالکل صحیح شعور رکھتا تھا۔ دادا کی سانسوں کو بار اکھڑا کھڑا پیر  
 اور ہر بار بھی شبہ نہ کہ آئندہ چند لمحے موت اور زندگی کے لیے فیصلہ کن  
 ہوں گے لیکن بڑے میاں نے تو باتوں تک سے توانائی ظاہر کرنے کی کوشش  
 اور اسی کوشش میں مشغول تھے کہ ان کی نامزدی طبع کا خاص اثر نہ لیا جا  
 وہ عنقریب ادھر ادھر ہوتے دالے تھے۔

✽

✽

✽

شام سے ذرا پہلے دادا کی حالت پھر بگڑ گئی اور ہکی ہکی باتیں کو  
 عامر نے کہا: "دادا جان! ہوش میں آئیے، ہریشان است ہوئیے!"  
 لیکن دادا کی آنکھیں پھٹ چکی تھیں، انہوں نے نہ تو کسی کی بات  
 اور نہ ہی کوئی اور ان کی باتیں سمجھ سکا۔ عامر اس کا پھر بار بوڑھے کے پا  
 اس کے انجام کے منتظر تھے۔ بوڑھا مدہوشی میں بار بار ہارون کا نام لے رہا تھا

سہا تھا کہ ”ہارون! تو نے عامر پر ظلم کیا ہے، نریادتی کی ہے۔“  
 عامر کے دل پر آکر چل رہے تھے۔ دادا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے خلا  
 را اور مرحوم بیٹی کو آواز میں دیتے ہوئے دُوبتے چلے گئے۔ عامر نے آواز  
 اُجاں! ہوش میں آئے۔“

انہوں نے بے رونق اور نہ پہچان سکے دانی نظر دل سے عامر کو دیکھ کر  
 تو کہن ہے؟ یہاں کیوں آیا ہے؟“  
 عامر نے جواب دیا۔ ”دادا جان! میں ہوں عامر آپ کا پوتا۔ مجھے پہچاننے  
 کی کج ہے۔“

لیکن دادا نہیں پہچان سکا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس نے  
 عالم میں کہا۔ ”بہرے پاس جو کچھ ہے، حاکم ہے، عامر کو بلاؤ تاکہ میں  
 ان کے حوالے کر دوں گا۔“

دادا نے سرسبز آواز دی۔ ”جناب! یہ عامر آپ کے پاس ہی موجود ہے،  
 نہ۔“

لیکن دادا پہچانے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ عامر دادا کے پاستنی پادلا پر  
 انہیں کسی بُرے سے دیتے اور اپنے پھوپھا کے ساتھ آخری رسوم کی ادائیگی  
 کرنے لگا، لیکن تدریس سے پہلے ہی ہارون اور منیرہ بھی پہنچ گئے،  
 ہاکی میت پر خوب خوب رویا لیکن منیرہ نے سکھ کی سانس لی کہ اس کی  
 سے بڑا پتھر ہمیشہ کے لیے ہٹ چکا تھا۔

نام رسم سے ناراض ہونے کے بعد ہارون نے فیصلہ کیا کہ اب وہ دمشق  
 سہے گا اور سامان اور مال و قدر کو قابو میں لے کر اور مکان کو بیچ کر ہیستہ  
 ن چلا جائے گا لیکن ہارون نے اس کی مخالفت کی اور کہا: ”ہارون! یہ مکان  
 ہا اور اس گھر میں جو کچھ بھی ہے، تیرے باپ کی آخری وصیت اور خواہش  
 عامر کا ہے۔“

ہارون اپنے ہمنوع کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ منیرہ بھی اس کے پاس  
 ن دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ہارون نے پوچھا۔ ”آخر اس کا مطلب  
 پ کی آخری وصیت اور خواہش کے مطابق یہاں جو کچھ بھی ہے عامر کا  
 مطلب ہے؟“

بہنوی نے جواب دیا۔ "میں نے مرنے سے چند لمحے پہلے خود سنا ہے کہ  
مرحوم نے اپنے مال و زر اور مکان کا مالک عامر کو قرار دیا ہے اس لیے اب یہاں کی  
شے عامر کی ہے۔"

مینزہ نے کہا۔ "جب تک ہم میں ہارون موجود ہے ہارون کے مرحوم باپ  
کی چیزوں کا کوئی بھی وارث نہیں ہو سکتا اور پھر عامر کے ساتھ ہی ابلاہم سیم  
تو مرحوم کا پوتا ہے۔"  
لیکن ہارون نے مینزہ کو سمجھایا۔ "مینزہ! تجھ کو نہیں سمجھنا چاہیے، یہ  
خود روایت کر لوں گا۔"

بہنوی نے ہارون کو الگ لے جا کر سمجھایا۔ "ہارون! تو اس معاملے میں  
غاموشی اختیار کر، جیسا میں کہتا ہوں اس کو اسی طرح کہتے ہیں کہ آئندہ اغلا  
کی خلیج وسیع تر ہو جائے گی مگر چٹے گی نہیں، اس لیے عامر کو جو سچ مل رہا ہے اس  
کے پاس ہی رہنے دے۔"

لیکن ہارون نے اس کی بات نہیں مانی۔ "بھائی! ایسی باتیں نہ کہو۔ عامر  
میٹا ہے، جب تک میں زندہ ہوں، تمام چیزیں میرے قبضہ میں رہیں گی اور عامر کو  
ان پر پہل تو صرف ہے گا جس طرح مجھ کو حاصل ہے۔"  
بہنوی نے افسوسناک لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا تو عامر کو ان چیزوں اور  
مکان سے محروم کر دے گا؟"

ہارون نے جواب دیا۔ "میں مکان بچ دوں گا اور سارا مال و زر لے کر محرم  
چلا جاؤں گا۔ عامر اگر تیرے پاس رہا تو خیر، ورنہ میں اسے بھی اپنے ہی پاس رکھوں گا۔  
بہنوی نے سکوت اختیار کر لیا۔ عامر کے دل میں نظریں جمے ہوئے تھیں۔  
کے خلاف باپ کے خلاف اور دنیا کے خلاف۔

چند دنوں بعد مکان بھی یک گیا اور سارا سامان سمیٹ کر ہارون محرم  
ہو گیا۔ ساتھ میں عامر اور اس کا بھوپا بھی تھا۔ مینزہ بہت خوش تھی، اب اس کی  
ہی جیت تھی۔ محرم میں داخل ہوتے ہی مینزہ نے ہارون کو سمجھایا۔ "ہارون! اگر تو  
چاہتا ہے کہ یہ مختصر سا کتبہ خوش و خرم اور نہال رہے تو تو اپنے بہنوی کو یہاں  
چلتا کر دے۔"

ہارون نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

و نے پوچھا: "تیری بہن مر چکی ہے، اس کی کوئی اولاد بھی نہیں اب تیرا  
رشتہ ہی کہاں رہا۔"  
و نے جواب دیا: "منیزہ! بات اور حالات سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ میرا  
دور ہمیشہ جب تک زندہ ہے میرا بہنوئی کہے گا۔ اس نے میرے عامر کو  
رکھا ہے۔"  
و نے کہا: "تو اس کو یہاں سے چلنا کر دے، عامر کو میں اپنے پاس رکھوں گی  
میں بتاتے ہیں امداد میں زیادہ باتیں نہیں سنوں گی۔"  
و نے جواب دیا: "لیکن میں بہنوئی سے اس قسم کی باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ  
پاس ہی رہے گا اور میں عامر کو بھی اس سے نہیں لے سکتا۔"  
و کا جواب ہو کر غاموش ہو گئی، لیکن اس کے تپوہ بتاتے تھے کہ وہ  
بڑی۔

۴  
۵  
۶  
۷  
۸  
۹  
۱۰  
۱۱  
۱۲  
۱۳  
۱۴  
۱۵  
۱۶  
۱۷  
۱۸  
۱۹  
۲۰  
۲۱  
۲۲  
۲۳  
۲۴  
۲۵  
۲۶  
۲۷  
۲۸  
۲۹  
۳۰  
۳۱  
۳۲  
۳۳  
۳۴  
۳۵  
۳۶  
۳۷  
۳۸  
۳۹  
۴۰  
۴۱  
۴۲  
۴۳  
۴۴  
۴۵  
۴۶  
۴۷  
۴۸  
۴۹  
۵۰  
۵۱  
۵۲  
۵۳  
۵۴  
۵۵  
۵۶  
۵۷  
۵۸  
۵۹  
۶۰  
۶۱  
۶۲  
۶۳  
۶۴  
۶۵  
۶۶  
۶۷  
۶۸  
۶۹  
۷۰  
۷۱  
۷۲  
۷۳  
۷۴  
۷۵  
۷۶  
۷۷  
۷۸  
۷۹  
۸۰  
۸۱  
۸۲  
۸۳  
۸۴  
۸۵  
۸۶  
۸۷  
۸۸  
۸۹  
۹۰  
۹۱  
۹۲  
۹۳  
۹۴  
۹۵  
۹۶  
۹۷  
۹۸  
۹۹  
۱۰۰  
۱۰۱  
۱۰۲  
۱۰۳  
۱۰۴  
۱۰۵  
۱۰۶  
۱۰۷  
۱۰۸  
۱۰۹  
۱۱۰  
۱۱۱  
۱۱۲  
۱۱۳  
۱۱۴  
۱۱۵  
۱۱۶  
۱۱۷  
۱۱۸  
۱۱۹  
۱۲۰  
۱۲۱  
۱۲۲  
۱۲۳  
۱۲۴  
۱۲۵  
۱۲۶  
۱۲۷  
۱۲۸  
۱۲۹  
۱۳۰  
۱۳۱  
۱۳۲  
۱۳۳  
۱۳۴  
۱۳۵  
۱۳۶  
۱۳۷  
۱۳۸  
۱۳۹  
۱۴۰  
۱۴۱  
۱۴۲  
۱۴۳  
۱۴۴  
۱۴۵  
۱۴۶  
۱۴۷  
۱۴۸  
۱۴۹  
۱۵۰  
۱۵۱  
۱۵۲  
۱۵۳  
۱۵۴  
۱۵۵  
۱۵۶  
۱۵۷  
۱۵۸  
۱۵۹  
۱۶۰  
۱۶۱  
۱۶۲  
۱۶۳  
۱۶۴  
۱۶۵  
۱۶۶  
۱۶۷  
۱۶۸  
۱۶۹  
۱۷۰  
۱۷۱  
۱۷۲  
۱۷۳  
۱۷۴  
۱۷۵  
۱۷۶  
۱۷۷  
۱۷۸  
۱۷۹  
۱۸۰  
۱۸۱  
۱۸۲  
۱۸۳  
۱۸۴  
۱۸۵  
۱۸۶  
۱۸۷  
۱۸۸  
۱۸۹  
۱۹۰  
۱۹۱  
۱۹۲  
۱۹۳  
۱۹۴  
۱۹۵  
۱۹۶  
۱۹۷  
۱۹۸  
۱۹۹  
۲۰۰  
۲۰۱  
۲۰۲  
۲۰۳  
۲۰۴  
۲۰۵  
۲۰۶  
۲۰۷  
۲۰۸  
۲۰۹  
۲۱۰  
۲۱۱  
۲۱۲  
۲۱۳  
۲۱۴  
۲۱۵  
۲۱۶  
۲۱۷  
۲۱۸  
۲۱۹  
۲۲۰  
۲۲۱  
۲۲۲  
۲۲۳  
۲۲۴  
۲۲۵  
۲۲۶  
۲۲۷  
۲۲۸  
۲۲۹  
۲۳۰  
۲۳۱  
۲۳۲  
۲۳۳  
۲۳۴  
۲۳۵  
۲۳۶  
۲۳۷  
۲۳۸  
۲۳۹  
۲۴۰  
۲۴۱  
۲۴۲  
۲۴۳  
۲۴۴  
۲۴۵  
۲۴۶  
۲۴۷  
۲۴۸  
۲۴۹  
۲۵۰  
۲۵۱  
۲۵۲  
۲۵۳  
۲۵۴  
۲۵۵  
۲۵۶  
۲۵۷  
۲۵۸  
۲۵۹  
۲۶۰  
۲۶۱  
۲۶۲  
۲۶۳  
۲۶۴  
۲۶۵  
۲۶۶  
۲۶۷  
۲۶۸  
۲۶۹  
۲۷۰  
۲۷۱  
۲۷۲  
۲۷۳  
۲۷۴  
۲۷۵  
۲۷۶  
۲۷۷  
۲۷۸  
۲۷۹  
۲۸۰  
۲۸۱  
۲۸۲  
۲۸۳  
۲۸۴  
۲۸۵  
۲۸۶  
۲۸۷  
۲۸۸  
۲۸۹  
۲۹۰  
۲۹۱  
۲۹۲  
۲۹۳  
۲۹۴  
۲۹۵  
۲۹۶  
۲۹۷  
۲۹۸  
۲۹۹  
۳۰۰  
۳۰۱  
۳۰۲  
۳۰۳  
۳۰۴  
۳۰۵  
۳۰۶  
۳۰۷  
۳۰۸  
۳۰۹  
۳۱۰  
۳۱۱  
۳۱۲  
۳۱۳  
۳۱۴  
۳۱۵  
۳۱۶  
۳۱۷  
۳۱۸  
۳۱۹  
۳۲۰  
۳۲۱  
۳۲۲  
۳۲۳  
۳۲۴  
۳۲۵  
۳۲۶  
۳۲۷  
۳۲۸  
۳۲۹  
۳۳۰  
۳۳۱  
۳۳۲  
۳۳۳  
۳۳۴  
۳۳۵  
۳۳۶  
۳۳۷  
۳۳۸  
۳۳۹  
۳۴۰  
۳۴۱  
۳۴۲  
۳۴۳  
۳۴۴  
۳۴۵  
۳۴۶  
۳۴۷  
۳۴۸  
۳۴۹  
۳۵۰  
۳۵۱  
۳۵۲  
۳۵۳  
۳۵۴  
۳۵۵  
۳۵۶  
۳۵۷  
۳۵۸  
۳۵۹  
۳۶۰  
۳۶۱  
۳۶۲  
۳۶۳  
۳۶۴  
۳۶۵  
۳۶۶  
۳۶۷  
۳۶۸  
۳۶۹  
۳۷۰  
۳۷۱  
۳۷۲  
۳۷۳  
۳۷۴  
۳۷۵  
۳۷۶  
۳۷۷  
۳۷۸  
۳۷۹  
۳۸۰  
۳۸۱  
۳۸۲  
۳۸۳  
۳۸۴  
۳۸۵  
۳۸۶  
۳۸۷  
۳۸۸  
۳۸۹  
۳۹۰  
۳۹۱  
۳۹۲  
۳۹۳  
۳۹۴  
۳۹۵  
۳۹۶  
۳۹۷  
۳۹۸  
۳۹۹  
۴۰۰  
۴۰۱  
۴۰۲  
۴۰۳  
۴۰۴  
۴۰۵  
۴۰۶  
۴۰۷  
۴۰۸  
۴۰۹  
۴۱۰  
۴۱۱  
۴۱۲  
۴۱۳  
۴۱۴  
۴۱۵  
۴۱۶  
۴۱۷  
۴۱۸  
۴۱۹  
۴۲۰  
۴۲۱  
۴۲۲  
۴۲۳  
۴۲۴  
۴۲۵  
۴۲۶  
۴۲۷  
۴۲۸  
۴۲۹  
۴۳۰  
۴۳۱  
۴۳۲  
۴۳۳  
۴۳۴  
۴۳۵  
۴۳۶  
۴۳۷  
۴۳۸  
۴۳۹  
۴۴۰  
۴۴۱  
۴۴۲  
۴۴۳  
۴۴۴  
۴۴۵  
۴۴۶  
۴۴۷  
۴۴۸  
۴۴۹  
۴۵۰  
۴۵۱  
۴۵۲  
۴۵۳  
۴۵۴  
۴۵۵  
۴۵۶  
۴۵۷  
۴۵۸  
۴۵۹  
۴۶۰  
۴۶۱  
۴۶۲  
۴۶۳  
۴۶۴  
۴۶۵  
۴۶۶  
۴۶۷  
۴۶۸  
۴۶۹  
۴۷۰  
۴۷۱  
۴۷۲  
۴۷۳  
۴۷۴  
۴۷۵  
۴۷۶  
۴۷۷  
۴۷۸  
۴۷۹  
۴۸۰  
۴۸۱  
۴۸۲  
۴۸۳  
۴۸۴  
۴۸۵  
۴۸۶  
۴۸۷  
۴۸۸  
۴۸۹  
۴۹۰  
۴۹۱  
۴۹۲  
۴۹۳  
۴۹۴  
۴۹۵  
۴۹۶  
۴۹۷  
۴۹۸  
۴۹۹  
۵۰۰  
۵۰۱  
۵۰۲  
۵۰۳  
۵۰۴  
۵۰۵  
۵۰۶  
۵۰۷  
۵۰۸  
۵۰۹  
۵۱۰  
۵۱۱  
۵۱۲  
۵۱۳  
۵۱۴  
۵۱۵  
۵۱۶  
۵۱۷  
۵۱۸  
۵۱۹  
۵۲۰  
۵۲۱  
۵۲۲  
۵۲۳  
۵۲۴  
۵۲۵  
۵۲۶  
۵۲۷  
۵۲۸  
۵۲۹  
۵۳۰  
۵۳۱  
۵۳۲  
۵۳۳  
۵۳۴  
۵۳۵  
۵۳۶  
۵۳۷  
۵۳۸  
۵۳۹  
۵۴۰  
۵۴۱  
۵۴۲  
۵۴۳  
۵۴۴  
۵۴۵  
۵۴۶  
۵۴۷  
۵۴۸  
۵۴۹  
۵۵۰  
۵۵۱  
۵۵۲  
۵۵۳  
۵۵۴  
۵۵۵  
۵۵۶  
۵۵۷  
۵۵۸  
۵۵۹  
۵۶۰  
۵۶۱  
۵۶۲  
۵۶۳  
۵۶۴  
۵۶۵  
۵۶۶  
۵۶۷  
۵۶۸  
۵۶۹  
۵۷۰  
۵۷۱  
۵۷۲  
۵۷۳  
۵۷۴  
۵۷۵  
۵۷۶  
۵۷۷  
۵۷۸  
۵۷۹  
۵۸۰  
۵۸۱  
۵۸۲  
۵۸۳  
۵۸۴  
۵۸۵  
۵۸۶  
۵۸۷  
۵۸۸  
۵۸۹  
۵۹۰  
۵۹۱  
۵۹۲  
۵۹۳  
۵۹۴  
۵۹۵  
۵۹۶  
۵۹۷  
۵۹۸  
۵۹۹  
۶۰۰  
۶۰۱  
۶۰۲  
۶۰۳  
۶۰۴  
۶۰۵  
۶۰۶  
۶۰۷  
۶۰۸  
۶۰۹  
۶۱۰  
۶۱۱  
۶۱۲  
۶۱۳  
۶۱۴  
۶۱۵  
۶۱۶  
۶۱۷  
۶۱۸  
۶۱۹  
۶۲۰  
۶۲۱  
۶۲۲  
۶۲۳  
۶۲۴  
۶۲۵  
۶۲۶  
۶۲۷  
۶۲۸  
۶۲۹  
۶۳۰  
۶۳۱  
۶۳۲  
۶۳۳  
۶۳۴  
۶۳۵  
۶۳۶  
۶۳۷  
۶۳۸  
۶۳۹  
۶۴۰  
۶۴۱  
۶۴۲  
۶۴۳  
۶۴۴  
۶۴۵  
۶۴۶  
۶۴۷  
۶۴۸  
۶۴۹  
۶۵۰  
۶۵۱  
۶۵۲  
۶۵۳  
۶۵۴  
۶۵۵  
۶۵۶  
۶۵۷  
۶۵۸  
۶۵۹  
۶۶۰  
۶۶۱  
۶۶۲  
۶۶۳  
۶۶۴  
۶۶۵  
۶۶۶  
۶۶۷  
۶۶۸  
۶۶۹  
۶۷۰  
۶۷۱  
۶۷۲  
۶۷۳  
۶۷۴  
۶۷۵  
۶۷۶  
۶۷۷  
۶۷۸  
۶۷۹  
۶۸۰  
۶۸۱  
۶۸۲  
۶۸۳  
۶۸۴  
۶۸۵  
۶۸۶  
۶۸۷  
۶۸۸  
۶۸۹  
۶۹۰  
۶۹۱  
۶۹۲  
۶۹۳  
۶۹۴  
۶۹۵  
۶۹۶  
۶۹۷  
۶۹۸  
۶۹۹  
۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰

و نے چپ ہو گیا، لیکن بہنوئی ان دونوں کے سامنے آ گیا اور پوچھا: "تم  
ہے ہو؟"  
و نے جواب دیا: "میں ہمدون کر حصص کی خاص خاص چیزیں دکھانا

و نے کہا: "منیزہ! میں تجھ سے تو کوئی بات کروں گا نہیں، ہاں ہمدون سے  
لے اپنے حافظہ عامر کو بھی لیتا جا۔"  
بہنوئی کے پیچھے کھڑا تھا۔ ہمدون نے عامر کو دیکھنا چاہا، لیکن بہنوئی کے

آتا ہے۔ اگر عامر کو کسی اور وقت نے آتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا؟  
 بہنوئی نے جواب دیا: ”میں کسی اور وقت کیوں لاتا، تم دونوں نے اس کو  
 رکھا لیکن میں اس کا اندر وہ اور اصرار وہ چہرہ نہیں دیکھ سکا اور اس کو یہاں لے  
 سچہ کو عامر کا آنا پسند نہیں ہے۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”نہیں، یہ بات نہیں ہے میں تو ہارون سے یہ کہ  
 کتنی کہ دیکھ لیا تو نے، میں جو سچہ سے کہہ رہی تھی کہ عامر ہماری زوجہ کا قطعاً  
 اس کے پھوپھو نے اس کو وہ اکام پہنچایا ہے اب عامر کو ہماری فکری نہیں رہی۔“  
 بہنوئی نے ابراہیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”ابراہیم کو ذرا برا ہو  
 اس کو بھی اپنے قابو میں نہ کیا تو میرا نام نہیں۔“

بہنوئی نے عامر کے ہاتھ سے بھی سدرتی کے پاؤں کے پاس سے اٹھاتی  
 مورتی کے قدموں میں ڈال دی۔

اب یہ چاروں ایک ساتھ جل پھر رہے تھے۔ ہارون نے اذراہ مذاقاً  
 تم نے تو عامر کو پوری طرح قابو میں لے لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ آگے چل کر تو شاید  
 پہنچانے بھی نہ۔“

بہنوئی نے جواب دیا: ”ابھی تو نے دیکھا اس کیا ہے؟“  
 ہارون نے ہیرت سے پوچھا: ”کیا ابھی کچھ اور دیکھنا بھی باقی ہے؟“  
 بہنوئی نے جواب دیا: ”ہاں میں اس کو اس لائق کردوں گا کہ یہ تلوار سونہ  
 مقابلے میں آجائے گا۔“

ہارون نے ہنس کر کہا: ”تو گویا تو اس کو گستاخ کر دے گا؟ پھر عامر سے  
 بیٹے کیا تو تلوار سونہ کر میرے مقابلے پر آ سکتا ہے؟“

عامر نے شرما کر جواب دیا: ”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“  
 لیکن منیزہ نے رتی آواز میں کہا: ”نہیں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس د  
 بات ممکن ہے۔“

عامر منیزہ کی باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ بولا کچھ بھی نہیں، مگر منیزہ  
 نظروں میں کچھ اور اسناد ہو گیا۔

عالم جس ماحول میں جولان ہو رہا تھا اس کا ہر فرد خود بخود ادھر چلا گیا تھا۔ ہاں  
 نے جتنیں دی تھیں۔ پھر فی بھی اچھی طرح پیش آتی رہی لیکن وہ ان دونوں کی جھڑپ  
 شک و شبہ سے مدھمکتا تھا کیونکہ حب تک منیرہ کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا، وہ بھی  
 سی طرح چاہتی تھی لیکن جب ابراہیم پیدا ہو گیا تو منیرہ کی محبت میں کسی آگئی اور  
 ہمت محبت کی جگہ حسد اور رقابت لے لے لی۔ اب اس کو کسی بڑے بھی اعتبار میں تھا  
 کہ اپنے باپ پر بھی۔ کیونکہ باپ کے تغافل اور بے نیازی نے اس کو بڑے دکھ پہنچائے  
 لاہر بادوں کی محبت میں کوئی ایسی نہیں محسوس ہوتی تھی لیکن حب بھی کوئی ایسا  
 باجہاں ایک طرف منیرہ ہوتی اور دوسری طرف عامر تو عموماً فیصلہ دینے والا تھا۔ منیرہ  
 اس کا باپ منیرہ کی طرف جھک جاتا۔ اس طرح دنیا کے تمام رشتے اپنا اعتبار سمجھ  
 اب ابراہیم بھی بڑا ہو چکا تھا۔ ابراہیم اور عامر میں ہر ہا کش مکش ہوتی اور ابراہیم  
 ہوتی کیونکہ منیرہ ہمیشہ ابراہیم ہی کی طرف ہوتی۔ نہانے کے دستور کے مطابق عامر  
 نری جبری محبت سے حاصل کرتا رہا۔ یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ ابراہیم اپنے بڑے  
 امر کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس کا حق پسند دل عامر کے ساتھ ہوتے مافی زیادتیوں پر  
 ہتا۔ ہارون اس سے بہت خوش ہوتا اور جب تنہا ہوتا تو ابراہیم کو بھی سمجھاتا  
 ابراہیم ایسے بڑے بھائی کا مرہم بڑے ظلم ہوتے ہیں، لیکن تو اپنے بڑے بھائی کا  
 لا دکھ اور زندگی بھر اس کا ادب کرتا رہا۔

ابراہیم نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن باپ کی باتوں کو گمراہ میں بانٹ دیا۔  
 ہارون اور ہمنوی دونوں اس اپنی اپنی زندگی کے انحطاطی دور میں داخل ہو  
 ہارون اپنے ہمنوی کا بہت شک و گمان تھا لیکن ہمنوی کا دل صاف نہیں تھا۔ اس  
 ابھی تک ہر انتقا کہ عین اسی وقت جبکہ وہ دو لہا بنا بیٹھا تھا اور منیرہ اس کی  
 جانے والی تھی، ہارون نے بردقت حاضر ہو کر سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ وہ  
 اکثر ہنسی ہنسی میں کہہ دیا کرتا کہ "ہارون تو نے مجھے جس طرح ذلیل و خوار  
 اسے زندگی بھر نہیں بھولیوں گا۔"

ہارون ہنس کر کہہ دیا کرتا "بھائی! جو کچھ ہو گیا، ہو گیا، اب اس کا بار بار ذکر نہیں  
 نہ حافی چاہتا ہوں۔"

لیکن ہمنوی بات کو ہنسی میں اڑا دیتا۔ ہارون حیران تھا کہ ایک طرف تو اس کا  
 ن کا احتشاش ہے کہ ہر سوز بہرائی بات کا زخم لہو دکھا دیتا ہے مگر یا تا نا مانہ

ہارون نے سختی سے کہا: "منیرہ! میں نے آج تک تجھ کو حکم نہیں دیا اب میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ تیرے ساتھ چل اورو عامر کا ہونے والی دہائی کو دیکھنا داری سے بتا کہ یہ عامر کے لئے کیسی رہے گی؟"

منیرہ نے بھی بڑی لاپرواہی سے جواب دیا: "میں اپنے بیٹے ابراہیم کے لئے بھاگ دوڑ کر سکتی ہوں لیکن عامر کے لیے یہ سب کیوں کروں؟"

ہارون نے ایک بار پھر حکم کہا: "منیرہ! میں تجھے حکم دیتا ہوں، اگر تو نے حکم نہ مانا تو میں تجھے طلاق دے دوں گا۔"

منیرہ کے باپ نے مداخلت کی، منیرہ کو سمجھایا: "منیرہ! تجھے اپنے شوہر کا چاہیے۔ آخر عامر بھی تو ہارون ہی کا بیٹا ہے۔"

منیرہ بے بس ہو گئی اور بادل بخیز اسے ہارون اور اس کے بہنوئی کے ساتھ گھر پہنچ گئی۔ لڑکی کا نام رابعہ تھا اور وہ اپنی شکل و صورت سے جو رنگت تھی۔ بڑے پلوں کے ساتھ میں بڑی بڑی بادام جیسی آنکھیں اور متوازن اور مناسب جسم پر مشابہ رنگ سرتاپا کیف میں ڈوبی ہوئی کہ جو دیکھے اس پر نشہ ہٹھ جائے۔ بالور سلیقہ اور آواز میں موسیقی کی کھنک، منیرہ کو یہ لڑکی بہت پسند آتی۔ رابعہ کے گھر نے ان سب کی بڑی تراضی کی۔ منیرہ نے لڑکی کی ماں سے پوچھا: "محترم خاتون! کیا عامر کو دیکھا ہے جس کو اتنی اچھی لڑکی سو نہپ دینا چاہتی ہو؟"

لڑکی کی ماں نے جواب دیا: "نہیں، میں نے لڑکا نہ اچھی تک نہیں دیکھا بھائی ہارون کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ ظاہر ہے ہارون کا بیٹا بھی ہارون ہی ہوگا۔"

منیرہ نے کہا: "اندر میں کہ یہاں یہ صورت حال ہرگز نہیں۔ اگر تم میرا کہ تو عامر کے چھوٹے بھائی ابراہیم سے اس کا رشتہ کر دو۔ اللہ نے چاہا تو ہٹے سے رہے گی۔"

لڑکی والوں نے بھی معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کو اچھی طرح سمجھ لیا تو لڑکی کی ماں نے پوچھا: "کیا عامر اچھا لڑکا نہیں ہے؟"

منیرہ نے جواب دیا: "عامر میرا بیٹا نہیں ہے اس لیے میں اس کی ضمانت نہیں بن سکتی اور پھر یہ کہ عامر میرے پاس رہا بھی نہیں، وہ ہمیشہ دور رہا ہے۔"

طالبہ کی ماں نے پوچھا: ”اگر ایسی بات ننھی تو عامر کی طرف سے میری لڑکی کو بدوں آتی تھیں؟“

منیزہ نے جواب دیا: ”میں لڑکی کو دیکھنے نہیں لڑکی کے گھر والوں کو سب لے آگئی تھی۔“

لڑکی کے گھر والوں نے ابراہیم کا رشتہ قبول کر لیا اور البعہ کے بڑوں نے باہر یہ کہ ”البعہ کو ابراہیم کے لیے پسند کر لیا گیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو کسی ایسے لڑکے بنسوب نہ کر میں گے جو اپنے باپ سے دو رکھو پائے گھر بلا بٹھا ہو، وہ یقیناً نہ مریجھ لڑکا ہوگا۔“

اس غیر متوقع اعلان نے بہری کو چونکا دیا۔ منوئی نے حیرت سے کہا: ”یہ کیا؟ یہاں ابراہیم کا رشتہ لے کر کون آیا تھا؟“

ہارون نے جواب دیا: ”بھائی! میں سب سمجھ گیا۔“

یہ سب ٹھہرا لیا اور افسردہ سبب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو ان سے بولا نہیں مایہ پیمانہ شجائے ہوتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منیزہ کسکی کی پردہ کیے بغیر میں چلی گئی۔ عامر کا مکان معلوم کر سبھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی زبان سوال بھی نہیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف عامر کا باپ ہارون منیزہ سے بہرہ بھی منیزہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہو گیا۔ منیزہ بے حد خوش تھی وہ اپنا مارہی تھی۔ اس نے آیتے میں اپنے پیچھے ہارون کو دیکھ لیا اور فوراً گھٹم گھٹم کرکے ”خیریت تو ہے؟“

ہارون نے پھیکے مسکراہٹ سے جواب دیا: ”منیزہ! یہ کیا ہو گیا؟“

منیزہ نے پوچھا: ”کیا ہو گیا، میں نہیں جانتی کہ لڑکی جاننا پتا ہے؟“

ہارون نے کہا: ”ہم لوگ عامر کے رشتے کی بات کرنے گئے تھے۔“

منیزہ نے جواب دیا: ”بے شک! لیکن وہ لوگ عامر کے بھائی ابراہیم کو پسند

ہارون نے افسوس سے کہا: ”وہ خود عامر کے بھائی ابراہیم کو نہیں پسند کرنے

نے انہیں اس پر آمادہ کیا ہے، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

منیزہ نے ناگن کی طرح مڑ مڑ کر جواب دیا: ”انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں

نہیں ہی ہوں، میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جوتجہ میرے پاس نہ رہا ہو جسے



میں نے نہ پالا پڑھا اور جو لپٹنے ماں باپ سے دودھ پھرتا ہوا پاس رہا اور میں اس کی خواہش  
کس طرح بن سکتی ہوں؟

ہارون نے تسلیم کر لیا کہ شروع کر دیا تو نے غلط بیانی کی ہے، عامر ہم سے دور  
کبھی بھی نہیں رہا، اس کا پھوپھا بھی اس سے ساتھ ہی رہ رہا ہے اور پھر تو عامر کی خواہش  
نہیں، میں تو صاف بن سکتا ہوں؟

منیرہ نے آہستگی سے کہا: "لیکن اب تو میں ابراہیم کی بات کر بھی آتی ہوں عامر کی  
دیکھو ہے جبکہ ابراہیم اس کے لئے بالکل موزوں ہے؟"  
ہارون نے سختی سے کہا: "لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ شہتہ عامر ہی سے ہو گا  
ابراہیم سے بھی نہیں؟"

منیرہ نے تیریاں جھٹھالیں: "ہارون! میں نے کبھی کسی معاملے میں ضد نہیں  
کی لیکن جب میں نے ابراہیم کے لئے زبان دے دی ہے تو یہ رشتہ ابراہیم سے ہی رہے  
کر رہے گا؟"

ہارون چیخ پڑا: "میں ایک عرصے سے تیری نیادیاں دیکھ رہا ہوں۔ تو  
عامر پر جو ظلم کیے، میں خاموشی سے برداشت کرتا رہا ہوں لیکن اب تو ان دیادہ تیروں  
بانا جا، ابراہیم اور عامر میں نفرتوں کی خلیج نہ پیدا کر، کیونکہ ہم دونوں کے بعد منیرہ  
جل کر نہ رہ گیاں گئیں، اگر ان میں نفرتیں پیدا ہو گئیں تو یہ دھمکی بھرا آپس ہی  
لپٹتے جھگڑتے رہیں گے؟"

منیرہ اپنے فیصلے پر قائم رہی، "ہاں! ہارون! تو میری عادت سے واقف ہے  
نے ایک بار جو فیصلہ کر لیا، میں فیصلے بدلنے کی قائل ہی نہیں۔ بہت عرصہ پہلے  
سبب میں نے تجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو اسے لوگوں کی مخالفت کی پروا نہ  
بیغیر اور کیا پھر جب تم لوگوں نے مانہ ٹل کے اندر مجھے بے اولاد نہ کھنا چاہا اور  
نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بچے کی ماں بن کر رہوں گی تو میں اپنا مقصد حاصل کر  
رہی، اور اب میں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ رابعہ کی شادی ابراہیم سے ہو گی تو یہ  
ابراہیم ہی سے ہو کر رہے گی؟"

ہارون نے بڑبڑاتے ہوئے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ شہتہ تلخینوں کو بچھا  
جاتے اور خوشگوار ماحول پیدا کیا جاتے؟"  
منیرہ نے جواب دیا: "اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ رابعہ سے"

دی جاتے۔

ہامدون نے خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ منبرہ کسی طرح بھی اپنا فیصلہ لے گی تو اس نے ایک دوسری ترکیب پر عمل کرنا شروع کیا۔ وہ ابراہیم کو گھر گود کی بیلوں کے مایے میں لے گیا اور پوچھا: ابراہیم! پتہ بتا عا سر تبھے

ابراہیم نے جواب دیا: بھائی عامر بہت اچھے ہیں، مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ہامدون اس جواب سے بہت خوش ہوا، بولا، ”بیٹے! میں تیری ماں کی مخالفت ہا، لیکن یہ ضرور سمجھوں گا کہ دانشگی یا نادانشگی میں تیری ماں نے عامر پر ظلم کیے کی ہے۔“

ابراہیم کے چہرے پر افسوس اور ندامت کے اثرات پلٹتے جاتے تھے، بولا: ”نیکن رہے میں اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔“

ہامدون نے خوشامرانہ کہا: ”میں یہ نہیں کہتا کہ تو اپنی ماں کی مخالفت کر بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ تو اس شادی سے انکار کر دے۔“

ابراہیم نے سر جھکاتے ہی جھکاتے جواب دیا: ”میں نے شادی پر آمادگی ہی کب کی، مجھے بھائی عامر سے ہمدردی ہے۔“

ہامدون نے بے اختیار ابراہیم کو اپنے سینے سے لگا لیا: ”جنرل اللہ میرے بیٹے! اور صالح ہے۔“

عامر کا پھوپھا منبرہ کی حرکت سے اتنا بدظن اور دل برداشتہ تھا کہ وہ منبرہ کے خطرناک عازش کا منصوبہ تیار کرنے کی فکر میں تھا اس عہدیت کے خلاف کئی نہ مگر خطرناک منصوبہ بنایا جاتے کہ منبرہ کو بس مرہ ہی آجاتے۔ اس نے کئی بے چینی میں گزار دیں اور منبرہ کے خلاف ہی سوچتا رہا۔ اس دوران عامر بھی مندر نہیں تھا وہ بھی معلوم نہیں کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر وہ گھر سے کافی فاصلے پر گئے لگا اور آخر یہاں تک نصیحت پہنچ گئی کہ وہ مارا سا راجن غائب ہوا اور اس کا بہنوئی دونوں ہی عامر کی ان حرکتوں سے ہمہ نشان تھے مگر عامر پر پریشانی کے آثار دیکھ کر دونوں ہی خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ایک دن علی الصبح عامر باہر جانے لگا تو اس کے پھوپھا نے اس کو روک لیا تو کہاں جا رہا ہے؟

عامر نے جواب دیا: "میں شام تک واپس آ جاؤں گا۔"  
 پھوپھو نے کہا: "تو آج کہیں نہ جا کیونکہ میں منبرہ اور نیری چمپلش؛  
 مستقبل کے ہنگامے دیکھ رہا ہوں۔ اس خاموش ماحول کی مثال اس ماکھ جیسو  
 جس کے اندر چنگاریاں چھپی ہوں اور جو کسی بھی وقت آگ میں بدل جانے  
 تیار ہوں۔"

عامر نے جواب دیا: "پھوپھو یا جان! میں خود کو اس ماحول میں غیر اور اجنبی محسوس  
 کرتا ہوں اس لیے میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔"  
 پھوپھو نے سستے دی: "میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تیرے باپ کو مال و زر کو  
 پر آمادہ کر دوں کیونکہ میں نے منبرہ کی فطرت اچھی طرح سمجھ لی ہے۔ ہارون کی علم  
 میں یہ تجھ کو تیرے حق سے بھی محروم کر دے گی۔"

عامر نے جواب دیا: "میں مال و زر کو مصیبت سمجھتا ہوں، اس لیے میرے  
 کا مال و زماں کو برباد، مجھے اس میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔"

پھوپھو بھونک کر کھڑا ہو گیا: "یعنی اب تو میری بات سمجھی نہیں مانے گا یا مال  
 مصیبت نہیں کا تا رہے۔ میں تجھ کو یوں منفی انداز فکر پر قائم نہیں ہونے دوں؟  
 لیکن عامر نہیں رکا اور چلا گیا اس کا پھوپھو یا سارا دن ہارون سے بڑا جھگڑا  
 رہا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں عامر کا حصہ الگ کر دے لیکن ہارون اس پر یوں غیا  
 ہوتا تھا کہ وہ پہلے عامر کی شادی کرنا چاہتا تھا اس کے بعد اس کو الگ کر کے خود  
 کے ساتھ رہنے کا منصوبہ بنالیا تھا۔"

لیکن پھوپھو نے اصرار کیا: "نہیں! پہلے تقسیم بعد میں شادی اور آخر  
 کے ساتھ رہاقتش۔"

کسی طرح منبرہ کو بھی اس ہمت ملا جسے کا علم ہو گیا اس نے دونوں کو  
 دیا۔ بولی: "جب تک میں موجود ہوں ایسا نہیں ہو گا۔ مال و زر میں تقسیم ہو گا۔  
 شادی کرے گا تو وہ ساتھ رہے یا الگ، میں اپنے پاس سے لے کچھ بھی نہ دوں  
 کیونکہ مجھے اپنے ابراہیم کی فکر ہے۔"

لیکن ابراہیم نے صاف صاف کہہ دیا کہ ماں بیس مال و زر کی طرح ہیں آپ  
 سہارے کر بھائی، عامر کو ان کے حق سے محروم کرنا چاہتی ہیں میں اس میں آپ کا  
 نہیں دوں گا۔"

مینہ نے ڈانٹ دیا۔ لا تو چپ رہ نادان لڑکے، تیری بہتری کو جتنا بہتر میں سوچ  
 کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ تیری ماں نے اس موجودہ مال دزد کو بڑی  
 برحمت سے محفوظ رکھا ہے اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج اس گھر میں خاک اڑ  
 دے گی تو بھی حق، حصے کی باتوں کا موقع نہ ملتا؟

اردن نے اپنے بہنوئی کو مخاطب کیا: ”بھائی! ہم عامر سے کہہ دو کہ میں اس کو اس  
 سے دے دیتا چاہتا ہوں اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر دیوار کو میں  
 ”پھر مینہ سے کہا: ”اور مینہ! تو بھی اچھی طرح میری بات ذہن نشین کر لے  
 اس معاملے میں میری مخالفت کی تو میں پھر بھی وہی کروں گا جس کا میں  
 پیالے اور تیری خدمت کے پیش نظر یہ بھی ممکن ہے کہ میں تجھ سے ہمیشہ کے  
 نااختیار کروں۔“

مینہ نے بھی سختی سے جواب دیا: ”ہاں! میں اپنے مال دزد کے حصے بخرے  
 دے دوں گی۔ اگر تو اس بہانے سے مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے تو  
 یہ بھی تیار ہوں کہہ دوں کہ میری ناک کی بات ہے، اور میں اپنی اولاد کے بیٹے  
 میں حقیر مہرجانا کسی قیمت پر بھی گوارا نہ کروں گی۔“

اردن اپنی ضد پر اصرار کیا اس نے اپنے بہنوئی سے کہا: ”بھائی! عامر کو بلاؤ  
 بھی اور اسی وقت چکا دیا جائے۔“

نہوئی نے جواب دیا: ”عامر گھر میں موجود نہیں ہے، امیر ہے شام تک وہیں  
 نایہ قصبہ بھی چکا دیا جائے گا۔“

مینہ نے اپنے بیٹے امیر کا ہاتھ پکڑا اور وہاں سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی: ”مجھ  
 سے معلوم تھا کہ اردن کو درغلا یا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی خبر وہ نہیں۔  
 نعمت لوں گی؟“

اردن اس کے بہنوئی نے بھی بحث ختم کر دی اور وہ دونوں ہی علم کی دہلی  
 لگے۔

مگر عامر نہیں آیا، رات ہوئی مگر عامر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ پھر نصف  
 چوپاکم مگر اردن زیادہ فکر مند ہوا۔ دوسری صبح منہ ظلم ہوئی مگر عامر  
 کھانا ہاں دونوں تلایا تلایا اور صبح پھر تار ماوہ عامر کی تلاش میں اپنا  
 اہل۔ مینہ بہت خوش تھی کہ ایک کانٹا جو اس کے دل میں مستحکم چھب

رہا تھا اب دوسرے سوچا تھا۔ وہ ہارون اور اس کے مہنوی کی پریشانیوں سے بہرہ ور ہی تھی۔

ایک دن، دو دن، چار دن، ہفتہ، کئی ہفتے، مہینے، دو مہینے پھر گئے مگر عامر کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ہارون کا اضطراب بڑھتا رہا۔ اس کو غم نے نشہ پڑا رہا۔ پھر باہمی پریشان تھا مگر نسبتاً کم۔ اب ہارون کم گو ہو گیا تھا۔ اسے غم کو دیکھ کر امیر اہم عسکر کی تلاش میں نکل گیا کہ پھر وہ بھی واپس نہ آیا۔ اگشتگی نے منیرہ کو بھی ہلا ڈالا۔ اب یہ گھر مستقل بیت المحزن بن چکا تھا۔ کسی کا میں دل ہی نہ لگتا۔ منیرہ کا باپ بھی خود فرود اور فکر مند رہنے لگا تھا۔ منیرہ کو کہ اس کا بیٹا امیر اہم کسی کی سازش کا شکار ہوا ہے اور اس کے خیال میں اس سے باقی بانی ہارون کا مہنوی تھا۔ منیرہ کا بس چلتا تو وہ ہارون کے مہنوی چبا جاتی۔

دونوں بیٹوں کی گشتگی نے ہارون کو مردہ کر دیا۔ اب اس کا کسی دل ہی نہ لگتا۔ منیرہ بھی اکثر و بیشتر مدنی ہی رہتی۔ ہارون کا مہنوی بھی لا لگا تھا۔ منیرہ کا باپ مرنے کی خواہش میں جی رہا تھا۔ ہارون اور منیرہ گلے ہیں جھگڑ پڑتے۔ ہارون کہتا یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے تیری خود غرضی کہیں کا بھی نہ لکھا۔

منیرہ کہتی "ہارون! مجھے شور و الزام ٹھہرا کر میرے زخموں پر نمک اگر زیادہ تنگ کیا تو میں گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں دفنان ہو جاؤں اور تو تیرے میں کسی نتیجے کے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔"

ہارون نے اتنا کر بار بار جہ مجھڑی اپنے سابقہ پیشے سے رجوع کر دیا نہ ہو گیا۔ ان دنوں کوئی اور بصرے میں خلافت کی نیابت حجاج کوئی چکی تھی اور وہ خوارج کے خلاف مہات میں جبری طرح اٹھا ہوا تھا سپاہیوں کی ضرورت تھی پناہ وہ جبری آسانی سے نوح میں داخل کر لیا حجاج کو یہ بات معلوم ہوئی کہ ہارون وہی شخص ہے جس میں وہاں کے عامل امیر کا ساتھ چھوڑ کر باغی بیکر کی حمایت کی تھی تو غضبنا آگے اس بار بھی غلامی کی تربیت چھلے کہ میں امیر سے قطعی مختلف انسان ہوں۔ نہ تو اسامہ میں اس کے حکم میں ہونا تو آج تو نظر نہ آتا تیری خاک کا بھی

ن کو معاف نہیں کرتا۔“

اس دن نے جواب دیا۔ ”امیر! میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، اگر میں غلط نہ ہوں تو میری غلطیوں کے ساتھ ہوجکا ہوتا، نیکی میں ایک وقادار انسان ہوں، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں میں اپنی گردن تک“

پانچ نے کہا۔ ”تب پھر حبش میں شامل ہو جا جو دشمنانِ خدا اور دشمنِ خدا پر پیکار ہے اگر تیری حبش نے انہیں شکست دے دی تو میں تجھے اور تیرے الغام و اکرام سے نواز دوں گا۔“

اس دن نے اس سرورگی سے جواب دیا۔ ”امیر! میں لالچی نہیں ہوں اس لیے میں اپنی لالچ و اکرام کی صورت میں نہیں لوں گا میں محض سچل کر یہاں آیا ہوں، سبب میں الغام و اکرام کا مستحق ٹھہروں تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کی جگہ دے

پانچ نے پوچھا۔ ”تجھ کو محض میں کیا تکلیف ہے جو تو کوئی حق منتقل ہو جانا“

اس دن نے جواب دیا۔ ”امیر! میرے دو بیٹے معلوم نہیں کہاں چلے گئے، اس لئے میں مدحیٰ اذیت محسوس کرتا ہوں جہاں میرے دونوں بیٹے رہتے اور تھے۔“

پانچ نے کہا۔ ”تو فکر نہ کر، خوارج کے فتنے سے نجات مل جائے تو میں غیر انتظام کرنے لگا۔“

اس دن نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ محض واپس نہیں جائے گا، اس وقت ہو گئی تھی کہ وہ پورے المیہ کا فیصلہ ہن کو ذمہ دار سمجھتا تھا۔ دونوں بیٹوں اس میں باپوسی اور تنویط پیدا کر دی تھی۔ اس نے خدا سے نو لگائی تھی، چار دعا مانگتا تھا تھا کہ ”خدا یا ابا تو خوارج کے مقابلے میں مجھ کو کامیاب رہے، یا پھر شہادت سے ہمکنار کر دے۔“

اس دن کو مشہور غار ہی سردار شیب کے مقابلے پر بھیج دیا گیا۔ شیب نے ان کو نزل پر شکستیں دے کر تھمکا چھایا تھا حجاج ان شکستوں کی درجہ سے تھا اور دن رات شیب اور خوارج کا خوف اور اندیشہ کھلے جا رہا تھا۔

حجاج کو یہ خبر مل چکی تھی کہ شیبہ اپنی فوج کے ساتھ کوفہ کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ حجاج فرات کے کنارے اپنے محل میں بیٹھا فوجی ترتیب میں مشغول تھا۔ شیبہ کے دوسرے کنارے منجہ نامی قصبے میں پڑاؤ ڈال کر حجاج کا انتظار کرنے لگا۔ ہاں دستہ شیبہ کے مقابل حجاج کے حکم کا منتظر ڈٹا ہوا تھا۔

حجاج نے محل کی چھت سے میدان جنگ کا معائنہ کیا۔ اس نے فرات کے منجہ میں مسجد کے سامنے شیبہ کی فوج کو پڑاؤ ڈالے دیکھا۔ شیبہ کے پاس فوج نہیں تھی اس لیے وہ فرات کے کنارے کو دور تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے خود آبی ایک فرمان کے ذریعے ہارون کے دستے کو فرات کے اس پارا تروا دیا۔ اسے تاکید کر دی کہ وہ شیبہ سے خوفزدہ ہونے بغیر اپنی جگہ اس وقت تک ڈرے جب تک وہ خمدان کی مدد کو نہ پہنچ جائے۔

محل کی چھت سے اچھی طرح جا تڑھ لے چکنے کے بعد حجاج نیچے اترا دو غلاموں کو نذوق برق لباس پہنا کر ساتھ لیا اور اپنی سپاہ کو لے کر فرات کے پار حجاج کی مخصوص کرسی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ حجاج منجہ کی مسجد کا منصوبہ بنا چکا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ اگر خار جیوں کی اس مسجد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ شیبہ اور اس کے ساتھیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

شیبہ کے حجاج کی فوج کو جمع ہوتے دیکھا تو وہ ان کی طرف بڑھا۔ نذوق برق لباس میں ڈوبے ہوئے اپنے ایک غلام کو حکم دیا۔ ”اے شخص! اگر کو ہلاک یا زخمی کر دے گا تو ایک بہت بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے گا۔“ شیبہ کو قتل کرنے کے آجا۔

غلام نہایت شان اور آں بان سے آگے بڑھا اور شیبہ کو ہلاک کر دیا۔ حجاج سمجھ کر آگے بڑھ کر حملہ کر دیا۔ غلام اور شیبہ میں ذرا دیر سا بلکہ ہوا لمحوں بعد شیبہ نے غلام کو قتل کر دیا۔ وہ جوش و خروش سے گھوڑا اڑاتا ہوا فوج کے قریب چلا گیا اور اعلان کیا۔ ”اے مجھ سے بددعا نہ کرؤ! اگر یہ حجاج تھا برق لباس میں میرا مقابلہ کرنے آیا تھا تو جان لو کہ میں نے اس کو قتل کر دیا اور اس کے خوف اور غم سے نجات پا چکے ہو۔“

حجاج نے دوسرے غلام کو حکم دیا۔ ”اب تو جا اور شیبہ کے دائرہ

تے جھٹتے اس کو ہلاک کر دے۔ اگر تو اس میں کامیاب ہو گیا تو میں تجھے آزاد بھی کر دے کسی بلند منصب پر فائز بھی کر دوں گا۔

غلام جوش اور جذبے سے آگے بڑھا، شیب نے ایک دوسرے شاندار شخص نے ہوتے آتے جو دیکھا تو یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید حجاج وہ نہیں تھا جو قتل ہوا، بلکہ ہے حجاب اس کے مقابلے پر آیا ہے۔ وہ سچے جوش و خروش سے اس کی طرف بے درپے وار کرنے لگا۔ غلام بھی معمولی شمشیر زن نہیں تھا، اس نے بھی بڑی اور مہارت سے شیب کا مقابلہ کیا۔ شیب نے کہا: "افسوس کہ میں نے تجھ سے نص کو حجاج کے دھوکے میں قتل کیا تھا، وہ تو نہیں کوئی اور ہی تھا لیکن خیر اب برآیا ہے تو میری تلوار کا مزہ چکھ۔"

غلام نے بھی یہی تاثر دیا کہ وہی حجاج ہے، بولا: "شیب! کیا تو مجھے کوئی معمولی تار ہے؟ یا دیکھ کہ میں حجاج ہوں اور تیری موت میرے ہاتھوں تکھی گئی ہے۔" شیب نے کہا: "افسوس کہ تو انسان ہو کر خدائی کا وعدہ دار ہے اور نہ تیرے بھی نہ کہتا کہ میری موت تیرے ہاتھوں تکھی گئی ہے؟"

غلام نے ہنس کر جواب دیا: "اس میں کیا ہے، ابھی پتہ چلا جاتا ہے کس کی موت تو تکھی گئی ہے؟"

باح ان کے باتوں اور جذبوں سے خاصا متاثر تھا۔ اپنے آدمیوں کو حکم دیا: "مجھے بیت الہگے بڑھاؤ کہیں تک کہ میں اس مسجد کے قریب ہو جاؤں کیونکہ میں خوب جب میں اس مسجد کے پاس پہنچ جاؤں گا تو گویا فتح میری ہی ہوگی۔" نکی کر سی دھا آگے بڑھا دی گئی۔

باح کا غلام طہان اور شیب کچھ دیر کے لئے ایک دوسرے سے ٹکرائے اور پھر ان کا بھی کام تمام کر دیا۔ حجاج کا غلام طہان نہ خمی ہو کر جیسے ہی گرا شیب بوں سے کہا: "دوستو! اگر یہ شخص حجاج تھا تو میں نے اسے بھی ہلاک کر دیا۔" شیب کے کسی ساتھی نے کر سی پر بیٹھتے ہوئے حجاج کی طرف اشارہ کرتے ایسا لہو مین آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ حجاج تو وہ رہا، جو کر سی پر شکست

ب نے دوسرے حجاج کو دیکھا اور بڑے اطمینان سے کہا: "نہرا! اگر حجاج ابھی ایسا اپنے انجام کو پہنچنے کے لئے، اور اللہ نے چاہا تو اس دشمن فلاح و خیر



سے میں ہی نجات ملاؤں گا۔“

دوسری طرف حجاج اپنی فوج سے کہہ رہا تھا۔ ”اے اطاعت شعاعہ اور فوج  
تم ثابت قدم رہو، اگر تم نے میرا کہنا مانا تو میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بہار  
اور فرخ کے درمیان کوئی شے حائل نہیں رہے گی۔“

ابھی حجاج کا خطاب پورا بھی نہ ہوا تھا کہ شبیب نے ان پر بھروسہ  
شبیب اپنے چہرہ سر آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا لیکن حجاج کی فوج جو دنگی  
کی مہیاہ کے حوصلے بلند کر دیتے تھے۔ دھوپ کی چمک میں ہتھیار نظروں کو خیر  
تھے۔ دونوں طرف سے تلواریں نیرے اور تیراٹوں کو ہلاک اور زخمی کر رہے تھے  
اور اس کے ساتھ ہیوں کی ساری کوشش حجاج نے خاک میں ملا دی تھی اور وہ خار  
پھیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے خارجی پسیا ہو رہے تھے حجاج کی  
کی مسجد کی طرف بڑھتی جارہی تھی۔ شبیب نے اپنے ساتھیوں کو جو دش دلا لیا۔ اس  
کے درمیان اب گھوڑوں کی پشت پر سوار ہونے کا وقت نہیں رہا، ایسے آچاؤ اور  
سپاہ کو مسجد کی طرف بڑھنے سے روک دو۔“

ہارون نے حجاج سے اجازت طلب کی۔ ”امیر! میں اس سارے سردار کو مرد  
گھاٹ اتار کر امر ہو جانا چاہتا ہوں۔“

حجاج نے جواب دیا۔ ”پھر انتظار کس بات کا، آگے بڑھو اور اب شجاء  
اس شعلہ کو جو سرد کر دے۔“

ہارون نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، لیکن وہ جیسے ہی خانہ بدوں کے قریب  
خوارج کی پیدل سپاہ میں سے چند مہیاہی آگے بڑھے اور انہوں نے ہارون کے  
کی ٹانگوں کو کاٹ دیا۔ گھوڑا اگلی ٹانگوں کے کٹ جانے سے منہ کے بل گر گیا۔  
گھوڑے کے سامنے ذرا فاصلے پر اس طرح جاگرا، گویا اس کو اٹھا کر پھینک د  
ہارون کے ہاتھ کی تلوار بھی گر گئی۔ ہارون کو اس حادثے میں بھی یہ احساسی باؤ  
خارجی اس کو چاروں طرف سے گھیر کر ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس نے چوٹ کی پروا  
فوج اٹھ کر واپس جانے کی کوشش کی لیکن ایک خارجی نوجوان نے اپنی تلوار کو  
کے سینے پر رکھ دی اور حکم کہا۔ ”سبھاگنے کی کوشش مت کر، چپ چاپ کھڑا  
ہلاک کر دیا جائے گا۔“

اس شہنشاہ آواز نے ہارون کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ اس نے

طرف دیکھا اور غصہ مٹا دیا۔ "اسے عامر! یہ تو ہے؟ مگر تو یہاں کہاں؟" مگر کی تلواریں نوک اب بھی ہار دن کے سینے میں چبھ رہی تھی۔ عامر نے جلدی نہیں کی۔ میں باپ ہونے کے باوجود غصہ کو معاف نہیں کر سکتا کیونکہ تو غلطی بن مرواں کہ مسلمانوں کا امیر المؤمنین سمجھتا ہے اور میں مشیب کہ اپنا

فی دیر میں دوسرے خارجی بھی ان دنوں کے آس پاس جمع ہو گئے اور ہار دن کے غائب میں چلا گیا۔ عامر نے اپنے ساتھیوں سے کہا: "دوستو! فسوی کہیہ میرا باپ ہے اس لئے میں اس کو ہلاک نہیں کر سکتا، مگر قتل کر کے امیر المؤمنین کے گردوں کا جو وہ سزا تجویز کریں گے وہ دے دی جائے گی؟" بن انہی میں سے ایک ادراستنا اور جوان ہار دن کے سامنے آکھڑا ہوا، یہ یاسو تیلی ماں کا بیٹا تھا۔ ہار دن ایک بار پھر چیخا۔ "ابراہیم یہ تو ہے، واللہ ما اہوں؟"

عامر نے پھر جواب دیا۔ "ہاں اب ابراہیم بھی ہمارے ہی ساتھ ہے ہم لوگوں دنیا آخرت کے لیے فروخت کر دی ہے اس لیے ہمارے دیوں سے رشتہ کا حل کیا؟"

پانچ دور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہار دن کو گھڑے سمیت گتے ہوتے اپنے آدمیوں کو حکم دیا: "اے اللہ کے بندو! تمہارا ایک بھائی مصیبت میں نورا اس کی مدد کو پہنچو۔"

نامی سپاہ کا ایک دستہ دریائے دارا کے بڑھا اداستانا فانا ہار دن سمیت کئی خارجیوں کے میں لے لیا۔ حجاج کے کئی اور دستے بھی مختلف سمتوں سے بڑھ کر وہیں پہنچے۔ خارجیوں کو بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ اب پالسنہ پلٹ چکا تھا۔ عامر نے اپنی سینے پر سے ہٹا کر مٹا دیوں سے مقابلہ کرنا چاہا مگر مٹا دیوں نے کمر بند پھینک نہیں کر سکا۔ انہی میں عامر اور ابراہیم بھی شامل تھے۔ ہار دن نے اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑا ہوا دیکھا تو بے چین ہو گیا۔

مشیب نے اپنے آدمیوں کو گرفتار کرتے دیکھ کر شامی دستے پر یلغار کر دی لیکن حجاج خامیوں کو طاقہ کک پہنچا چکا تھا۔ اس کی کمک نے خوارج کو تلواریں رکھ لیا۔ اور اس میں مشیب کا بھائی مصافہ قتل کر دیا گیا۔ خوارج خود کو

مجمع کمر کے فیصلہ کن وار کیا مگر شامیوں نے انہیں شکست دے دی۔ شبیب  
ساتھیوں کو حکم دیا: "اے اللہ کے دوستوں! اپنے بہترین وقت کی توقع میں با  
محور سے منہ موڑ لو، شاید تم نے والا کل ہمارے لیے نفع بخش اور مفید ہو۔"  
خوارج پیچھے ہٹے۔ حجاج اپنی کمری کو آگے بڑھاتا ہوا یہاں تک کہ

ساتھیوں سمیت پیچھے ہٹ گیا اور حجاج مسجد کے قریب پہنچ کر کمری سے ا  
مسجد کے قریب جا کھڑا ہوا اور اعلان کیا: "اے افاعت شعراء! اس ذات ک  
کے دست قدرت میں حجاج کی جان ہے۔ یہ پہلی فتح ہے جو میں حاصل ہوتی  
پھر وہ بیس آدمیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا اور اپنے آدمی  
دیا: "دوستو! تم اپنے اپنے چلوں میں تیر لگاتے رکھو اور جب یہ دیکھو کہ فارسی  
بڑھ رہے ہیں تو انہیں تیروں کی بوچھاڑ سے روک دو۔"

شبیب نے حجاج کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا تو یوں ہو گیا۔ د  
بھڑتے دریا کی طرف بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ساتھیوں سمیت دریا پار  
جب وہ سب دریا پار ہو گئے تو شبیب نے پل توڑ دیا نا کہ اموی سپاہ اس کا  
نہ کر سکے۔

حجاج قیدیوں کو اپنے محل میں واپس چلا گیا۔ ہارون اپنے دو نو  
اعت میں حجاج سے جدا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ حجاج  
اور سفاک انسان ہے وہ معاف کرنے کا قائل ہی نہیں۔

حجاج نے امیر خوارج کو قید خانے میں ڈالوا دیا اور خود آرام کرنے ک  
جانے لگا اس نے اپنی سپاہ کا ایک طاقتور دستہ طلبہ گروہ کے لیے چھوڑ دیا  
طلبہ گروہ دستے کا سردار ہارون کی مقررہ کر دیا مگر ہارون نے یہ منصب قبول کر  
انکار کر دیا۔ حجاج یہ بات کہاں برداشت کر سکتا تھا، غضب ناک ہو کر بولا:  
حکم عدوی کا سخت مخالف ہوں مجھے منصب قبول کرنے میں تامل کیوں ہوا؟  
ہارون نے جواب دیا: "امیر! جب تک گرفتار خوارج کا کوئی فیصلہ نہ  
میں آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

حجاج نے اپنی دان پر ہاتھ مارا: "میں زبان درازی بھی پس نہیں  
حکم ہے کہ تو اس وقت طلبہ گروہ دہستے کو لے کر دریا کے کنارے کھڑے  
کیونکہ شبیب کا کوئی مجھ و منہ نہیں، وہ ہماری غفلت سے کسی وقت بھی ف

لیکن ہارون نے اٹل لہجے میں جواب دیا: ”لیکن میں نے کہہ بخودیا کہ میں  
قت تک آپ کے قریب ہی رہوں گا جب تک کہ گمہ فتنہ خوارج کا کوئی فیصلہ  
نہ دیا جاتا“

حجاج نے کمرختگی سے بول چھا: ”ان سے قیرا تعلق ہ ان سے تیری دلچسپی  
بہ“

ہارون نے جواب دیا: ”اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی داستان کا کچھ حصہ  
ع گوش گمہ ار کردوں، پھر آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ مجھے ان گمہ خادوں سے  
ناکیوں ہے؟“

حجاج نے ہارون کو قہر کی نظروں سے دیکھا: ”اچھا بتا مگر مختصر، اجمالاً۔  
میں داستان گوئی بالکل پسند نہیں کرتا“

ہارون نے نہایت اختصار سے اپنی سرد اور فساد کی حجاج بڑے اہمک  
انتساب۔ آخر میں جلدی جلدی پلکیں جھپکا بن اور درشتی سے کہا: ”میں کہ تو  
، سرداری کا منصب کس طرح سمجھالے گا کیونکہ گمہ خادوں نالائق انسان ہے جو اپنے  
ہیں، ہنوتی، بیوی اور اولاد کسی بہر بھی قابو نہیں رکھ سکا، اب میں اپنے آپ پر  
نت بھیجتا ہوں کہ میں نے تجھ کو سمجھنے میں اتنی بڑی غلطی کیوں کی۔ میں تجھے ظاہر  
سے کی سرداری سے معزول کرتا ہوں“

اس کے بعد اس نے ایک دوسرے شخص کو سردار بنا کر روانہ کر دیا اور ہارون  
۱۔ ”اب تو یہاں سے دفنان ہوجا، میں تیرے سلاتے تک سے بچنا چاہتا ہوں،  
رج سمیت“

ہارون نے حجاج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ حجاج نے اس کے  
۲ میں تیری محسوس کر لی، بولا: ”تو عورتوں کی طرح روکیوں رہا ہے، ان  
ن کا مطلب ہے“

ہارون نے جواب دیا: ”امیر! میں اپنے دونوں بیٹوں کے سلاتے میں آپ کی نظر کر  
ہاں ہوں“

حجاج نے کہا: ”ہاں میں ان پر رحم کروں گا ان پر بھی اور تجھ پر بھی“  
ہارون فرط خفا سے سر اٹھا: ”امیر! میں آپ کے رحم و کرم کا بیشک شکریہ  
تا ہوں“

حاج نے جواب دیا: ”کیسا شکریہ؟ کیسا رحم؟ میں نے تو یہ فیصلہ کیا ہے کہ: ان دونوں نالائق اولادوں سے تیرا بیچھا چھڑا دوں۔ میں کل صبح ہی ان دونوں کو قتل کروں گا تاکہ تیرا دل ان دونوں کی طرف سے اور زیادہ سخت ہو جائے اور ان نالائقوں تیرا ہمیشہ کے لئے بیچھا چھوٹ جائے۔“

ہارون تلملا کر کھڑا ہو گیا۔ ”امیر! میں ان دونوں کا باپ ہوں میں یہ نہیں بردار کر سکتا کہ میری دونوں اولادیں میری نظروں کے سامنے قتل کر دی جائیں۔“

حاج نے سختی سے کہا: ”گو حص واپس جا اور اپنے دونوں بیٹوں صبر کر لے۔“

ہارون نے جواب دیا: ”امیر! میں ان کی طرف سے رحم کی درخواست کر رہا ہوں۔“

حاج نے کہا: ”ابھی ان پر مقدمہ چلے گا اس لئے رحم کی درخواست قبل وقت ہے۔“

ہارون نے اپنے مقصد کا زیادہ شدت سے اظہار کیا: ”امیر! میں یقین دہانی دہاؤں کہ آپ ان دونوں کو معاف کر دیں گے۔“

حاج نے سختی سے جواب دیا: ”کبھی یقین دہانی، کس کی یقین دہانی! ہر جا یہاں سے، ورنہ میں ان دونوں کے حاتمہ تجھے بھی بند کر دوں گا اور تو بھی مستحق قرار پائے گا۔“

ہارون کا دل بھرا آیا۔ ”امیر! تو مجھے قتل کر دے لیکن میرے بیٹوں کو رہا کر۔“

حاج نے کہا: ”تو ان بیٹوں کے لئے رحم کی درخواست کر رہا ہے جسے ہمیشہ تیری ہڈیٹا جوں کا باعث بنے ہوتے ہیں۔ بخدا میں ان دونوں کو ایسی عبت ناک سزا دوں گا کہ دیکھنے والے لرز جائیں، اور یوں بھی تیرا بڑا بیٹا عامر تو کسی حد تک عفو کا بھی ہے مگر تیرا چھوٹا بیٹا ابراہیم، وہ سزا ہے جسے ہمیشہ سزا سکتا کیونکہ اس کی ذرا سا سزا بھی اس کی آبروریزی اور پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے اب اس کو رہا ہونا چاہیے اب اس کو ازیتیں جھیلنا چاہئیں۔“

ہارون ہر تھر تھڑکائیے لگا۔ حاج اس کو لڑاں دترساں چھوڑ کر اندر چلا ہارون کے آنکھوں نے اندھیرا پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر روج تھا وہیں بیٹھ گیا۔

قیدی خوارج کو حجاج کے روبرو باندھ کر ڈال دیا گیا۔ امر اور منصب دار کے انتظار میں کھڑے تھے۔ رستوں سے جکڑے ہوئے خوارج کے پیچھے جلا اور ردا کھڑے تھے۔ ہار دن اور چند دوسرے منصب دار حجاج کے محل کے دربر و بالوں کھڑے اس کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ یہ لوگ اسیر خوارج کے لیے مقدمہ سے فی معافی کی یقین دہانی حاصل کر لینا چاہتے تھے۔

کچھ دیر بعد جب پہرے دار ایک دم مستعد اور حجاج و چوتہ ہو گئے تو ہار دن سرے منصب داروں کو معلوم ہو گیا کہ حجاج کہیں قریب ہی موجود ہے اور عنقریب پہنچنے والا ہے۔ کچھ دیر جب حجاج اس طرح نمودار ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ نکلے ٹاٹا ہوا محل سے نکلا رہا تھا اور اس کے داییں بائیں در و درم پیچھے چار قاضی نصیحتیں لہاں ہن سر جھکاتے چل رہے تھے۔ ایک قاضی کے داییں ہاتھ میں کاغذ برآمدے دبے ہوئے تھے اور ایسے ہی چند اور رومے ایک دوسرے قاضی کے ہاتھ میں تھے۔

ہار دن اور اس کے پاس کھڑے ہوتے منصب داروں نے حجاج کا دامن پکڑنا دیا۔ حجاج کے محافظوں نے انہیں مار مار کر دھمکا دیا۔

حجاج کسی کی پرواہ کیے بغیر خوارج کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک خدمت دار اس کے پیچھے کمری رکھ دی۔ حجاج اس پر بیٹھ گیا مگر چاروں قاضی مرتد ہو گئے۔

حجاج نے ایک خدمت گار کو حکم دیا کہ باری باری سے تمام خوارج اس کے روبرو بائیں۔ یہ کل ستائیس خوارج تھے۔

جب ایک خوارج حجاج کے روبرو کھڑا کیا گیا تو حجاج نے پوچھا: ”ادبے دین !

ہا اور دہن رہا ! بتا تیرا شہید کے بارے میں کیا خیال ہے ؟“

خوارج نے جواب دیا: ”وہ امیر المؤمنین اور امام ہیں۔“

حجاج نے پوچھا: ”اور امیر المؤمنین حضرت عبدالمک بن مروان کے بارے

کی کیا رائے ہے ؟“

خوارج نے جواب دیا: ”خدا اس کو قلیل اور رسوا کرے۔ تو نے امام ہمارے مقابلے

میں کس گمراہ کا نام لے لیا۔“

حجاج نے بائیں ہاتھ کے مددے والے قاضی سے ایک پرچہ لے لیا اور اس خاکے کے حوالے کر دیا اور کہا: اس میں تیری سزا لکھ دی گئی ہے۔ چند لمحہ صبر کر، پھر میرا جلا کر دے۔ مگر اس پر مڑے میں نکھی ہوئی سزا کے مطابق تجھے نواز دے گا۔ اس کے بعد حجاج کے مددہ و مددہ سراقیری پیش کیا گیا، حجاج نے اس سے ہم اسی قسم کے سوالات کیے۔ اس نے بھی بڑی دلیری سے ویسے ہی جوابات دیے، جو اس پیش کردہ چکا تھا۔

نہ خسی ہارون بھاگتا ہوا آیا اور اپنے بیٹوں کے پاس کھڑا ہو گیا۔ حجاج کے آگے لے ایک بار پھر زبرد کو بکمرنا شروع کر دیا۔ وہ ہارون کو یہاں سے ہٹا دینا چاہتے ہیں لیکن حجاج نے ہاتھ کے اٹھارے سے اپنے آگے میں کو منع کر دیا کہ وہ ہارون کو جہاں کہ ہے کھڑا نہ رہے۔

ہارون نے سرگرمی میں اپنے دونوں بیٹوں کو سمجھایا: ”بیٹے! خبردار جو تم نے حجاج مخالفت کی تم دونوں کو بے سوچ سمجھ کر وہی جوابات دینا جس سے وہ خوش ہو جاتے حجاج سے رحم کی امید کرنا حماقت ہے۔“

عامر نے جواب دیا: ”لیکن باوجہ ان میں جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا زینا سے بڑا گناہ ہے۔“

ہارون نے ابراہیم سے پوچھا: ”ابراہیم! کیا تو نے میری بات سنی؟“

اس نے جواب دیا: ”ہاں میں نے آپ کی باتیں سن لی ہیں۔“

ہارون نے کہا: ”چنانچہ حجاج کو اس کے سوالوں کے ویسے ہی جواب دینا چاہیے وہ خوش ہو جائے۔“

ابراہیم نے جواب دیا: ”ابا جاح! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ آپ لوگ و فائدوں کے زبیراں جھوٹ بول دینا آسان اور جانتے سمجھتے ہیں جبکہ ہمارا ایمان یہ کہ گمراہ کو صبح پر قربان کر دے۔“

ہارون چیخ مار کر مدد دیا: ”اپنے باپ کی دشمنی ادا کرو! میں جانتا ہوں دونوں بے دین اور گمراہ ہونے چکے ہوا اور میری باتیں کسی طرح بھی نہیں مانو گے اور ا صاف مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کے ساتھ میں بھی مار دیا جاؤ گا۔“

حجاج نے دوسری سے ڈالنا: ”ادریل اور خالماں بر باد ہارون! تو کیا درغل

، ادھر میرے پاس آجا دے میں تیرے بیٹوں کو بدترین سزا دے بیٹھوں گا۔  
 ہارون نے اپنے بیٹوں سے مزید کہا: "بیٹے! مناسب تو یہی ہے کہ تم دونوں وہی  
 جرم میں نہ کہلے، ویسے تمہاری مرضی؟" پھر آنکھوں سے ابل پڑنے والے آنسوؤں کو  
 دامن سے پونچھتا ہوا حجاج کے پاس چلا گیا۔

حجاج نے طنز کیا: "اوظالم انسان! جن بیٹوں کو تو شب و روز اپنے پاس رکھ کر  
 رچی بننے سے نہیں روک سکا اب انہیں چند نصیحتوں کے ذریعہ خارجیت سے منحرف  
 ن طریقہ کر دے گا؟"

ہارون نے رد کہ جواب دیا: "آپ درست کہتے ہیں، میں غلطی پر ہوں۔"  
 حجاج باری باری خارجہوں کو بلاتا اور سوال جواب کرتا رہا اور آخر میں کسی کو  
 ہاتھ کا کاغذ تھا دیتا اور کسی کو دانتیں ہاتھ والے یہاں تک کہ دامن کی نو بہت آگتی اور  
 کہ حجاج کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ ہارون نے اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اور  
 بڑی کانٹوں میں انگلیاں جھونک لیں کیونکہ وہ حجاج اور عامر کے سوال جواب کی اذیت  
 بھگنا چاہتا تھا اور ان دونوں کے چہروں کے تکلیف دہ تاثرات کو اپنی آنکھوں سے  
 دیکھنا چاہتا تھا چنا چنا اس کو سمجھ پست نہ چلا کہ حجاج اور عامر میں کیا  
 بات ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد جب ڈرنے ڈرنے آنکھیں کھولیں اور دونوں کانٹوں میں سے  
 ہاتھ نکال لیں تو اس نے دیکھا کہ عامر ادھا بڑا ہم سزا کی ہرجیاں سمجھالے دوسرے  
 جیروں کے حائفہ کھڑے ہیں۔ حجاج نے ہارون سے کہا: "او بزدل شخص! افسوس کہ تیرے  
 دل بیٹھے ہی خارجہ نکلے۔ میں نے آج پہلی بار اپنی مرضی کے خلاف عامر کو سزا دے موت  
 دی، لیکن اسے معاف بھی نہیں کیا میں نے ہر شخص کے ہاتھ میں اس کی سزا کا پرچہ  
 ادیا ہے۔ افسوس کہ ابراہیم نے مجھ سے چند گستاخیاں کیں اور میں نے اسی کو وہ سزا دے  
 کہ وہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔"

ہارون نے ڈرنے ڈرنے اجازت مانگی: "یا امیر! کیا میں ان دونوں سے اتنی  
 مل لوں گا؟"

حجاج نے جواب دیا: "ضرور ملے، میں نے تجھ کو ملنے سے منع تو نہیں کیا۔"  
 ہارون کو نہ تو کانپتا آہستہ اپنے بیٹوں کے پاس پہنچا اور عامر سے کہا:  
 مرا اپنی سزا کا پرچہ سمجھ تو دکھانا۔



عامر نے اپنا پرچہ باپ کو دے دیا۔ ہارون نے بڑی بے چینی سے اس کو کھولا  
اس میں بس ایک ہی فقرہ لکھا تھا۔ "نقطہ پندرہ دتہ ہے۔"  
ہارون کے خوشی سے آشفونکل آئے، سحر سے میں گر گیا۔  
کچھ دیر بعد سر اٹھایا اور ابراہیم سے کہنا۔ "ابراہیم! اپنا پرچہ  
دکھانا دے۔"

ابراہیم کا چہرہ اترا ہوا تھا، اس نے مردہ دلی سے اپنا پرچہ باپ کے ہاتھ پر  
دے دیا اس میں بس ایک ہی نقطہ لکھا تھا۔ "قتل۔"  
ہارون کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس کے پیروں کی  
جان نکل جاتی تھی اور پینڈلیاں بڑی طرح سنسنار ہی تھیں۔ اس نے ابراہیم کی ہمت بندھا  
"ابراہیم بیٹے! تم گھبرانا مت، میں حجاج کے پاس واپس جا رہا ہوں، میں اس کے قدموں  
میں گر کر تیرے لیے رحم کی بھیک مانگوں گا۔"  
ابراہیم نے کوفی جواب نہیں دیا۔

ہارون نے کھڑا نا ڈمگنا حجاج کے پاس پہنچا اور بڑی سرعت سے  
درخواست کی۔ "امیر رحم! میرے بچے ابراہیم پر رحم کر، اس کی موت سے ہم دونوں ہی بے  
موت مر جائیں گے۔"

حجاج نے درخت آواز میں حکم دیا۔ "ہارون! تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھ  
جا، پہلے بقیہ کے فیصلے بھی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کے بعد تیرا درخواست  
پیشو نہ کروں گا۔"

دل گرفتہ ہارون دل میں امید کی شمع جلا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ شرط غم سے دونوں  
آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہا۔

حجاج نے بے نیاز ہی سے ہارون کی طرف دیکھا اور ایک قاضی کو اشارے سے  
پاس بلا کر اس کے کان میں کہا۔ "ابا! جلد جلاؤ اور دوسرے دالوں سے کہہ دے کہ جن جن  
سزاؤں کے پرچے مل چکے ہیں ان پر فیذاً عمل کیا جائے۔"  
قاضی نے قدموں جلاؤ اور دتہ برداروں کی طرف چل دیا۔

دوسری طرف عامر اور ابراہیم ایک دوسرے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے  
تھے، عامر نے پوچھا۔ "ابراہیم! کیا بات ہے تو بہت ڈرا سہا نظر آتا ہے کیا موت  
سے ڈر گیا ہے؟"

ابراہیم واقعی سردار تھا۔ لہذا "بھائی! میں موت سے نہیں ڈرتا میں تو  
 سوچ رہا ہوں کہ میری ماں کو جب میرے قتل کی خبر پہنچے گی تو اس کا کیا حال ہو گا؟  
 علم کہ اپنی سوتیلی ماں مینرہ مینرہ کے ظلم و ستم یاد آتے اور دنیا ہی دیر کے لیے  
 نیزہ کے تمگین چہرے سے اٹھانے ایک قسم کی خوشی سی محسوس کی۔ وہ تمگین چہرہ جو تعلق  
 بن قبل از وقت ہی نظر آ رہا تھا۔

عامر نے پوچھا "پھر تو کیا چاہتا ہے؟"  
 ابراہیم نے جواب دیا "بھائی! میں اپنی ماں کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں، اپنی  
 ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

عامر ابراہیم کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کے بعد اپنا پرچہ ابراہیم  
 کو دے دیا "لے، لے، لے، لے رکھ لے، لے رکھ لے اور اپنا پرچہ مجھے دے دے تاکہ میں تیرے لیے  
 رحم کی درخواست لے کر حجاج کے پاس جاؤں گا۔"

ابراہیم نے اپنا پرچہ عامر کو دے دیا اور عامر کا پرچہ خود لے لیا۔  
 اتنی دیر میں قاضی حجاج کا حکم پہنچا چکا تھا اور دُورے بردار بڑی سرعت  
 سے اس کی تعمیل میں لگ گئے تھے۔ قاضی ایک ایک کے ہاتھ سے پرچہ لیتا اور اس میں  
 لکھی ہوئی مندرجہ ذیل باتیں لکھ کر جلا اور دُورے بردار کی طرف بٹھا دیتا جلا اور دُورے  
 امد دُورے بردار دُورے لگانے لگتا۔

یہاں تک کہ ابراہیم کی پانی بھی آگئی اور اس کا پرچا پڑھ کر اس کو دُورے بردار  
 کے حوالے کر دیا گیا۔ دُورے کی ضربات سے جو جینیں نکل رہی تھیں انہیں سن کر ہارون نے  
 آنکھیں کھول دیں۔ اس نے بیک وقت دو منظر دیکھے۔ ایک تو دُورے کی شیشپ اور دُورے  
 کے ادھر ادھر گرنے اور دُورے کے منظر اور دُورے کے جلا اور دُورے کے گرنے والے  
 کا فریضہ نہایت شہرے و حضور سے انجام دے رہا تھا۔

ہارون نے حجاج سے درخواست کی "دیا امیر! میرے بیٹے ابراہیم پر  
 رحم کیجئے۔"

حجاج نے اس کو ایک ہار سم ڈالنا "تو خاموش بیٹھا رہ۔ میں جب  
 تک سارے مقدموں کے فیصلے نہیں کر چکوں گا تیری درخواست پر غور نہیں  
 کروں گا۔"

ہارون بدحواس، افسانہ و خیراں مقتل میں پہنچا، اس وقت جلا اور اپنی تلوار

فضا میں بلند کر چکا تھا اور تلوار کے سائے میں عامر سر جھکائے کھڑا تھا۔ پلک جھپکنے پر تلوار پوری قوت سے نیچے آئی اور عامر کے سر کو تن سے جدا کر کے دوسری طرف نکل گئی۔ مادر وں بیخ مار کر گر گیا، وہ بس ایک ہی فقرہ ادا کر سکا: "اس کو کیوں مارتے ہو؟ یہ تو قتل کا مستند جیب نہیں تھا؟"

ہاں دن بے ہوش ہو گیا اور ابراہیم پندرہ دھڑکے کھا کر سسکیاں لیتا ہوا بے ہوش باپ اور بے سر بھائی کے لاشے پر بیٹھ گیا۔ وہ سسکیاں لے لے کر دودھ بانٹا اور دیکھنے والوں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ سسکیاں دھڑکنے کے ترخم سے نکل رہی ہیں یا لپٹے عظیم بھائی کے عظیم الشان ایشہ پردل کی گہرائیوں سے۔

# خانه بدوش سرفروش



یاں شان کے جنگلات کا سلسلہ مغرب سے مشرق میں ددر تک پھیلا چلا گیا تھا۔  
 نے صحرائے اعظم کوئی کامغربی کنا تھا۔ گوئی کا رنگ نار تیان شان کے چتر، صنوبر  
 درختوں کے سامنے یوں پھیلا ہوا تھا جیسے وہ اپنی آغوش رکھنے انہیں خوش  
 بہا ہو، اور تیان شان کے درخت صحرائے اعظم کوئی کو حیرت اور دہشت سے  
 رہ رہے ہوں۔ میں اپنی داستان کا آغاز تیان شان کے جنگلات سے بطور  
 ہوں کیونکہ میری زندگی نے اہم ترین موڑ یہیں لیا تھا۔ میں جھیل بیرکال کا  
 پ در در جنگ و جدال میں گزارنے والا منگول، رحم، محبت، کتابی علم اور  
 لکھنے سے قطعاً نا بلر تھا۔ جادواں نیلے آسمان کے دیوتا ان عالموں کو تباہ و  
 ما، جنہوں نے یہیں علم حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ جب تک ہم نے علم نہیں  
 تھا اپنے بڑے بڑے مسائل کسی تذبذب کے بغیر حل کر لیا کرتے تھے لیکن  
 اتنے پڑھ لکھ لیا تھا، ہمارے مزاج اور طبیعت میں تذبذب، شکوک اور  
 کسی معتدلی اور مہلک مرض کی طرح سرایت کر گئے تھے۔

قرقرم کا خاقان منگو خان میرے ماموں کا بیٹا ہے، خاقان کے تین اور بھائی  
 بلای خان، ہلا کو خان اور ادریق بوغا۔ ہمارا سب سے بڑا خاقان چنگیز خان  
 لڑی دنیا فتح کر کے دے گیا ہے کہ آج نیلے جادواں آسمان کے نیچے ہمارا کوئی  
 چنگیز خان کی عظیم روح اس کے جسم سے نکل کر ہمارے پاک کے لودھوں  
 میں حل ہو کر گئی ہے، اور ہمارے گھوڑے اس پر مجھ کے زیر سایہ بڑھیں  
 اور حکومتوں کو رد دندے پھر رہے ہیں۔ ہمارے قرقرم میں پوری دنیا کے  
 این، عیسائی کے پرستار، ہندوستان کے بدھ ست دالے، عرب کے مسلمان  
 فیو شس کے پیرو اور طاؤن مذہب کے عاشق۔ یہاں پگوڈا مسجد اور  
 قطار میں کھڑے ہیں، یہاں موسیٰ کے ماننے والے بھی ہیں، اور ان کے  
 اگر با اور مسیہ کے درمیان دکھائی دیتے ہیں، مجھے اور میرے جیسے دوسرے  
 انہی لوگوں نے علم سیکھنے پر مائل کیا، یہ ہیں اکثر و بیشتر پچھلے زمانے کی  
 باتیں بتاتے رہتے کہ ہم جنگ نہ جاتے۔ ہم جو کچھ کہتے یہ سمجھ لیتے اور کافی  
 سنے کے بعد جب وہ بات ہمارے حافظے سے نکل چکی ہوتی تو یہ لوگ پڑھ  
 دلاتے، اور ہم حیران ہو کر ان کی صحت دیکھنے لگتے اور یہی وہ چندر  
 در ترغیبات تھیں جن کے زیر اثر ہم نے علم حاصل کیا۔ اور یہیں لکھنا پڑنا

آگیا لیکن آہ! مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ جس کو یہ متمدن لوگ علم کہتے ہیں، ایک قسم جو انسان کی نفس میں اثر کر اس کے اوصاف مردانہ کو زندگی کی طرح چاٹ جاتا آہی کتابی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہمارے خاقان منگو خان نے مغرب کے ملک ہلاکو خان کے انتظام میں بننے والے خاقان کی فوج کا پانچواں حصہ ہلاکو خان کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ میں آہ ہلاکو خان کی فوج کے ایک حصے کا سربراہ ہوں۔

تین سالوں میں میں نے ادھر ذکر کیا ہے، وہ یادگار علاقہ ہے جس پر گمراہ حصوں میں دنیا کے راندہ دغا گاہ اور ٹھکراتے ہوئے نرم مزاج مذاہب آکر بس گئے تھے۔ اس چھوٹی سی سرسبز شاداب کو ہستانی بستی میں شاکہ منو مسیح ناصری کے جانی نثار، اور ایمان کے مافی کے پیر صدیوں سے مل جل کر رہ مافی کے پیر ددشی کو خدا سمجھ کر پوجتے تھے اور انہیں تادیبی سے چڑھتی، یہاں کے برنجی جیسے تھے جن کی شاکہ منی کے پرستار پرستش کرتے تھے مسیح ناصری مند ناصری کی ماں کی تصویر دہل کے سامنے جبین ساقی کرتے رہتے۔

میں اپنی پانچ ہزار فوج کے ساتھ شاہراہ ریشم سے قراقرم واپس جا رہے تھے چھکڑوں، ادنیٰ گاؤں اور گدگدوں پر لہا ہوا وہ سامان تھا جو کاشغری کے حکمرانوں نے ہمارے خاقان کو خراج میں بھجوا دیا تھا۔ چلتے چلتے جب ہم کوہ آگے نکل گئے تو ہمارے ایک ساتھی نے شمال مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ”سان!“ اس طرف دشوار گزار کوہستانی راستوں میں کہیں چند ایسی بستیاں بھی ہم ابھی تک نہیں پہنچ سکے، سنتے ہیں وہاں بڑی دولت ہے اور ان کے پاس کالیک جنگل ہلا ہوا ہے!“

طرح سے میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا: ”اگر تیرا خیال غلط ہے تو اس خنجر میری طرف اچھال دیا۔ بولا: ”تو اس خنجر سے میری زبان کاٹ لینا!“

میں نے سلطان احمد و ہزار آدمیوں کو یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا آدمیوں کے ساتھ اس طرف چل پڑا۔ سنسان پہاڑی پتھر پہلے راستوں میں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں، ان کی بازگشت سے کوہستان لہجہ دہا تھا۔ نشیب و خم اور ہموار ناہموار راستوں کو عبور کرتے ہوئے ہم بڑھتے چلے گئے ہمارے

جیسے کوہستانی سلسلوں کے اوپر جادوئی نیلا آسمان تھا اس کے نیچے پرندے  
 تھے جیسے نیلے پانی میں مچھلیاں، ہم نے اس شخص کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔  
 یہ ان نامعلوم آبادیوں تک پہنچنے کی ترغیب دی تھی۔ میری سہیلی اور انگلیاں  
 مطالبہ کر رہی تھیں، وہ بار بار مخبر کے خنجر کی ضرورت محسوس کر رہی تھیں اور  
 زبان سے، اس کی دودھ کو زبان کو ترشنے کی تحریک پیدا کر رہی تھیں۔ آخر  
 دیوار نظر آتے لگی جس کے دوسری طرف انسانی آبادی تھی گھنے درختوں کے  
 سے یہ دیوار دھبوں کی طرح دکھائی دے رہی تھی، میرے آدمیوں نے واہ میں  
 نئے دسلے درختوں کو کاٹ چھانٹ کر واسطہ بنا لیا اور ہم شہر کی تفصیل کے ساتھ میں  
 یہاں ایک دیوار پر عورتوں کے حریفوں میں لکھا ہوا تھا۔  
 ”اسن دآشتی کے جو یا حضرات کے لئے اس شہر کی آغوش کٹا دہ ہے۔ خوش

لیکن ہم وہاں اسن دآشتی لے کر نہیں گئے تھے اور نہ خوش آمدید کے طلب گار  
 تھے اپنی کمائی کو دو دیوؤں ہاتھوں سے تقام کر چلے میں تیر چڑھائے اور شہریوں کا  
 نو شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کے لوگ ہر گز کے آس پاس کھڑے ہو کر ہمیں تماشا  
 دیکھنے لگے۔ مجھے ان بے دیوؤں پر بہت غصہ آیا کہ یہ ہمارا مقابلہ کیوں نہیں کرتے۔  
 ست اور مقابلے کے شہر میں داخل ہو جانا ہمارے لئے باعث ننگ و عار تھا۔ ہم  
 سڑکوں اور مرکز کوں سے گزر کر ایک باغ کے صحن میں جا کھڑے ہوئے۔ میرے ساتھی  
 کا ہنس ہنس کر مذاق اڑا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے شہری ہمارے  
 آجھ ہو گئے سفید ٹوپیاں، سفید عباؤں اور سفید پاجامے پہنے ہوئے بے وقوف  
 کا ایک وفد ہمارے خدمت میں حاضر ہوا اور ہم سے سوال کیا کہ ”یہاں ہم کس  
 تشریف لائے ہیں؟“

میں نے جواب دیا۔ ”ہم یہاں دولت اور عورت کی غرض سے آئے ہیں ہمارے  
 فی عرصے سے عورت کو ترس رہے ہیں کیا تم لوگ اچھے میزبانوں کی طرح ہمیں  
 یہ فراہم کر دے گا؟“

وہ سب رہاؤں کی طرح آہستہ سے چمچے بہتے اور آپس میں کھسک پھسک رہے لگے  
 ”معزز صاحبان! آپ کی خدمت میں کسی نہ کسی طرح دولت کو ضرور پیش کی  
 ہے، لیکن عورتوں کا مسئلہ بڑا پیچھا ہے اس سے ہمیں معذور سمجھا جلتے۔“

میں نے وفد کو جواب دیا: ”ہم کسی چیز کی درخواست کمتر ہی کرتے ہیں  
مطالبے خود ہی پورے کر لیتے ہیں، اس لئے ہمیں ہماری بات کا ہاں یا نہیں دینا  
دیا جائے!“

دفتر میں جگ مجھے باتوں میں الجھاتے رہا اور اس درمیان ان کے کئی بہ  
ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمارے مقابلے پر آگئے۔ یہ دغا بازی ہمیں پسند نہ آئی۔  
ان پر پھر پور حملہ کر دیا۔ تیروں کی سننا ہٹ، تلواروں کی شاپ، تیزوں کی کھنا  
گھوڑوں کی ہنہٹا ہٹ نے قیامت کا منظر پیدا کر دیا تھا اور لوگوں کی چیخ پکار۔  
میر پر ہتھیار کھاتھا۔ ہم نے ان کے مردوں کو حکم دیا کہ وہ سب قطاروں میں کھڑے  
لیکن انہوں نے ہمارے حکم کی پروا کیے بغیر جنگ جاری رکھی اور ہمارے کئی آدمی  
ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا اور ہم نے ان سب کو تیزوں، تلواروں اور تیروں کی  
لے لیا اور فراسی دیہ میں ان کی بڑی آیا دی کہ جہنم داخل کر دیا یہ کام چور، کاہل،  
تسے اندر رہنے بسنے والے شہری لوگ ضرورت سے زیادہ کتابی بن چکے تھے۔

واپس آ کر تے ہوئے لوگوں نے جان کی امان کی درخواست کی۔ میں نے ان  
چیخ کر حکم دیا کہ: ”اگر امان چاہتے ہو تو آبادی کے تمام مرد اپنے ہتھیار ہمارے حوالہ  
میدان میں کھڑے ہو جائیں!“

چند گھنٹوں کے اندر ہمارے حکم کی پوری پوری تعمیل کر دی گئی، یہ تہ  
تقریباً بیس ہزار تھے۔ یعنی ہماری سپاہ سے تقریباً سات گنے زیادہ، مجھے ان کی  
تعجب اور ادراخ کا اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ لوگ کتنے جو زندگی سے کم ہی دلچسپی  
میں لے ان بزدلوں کو حکم دیا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں کو پیچھے کر پر باند  
حکم کی بھی ذرا ہی تعمیل کر دی گئی۔ آخر میں چند آدمی بچ گئے۔ جن کے ہاتھ تہ  
تھے۔ میں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ میرے آدمی  
لوٹ پڑے اور تلواروں سے ان کی گردنیں الگ کر کے لگے، وہ لوگ چیخ چیخ کر  
اپنے مردوں کا یہ حشر دیکھ کر ان کی عورتیں مدتی ہوئی ہماری طرف بڑھیں لیکن  
سوا آدمی ان کی راہ روک کر کھڑے ہو گئے اور عورتوں کو ہشت ندہ کرنے کے  
کے پیٹ بھی چاک کر دیے، میدان میں چاروں طرف خون ہی خون نظر آنے لگا  
لاٹے پھٹک رہے تھے، اور صر سے فراغت یا کمر ہم ان کے گھروں میں گھس گئے  
جو بھی ہاتھ لگا قبضے میں کیا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو یہ حکم بھی دے رکھا تھا کہ



عمر اور لڑھی عورتوں کو قتل کر دیا جائے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو قتل نہ کرے۔ میں خود وہیں سپاہیوں کے ساتھ گھروں کی تلاشی لیتا پھر رہا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت کو پکڑ لائے اور مجھے بتایا کہ ”یہ عورت تمہی ہے کہ اگر ڈر دیا جائے تو وہ اس کے عوض ایک تمہایت قیمتی نعل ہمارے حوالے“

میں نے اس عورت سے پوچھا ”جس نعل کا تو ذکر کر رہی ہے اس وقت ہے؟“

اس عورت نے جواب دیا۔ ”اے میں نے نکل لیا ہے، اور مجھے اتنی قدرت ہے کہ سب چاہوں پیٹ سے نکال لوں“

مجھے عورت کے جواب پر ہنسی آگئی۔ میں نے جواب دیا ”اور اتنی قدرت ذاتی ذمہ بھی حاصل ہے کہ تیرے پیٹ سے نعل نکال لوں“

یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی تلوار کو اوڑھ کر اٹھ کر گھبراہٹ سے پیٹ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ چرخ مار کر گر گئی۔ اس کی آنتیں باہر نکل آئیں اور سرخ سرخ خون نڈارے کی اپڑا۔ میں نے اپنے آویسوں کو حکم دیا کہ ”اس کے پیٹ میں نعل تلاش کیا“

یہ دیکھ کر مجھ پر تعجب ہوا کہ عورت جھوٹ نہیں تھی، اس کے پیٹ میں واقعی نعل موجود تھا۔ مجھ پر یہ ایک نیا انکشاف تھا کہ عورتیں نعل جیسی قیمتی چیز اپنے پیٹ چھپا سکتی ہیں، میں نے غصے میں یہ حکم جاری کیا کہ تمام عورتوں کے پیٹ چاک کر لیا کی طرح ان کے معدوں کی بھی تلاشی لی جائے کیونکہ یہاں کی عورتیں ضرورت سے بالاک معلوم ہوتی ہیں۔

میں ادھر ادھر گھومنا پھر رہا تھا۔ اسی عالم میں، میں ایک ایسے مکان میں گھس گیا کہ فضا عورتوں کی خوشبو سے معطر تھی۔ مکان تقریباً خالی تھا کئی خالی کمرے تھے۔ میں ایک بال کمرے میں داخل ہوا تو وہاں میں نے ایک عمر رسیدہ شخص کو میز کے لگے صوفے میں گمراہ دیکھا وہ غالباً درہا تھا۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر لی ہوئی تھیں اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کے آگے فرش پر تھیلی کے بل ٹپکے ہوئے تھے۔ دونوں تھیلیوں کے درمیان پیشانی کے بل سر زمین پر ٹکا تھا۔ اور دونوں پیر پتھوں کے درمیان پیر پتھ اور پیر پتھ کی ہوتی تھیں، اس پر ہمارے والے کی

آہٹ کا ڈا بھی اثر نہ ہوا، ہمارا خیال تھا کہ وہ کم بخت ہمارا استقبال کرے گا اور اپنا  
کا پتہ بتاتے گا لیکن وہ کسی گونگے مہرے کی طرح ہماری طرف سے غافل رہا۔ کہنے پر  
کا ایک ہتھوڑا رکھا ہوا تھا جس سے غالباً ہیٹل کے گھنٹے پر چوٹ لگائی جاتی تھی، یہ  
ہتھوڑا اٹھا لیا اور اسے فضا میں بلند کر کے پوری ٹوٹ سے اس بوڑھے کی دیرِ صبح  
پر رسید کیا۔ ہڈی ٹوٹ گئی اور بوڑھا مچھلی کی طرح ترپنے لگا۔ میرے آگے اس کے  
لطف اندوز ہونے لگے۔

دوسرے کمرے سے اچانک ایک لڑکی مدنی، چیختی چلائی، ہمارے کمرے  
داخل ہوئی اور اس بوڑھے کے متحرک جسم سے چمٹ کر روٹنے لگی۔ اس کی آواز  
اتر جانے والے نغمے کی طرح میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو پاؤں  
کھینچا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ ”بوڑھے کا پیٹ چاک کر دیا جلتے اور  
میں دیکھا جلتے کہ وہاں کمری تعلق تو نہیں پھیلا ہے!“

اسی دوران میرے چند آدمیوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اگر تمام عورتوں  
پیٹ چاک کر دیے گئے تو ان کی عورتوں دلی ضرورت کس طرح پوری ہوگی  
ان سے دریافت کیا۔ ”اب تک کتنی عورتوں کے پیٹ سے مل یا کوئی دوسرا  
چیز میں نکلی چکی ہیں؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اس عورت کے سوا کسی ایک کے پیٹ سے  
نہیں نکلا! میں نے انہیں حکم دیا۔“ اب جوان عورتوں اور لڑکیوں کے پیٹ نہ  
چاقیتیں! بوڑھی عورتوں اور بچوں کو البتہ زندہ نہ چھوڑا جائے؟“ میں نے یہ حکم  
”یہ کام کم سے کم وقت میں انجام دیا جائے!“

یہاں سے ہمیں کئی ہزار زندہ عورتیں اور لڑکیاں رات کو آئیں، آخر  
اپنا کام اس طرح آسان کیا کہ پوری بستی کو آگ لگا دی ہم نے یہ طریقہ اس  
کیا کہ اگر کچھ لوگ زندہ بچ گئے ہوں تو آگ ان کا کام تمام کر دے، ہمیں یہاں  
کچھ ملا۔ ہم نے ان کے مویشیوں کے ریوڑ بھی اپنے قبضے میں کئے اور انہی کے  
چھکڑوں پر ان کا سامان لاد کر شہر سے باہر نکلے، باہر نکلتے ہی میری نظر ایک بار  
کی اس عبارت پر پڑ گئی۔

”امن و آشتی کے جو یا حضرات کے لئے اس شہر کی آسودہ کشت  
خوش آمدید!“

میں نے اپنے ایک سپاہی کو جو کچھ لکھنا پڑھنا بھی جانتا تھا حکم دیا

کے نیچے لکھ دو۔  
 "امن و آشتی کا انجام دیکھنے کے حویا حضرات کے لئے اس شہرِ خودشان کے  
 کشادہ ہے، خوش آمدید۔"

میرے دو بہن ار سپاہی شاہراہِ ریشم کے کنارے ڈیرہ ڈالے ابھی تک پڑے  
 نہوں نے ہمیں دیکھتے ہی خوشی میں شور مچانا شروع کیا۔ جس شخص نے اس بستی  
 کو رہنے کی ترغیب دی تھی، وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے اپنے خیر  
 سی کا مطالبہ کیا اور یہ بھی کہا کہ مالِ دولت کی تقسیم میں وہ دوسرے حصے کا مستحق  
 بنے گا یہی بھرنی کہ ایسا ہی ہوگا وہ فکر نہ کرے۔

میں نے شاہراہِ ریشم کے کنارے دنیا کی چھت دپا میرے مشرق میں دو  
 لے پڑا ڈال دیا۔ حیدران میں وہ تک یورت ہی یورت نظر آنے لگے۔ مویشی  
 لگے اور پتھروں کے چولہوں پر انہیں سینکا بھونا جلنے لگا۔ میدان سے میری دھوئیں  
 اسبابِ دل اٹھا اور ہمارے سردوں پر ستر لانے لگا آہستہ آہستہ رات گہرا اور غلیظ ہو  
 سورج کی روشنی ماند پڑنے لگی۔

لڑکی کا نام ماریہ تھا اور جس بوڑھے کو یہ چھڑی پڑی توڑ کر میں نے قتل کر دیا  
 وہ ماریہ کا باپ تھا، ماریہ کے بقول اس کا ایک محبوب بھی تھا، جوان دنوں بیت  
 ماریہ بیت النعم اور گلگت کی زیارت کو گیا ہوا تھا۔ بیت النعم، ناجرہ کا وہ گھر جہاں ان  
 ع پیدا ہوا تھا۔ اور گلگت وہ جگہ تھی، جہاں ناصری صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔ گلگت  
 لب ہے کھو پڑیوں کا ڈھیر۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹا اور پوچھا کہ کیا وہ اب بھی یہ امید  
 ہے کہ وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکے گی۔

ماریہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے ماریہ سے وعدہ کیا کہ اگر اس کا محبوب  
 بھول بھٹکا اس کی تلاش میں قراقرم آگیا تو وہ اسے شامانوں دہنہ می پر دھتوں اور  
 روں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دے گا۔ میں نے ماریہ کو اپنی دہن بنا لیا۔  
 شادی میں خاقان منگوخان، ہلاکو خان اور ادیق بوخان نے بھی شرکت کی، قبلائی  
 چین کی ہم پر گیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ نہیں شریک ہو سکا۔ ہمارے مالوں کے  
 مائے چینی ریشم کے زیر جانے پر بھیر چکی کھالیں پیٹے ہوتے تھے، ان کے سردوں  
 ٹوپیوں منڈھی ہوئی تھیں، ان میں موٹی جڑے تھے، ان کے برے بڑے سردوں  
 سے بڑے ہال تھے، اور ٹوپوں کے نیچے سے دو گندھی ہوئی موٹی چوٹیاں

نکل کر ان کی پشت پر چڑھی ہوئی تھیں ان میں نہایت قیمتی جواہرات پہنئے ہوئے  
 ماریہ بظاہر خوش بہت تھی لیکن اس بات کا انکشاف تو بہت بعد میں ہوا کہ یہ  
 اور ہوشیار لڑکی کتنی عقل مند اور مدکار تھی، میں چاہتا ہوں کہ اب میں جو کچھ لکھنے  
 لے نہایت توجہ اور دلچسپی سے پڑھا جائے کیونکہ اس ربط اور تسلسل کے ذریعہ  
 انجام تک پہنچنے والا ہوں، ان سے درمیانی کڑیوں سے سرسری گزرنے کے بعد  
 لطف اندوز نہ ہوا جاسکے گا۔

میں نے ماریہ کو اکثر تنہائی میں مسیح ناصری کی پرستش کرتے دیکھا وہ  
 خدا کا بیٹا کہتی تھی، اس سے پہلے بھی جو ناصری قراقرم میں رہ سہے تھے، ان  
 اصرار تھا کہ مسیح ناصری خدا کا بیٹا ہے لیکن ہمیں اس کے ملنے میں تاویل تھا،  
 واقعی خدا کا بیٹا تھا تو زندگی کے آخری لمحات میں اسے اس کے باپ نے  
 چھوڑ دیا تھا۔

میں نے تھوڑا سا تو پہلے ہی پڑھ لکھ لیا تھا لیکن ماریہ نے اس میں  
 اضافہ کر دیا۔ وہ علم اور تہذیب کی اہمیت پر بے تکان بولتی رہتی۔ وہ ہیر  
 انسانی خون خرابہ اچھی چیز نہیں ہے، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں بدست کے بچہ  
 مکان تعمیر کروانے میں شہریوں کی طرح رہنے لگوں لیکن مجھے اپنے نانا چنگیز  
 ہدایت اچھی یاد تھی کہ ”ہسکے مکانات بنو کے چینیوں کی طرح حکانوں میں ہرگز نہ رہو  
 اس طرح تم گمراہ ہو جاؤ گے“ یہ اس خان اعظم کا حکم تھا جس کی عظیم روح ہمارے  
 کے نودھوں والے پرچم میں اب بھی موجود تھی ہم اس کی علم دانی بات کو تو ہر طرح  
 تیار تھے لیکن تہذیب کی بات بالکل سمجھ میں نہ آتی، ادھی تہذیب ناہی جو انسان  
 مکار اور کل (مشیق) بنا دیتی ہے۔ میں نے ماریہ کو ڈانٹ دیا اور کہا ”ماریہ! خیر  
 نے اب کبھی تہذیب کی بات کی، تہذیب ہمیں غلامی کا عادی بناتی ہے اور ہم  
 دخیلوں کے شہر کے رہنے والے لوگ تہذیب کے چکر میں غلامی کا جو اپنی گرد  
 ڈال لیں“

میں ماریہ سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب  
 کہ میں دوسری عورتوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ لیتا تھا، مجھے بعض دوسری عورتیں  
 پسند آتی تھیں لیکن ماریہ کو میری یہ حادث پسند آتی۔  
 میرا باپ ابھی زندہ تھا اور قبلائی خان کے ساتھ چین کی مہمات یا

لیکن کچھ لوگ ایک دن گھر سے کی پشت پر لا کر اس کی لاش لے آئے، جہاں باپ کسی لڑائی میں کام آگیا تھا۔ ہمارے یورٹ کے سامنے جب اس کی لاش لا کر گر گھر سے اتاری گئی تو ہماری عورتوں نے لاش پر بین کیا، اور دیر تک سر کے بال نوچتی کھسکھساتی رہیں، ہم نے باپ کی لاش وریلے کیرولان اور وریلے تو لا کے چشموں کے درمیان، برخان کلردن کو ہستان فوت واقترار کے ڈھلان میں دفن کر دی۔ یہاں صنوبر کے درختوں کے بیچ سے دھوپ چھن چھن کر آتی تھی، میرے دل پر بھی باپ کی موت کا بڑا اثر تھا لیکن ساتھ ہی ایک خوشی بھی تھی، میرے باپ نے کسی شادیاں کی تھیں، اس کی آخری شادی کما میت قبیلے کی ایک نو عمر لڑکی تاشی سے ہوئی تھی، تاشی کی عمر بیوی کے وقت مشکل سے بیس برس رہی ہوگی، یہ میری سوتیلی ماں تھی لیکن میں اس سے محبت کرتا تھا، اور اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتا تھا، باپ کی موت نے راہ ہموار کر دی تھی، تاشی ہمارے باپ کے یورٹ میں دوسری کئی ماؤں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں برخان کلردن سے سیدھا اپنے باپ کے یورٹ میں پہنچا دیاں ہلا کو خان اپنی بیوی دو فوز خاتون کے ساتھ پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ دو فوز خاتون بھی پہلے ہلا کو خان کی سوتیلی ماں تھی لیکن باپ کی موت کے بعد وہ ہلا کو کی بیوی بن گئی تھی۔

ہلا کو خان نے تسلی دیتے ہوئے مجھے بہت سمجھایا اور یہ بھی کہا کہ ایران اور بغداد کی مہم پر روانگی کی تیاری شروع کر دی جائے۔ ہلا کو خان کو خاقان اعظم منگو خان نے یہ فرمان جاری کیا تھا کہ "الموت کے شیخ الجبال کو پہلے ہمارے پاس روانہ کر دو اور اس کے سارے قلعے اور پناہ گاہیں تیار دیر باد کر دو"۔ ہلا کو خان اس مہم کی تیاری میں لگا ہوا تھا اور چونکہ میں خود بھی ہلا کو خان کی فوج سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے واقعی غلط کرنے کو میرے لئے تاشی اور ماریہ کی محبت کافی تھی۔

میں نے ہلا کو خان اپنے بھائی کے ساتھ ہی تاشی کو معہ یلین لے لیا اور کھرت آداز میں کہا "تاشی! اب تو میری ماں نہیں رہی، بلکہ آج سے میری بیوی ہے، چل میرے ساتھ میرے اپنے یورٹ میں، اور وہیں بن کر رہ"۔

ہلا کو خان نے ہنس کر تاشی سے کہا "تو پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ اچھی لگا رہی ہے، پہلے تو ایک بوڑھے کی بیوی تھی اور اب اس بوڑھے کے بیٹے کی دہن بننے والی ہے!"

یہ کہہ کر ہلا کو خان اپنی جگہ سے اٹھا اور جھوٹا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا "آغا"

خان! تو خوش قسمت ہے کہ تیرا نشان سے تو مار یہ جیسی لڑکی لایا اور اسے اپنی دلہن بنا لیا اور اب تجھے تاشی ملنے والی ہے تاشی بھی کچھ کم عقل مند لڑکی نہیں ہے۔“  
میں نے پہلی بار تاشی سے بے تکلفی کا اظہار کیا

جس کا تاشی نے بھی کرم جو شئی سے جواب دیا۔  
خاتون اور یورت میں موجود دوسرے مہمانوں نے اپنی رائیں پیدا کر لیں۔  
کیا اندر پھر تمہارے ان سب کی شراب اور گھنڈی کے دودھ سے قواضع کی تاشی شہ  
رنگ کے چمڑے کا یا جامہ اور چوڑا کوٹ پہنے ہوئے تھی، کمر گہرے نیلے رنگ کے کمر  
سے جکڑی ہوئی تھی، اور سینے پر ایک رد مال بندھا تھا۔ ہم اپنے باپ کے یورت  
کا کافی دیر تک کمر اپنے یورت کی طرف چل پڑے، تاشی میری رفاقت میں تھی اور میں اس  
حالت میں جیسے ہی اپنے یورت میں داخل ہوا مار یہ مجھے دیکھتے ہی شہ گئی۔ تامل کر کے  
اٹھ گئی اور حیرت اور غم کی لمبی جلی کیفیت میں موال کیا۔ ”یہ کیا ہے، کیا تاشی میری ماں  
نہیں ہے؟“

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”نہیں اب نہیں ہے، پہلے کبھی تھی۔“  
مار یہ نے بے چینی سے پوچھا۔ ”آغا خان! کہیں تو نشے میں تو نہیں؟“  
”نہیں بالکل ہوش و حواس میں ہوں، تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“  
مار یہ نے جواب دیا۔ ”یرے باپ کی بیوی بیوی کس طرح بن گئی؟“  
میں نے جواب دیا۔ ”باپ کی موت سے۔ تاشی یرے باپ کا درد ہے ج  
مجھے مل گیا۔“

مار یہ نے جوش میں چلا کر کہا۔ ”اسے چھوڑ دو، درد میں مدد کیا دے گی؟  
یہ نہیں بدواشت کر سکتی!“

میں نے بھی اسے ڈانٹ دیا اور گرج کر کہا۔ ”تو کیا نہیں بدواشت کر سکتی  
احق لڑکی! کیا تجھے یہ بات ابھی تک نہیں معلوم کہ میں تاشی سے عشق کرتا ہوں!“  
مار یہ نے جلی کر کہا۔ ”تم جھوٹے ہو، یہی بات تمہارے مجھ سے بھی کہی تھی، تمہارا  
دو بات درست تھی جو تم نے مجھ سے کہی تھی، یا یہ جواب تاشی کے لئے کہہ رہی ہو؟“  
میں نے جواب دیا۔ ”ہم لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ دونوں ہی باتیں  
درست ہیں!“

مار یہ نے بے مروتی سے کہا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ دونوں ہی باتیں درست

بھلا ایک دل میں دو عورتیں کس طرح بسا سکتی ہیں؟“  
مجھے اس بڑھی بکھی، شہری لڑکی کی احمقانہ بات پر ہنسی آگئی، میں نے کہا۔  
”دل میں دو تو کیا ہزار عورتیں بسا سکتی ہیں میرا دل آغا خان کا یورت ہے  
خان کا یورت، اس میں جو بھی آئے گا میرا مہمان ہوگا۔ تاشی بھی میری مہمان ہے“  
مجھے بڑھ کر اس کی پیشینواں نہ کرنا۔

لیکن ماریہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، میں غصے میں آگے بڑھا اور ماریہ کو  
ذرا سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا تاشی کے قدموں تک لے گیا اور اسے زمین پر گرما دیا ماریہ  
ناک سے خون بہہ نکلا اور کئی دامنوں کے ہل چلنے سے وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ میں  
اسے سختی سے حکم دیا۔ ”ماریہ! تیرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تو تاشی کا احترام بجا لا اور  
اسے معافی کی طلب گار ہو۔“

وہ ابھی ادھر تاشی کے آگے جھک گئی۔ اس نے تاشی سے معافی مانگی اس کے  
برمجہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”آغا خان! تم مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارا دل  
کھادیا اور شاید تمہارے ساتھ ساتھ تاشی کا بھی جیکہ ناصری نے یہ تعلیم دی ہے کہ کسی  
دل امت دکھاؤ اور جو تمہارے ایک طماخ پر سید کرے، تم اس کے آگے اپنا دوسرا  
دل بھی بڑھا دو، میں نے تمہاری حکم عددی کر کے مسیح کی حکم عددی کی، خدا مجھے  
عاف کرے!“

میں نے دیکھا اس کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر تھے، مجھے اس پر رحم  
یا ادھر میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی۔ میں نے خود بھی اس سے اپنی ذیادتا پر  
شرمندگی کا اظہار کیا۔ میں اپنی پیشینواں اور ندامت کا لڑکھڑائی آواز میں اعلان کر رہا  
تھا۔ اس وقت میری نوبت گریبان اور نوبت ارادی میرے ساتھ نہ تھیں، میری معذرت  
پر پیشینواں کا ماریہ پر ہڑا اثر ہوا۔ بولی۔ ”تم سب کو ایک نہ ایک دن یہ بات ماننی ہی پڑے  
گی کہ گناہ بھی ایک چیز ہے ضرور!“

میں نے طیش میں پوچھا۔ ”تو ہزار باد گناہ کا نام لے چکی ہے تو آج مجھے یہ  
بتا دے کہ یہ گناہ کیا چیز ہے؟“

ماریہ نے جواب دیا۔ ”ہر وہ کام جس سے ابن اللہ اور اللہ نے منع فرمایا ہے  
گناہ ہے، تمدن کو غارت کرنا اور نسل انسانی کو تہ تیغ کر دینا بدترین گناہ ہیں، ان  
افعال سے تو پرہیز کرو۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ میں خوب اچھی طرح اس تلخ حقیقت سے آگاہ  
کہ اگر مثل انسانی پر ظلم و جور نہ ڈھایا جلتے اور انسانی حلم و مروت اور خدا ترسی اور نیک  
سے کام لیا جلتے تو دنیا کا بیشتر حصہ اپنے گلے سے محکومی اور غلامی کا جو اتار پھینکے اور  
ہمارے یورپوں میں قحط اور تنگ حالی کا راج ہو جاتے۔

میں نے تاشی اور مارہ یہ کو ایک ساتھ تہیہ کی کہ دونوں مل جل کر ہو اور پھر وہ  
میں زیادہ بے شک

اور لگانٹ پیدا کرنے کی خاطر خیمے سے باہر چلا گیا۔

خاقان اعظم منگو خان نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو حکم دیا کہ وہ اپنے اردو  
کولے کو شیخ الجبال کے گھر منلوں جیسے قلعوں کا رخ کرے، اور انہیں شاہ دیر باد کرے۔  
شیخ الجبال کو اس کے پاس روانہ کر دے اور ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ اس مہم سے فار  
ہونے کے بعد ہلاکو خان مسلمانوں کے شہر بغداد میں گھسن جاتے اور پانچ سو سالہ عبا  
خلافت کو مطیع یا تباہ دیر باد کر دے، خاقان اعظم منگو خان اگر چاہتا تو یہ جنگی مہم مغربی ملک  
کی طرف بھیج دیتا اور مسلمانوں کی عباسی خلافت اور شیخ الجبال کے گھر منلوں جیسے قلعے  
ہماری پورش و یلغار سے محفوظ رہتے لیکن یہ سب کچھ ایک تہایت سوچے سمجھے منصوبہ  
کے ماتحت ہو رہا تھا۔ جب سے ہم منگو یوں نے جاوہانی نیلے آسمان کی کرم گسٹری سے  
کے بڑے بڑے تاجداروں کو خاک میں ملایا تھا اور بڑے بڑے سرکشوں کی پیشانیاں اپنے  
بلند ادنی پور توں کی چوکنٹوں پر جھکوا دی تھیں، دنیا بھر کے مذاہب کے پیشواؤں نے ان  
یا ایض (قرآن) میں مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مسیح ناصری، شاکہ مئی، موسیٰ اور  
کے پرستاروں کے علاوہ مسلمان بھی شامل تھے جو عرب کے محمد ص اور دنیا کا آخری پیغمبر  
تھے اور مکے میں خدا کے گھر کی طرف منہ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ ہم ان پر ہنسنے ہیں  
ان کا خدا کیلئے جس نے پوری دنیا میں صرف مکے میں اپنا گھر بنایا۔ اس نے ہمارے اور  
یا ایض (یہودوں کے شہر حرام) میں اپنا گھر کیوں نہ بنایا۔

مسیح ناصری کے ماننے والے بہت شاطر ہیں انہوں نے کچھ جھوٹے سچے شعبہ  
دکھا کر ہماری عورتوں کو ناصری کی طرف مائل کر دیا ہے چنانچہ خاقان اعظم منگو خان، ہلا  
خان، قبلائی، دنان اور ادیق بوغا کی ماں ناصریوں کے انداز میں عبادت کرتی ہے اور اس  
کے پاس مسیح ناصری اور اس کی ماں مریم کی کئی تصویروں موجود ہیں، جن کے رو بہ رو



رہ کر رہی ہے، اس کے علاوہ ہلا کو خان کی بیوی و دو تیز خاتون بھی عیسائی ہو چکی ہے اور  
 کے خیمے کے ساتھ ہی اس کا چیل بھی چلتا ہے، ان عورتوں کو ناصربوں نے یہ باد کمر  
 ہے کہ مسلمان ظالم اور جھوٹے ہیں اگر ان کی طاقتوں کو تباہ و برباد نہ کیا گیا تو یہ لوگ  
 نہ ایک دن پورے دنیا اور خاص کر منگلوں کے لئے عذاب جان بن جائیں گے، جب  
 یوں نے یہیں یہ یاد کرا دیا تو ہم لوگ بھی شیخ ابوال اور عباسی خلیفہ کی سرکوبی اور بیخ کنی  
 آمادہ ہو گئے۔ ہمارے ارادوں اور نئی مہم کا جب ماریہ کو علم ہوا تو وہ بھی بہت خوش  
 تھی، وہ اپنے چیل میں گئی اور تاصری کی اس تصویر کے مدبر و سیرہ ریز ہو گئی جس میں  
 مری کو دو مصلوب چوروں کے درمیان صلیب پر چڑھا دکھایا گیا ہے، اس نے پھر اپنی  
 زمیں مصلوب تاصری سے کہا: ”او مقدس مسیح! کافروں (مسلمانوں) کے مقابلے میں منگلوں  
 تینوں کو عزت و کامرانی عطا فرما“

میں نے ماریہ کو پیچھے سے پکڑ لیا اور کہا: ”ماریہ! کیا تجھے اب تک یہ بات نہیں معلوم  
 تاشی کی خادمہ کلثوم مسلمان ہے، پھر تاشی یہ کس طرح پسند کرے گی کہ اس کی خادمہ کے دین  
 ذلیل و خوار کیا جائے!“

ماریہ نے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں اپنا گریبان چاک  
 لیں ہوئی۔ ”کلثوم! سحر ہے اور سادہ لوح تاشی کو یہ کیا معلوم کہ کلثوم اپنے جادو کے زور  
 سے ایک نہ ایک دن تاشی کی جگہ خود لے لے گی اور آغا خان کلثوم پر جان چھڑکنے لگے گا  
 چونکہ آغا خان کا دل، دل نہیں خان کا یورت ہے جس میں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں  
 بن سکتی ہیں!“

میں ماریہ کے اس تازہ انکشاف سے ڈر گیا۔ میں نے سوچا کہ کلثوم اگر واقعی ساحرہ  
 ہے تو بہت بری بات ہے اور اس کا زندہ رہنا سب کے لئے بہت برا ہے لیکن اس کے  
 ساحرہ ہونے کا ثبوت لئے بغیر اسے کمرل منرا کس طرح وہی جاسکتی تھی۔ میں پریشان حال  
 بب اپنے یورت میں داخل ہوا تو تاشی کو ہناؤ سنگار کرتے دیکھا،

”تاشی! ایک بات تو بتا، کیا یہ درست ہے کہ کلثوم ساحرہ ہے اور ہم پر کوئی بھرا  
 جادو کرنے والی ہے؟“  
 ”بکواس! وہ شہر ٹر کہہ رہی تھی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر شیرنی کی طرح دھاڑ کر بولی  
 ”کہیں تم سے یہ بات ماریہ نے تو نہیں کہی جو مسلمانوں کی دشمن ہے؟“

میں نے اقرار کر لیا، تاشی اور زور سے جی۔ ”خان! تم اس لڑکی کو سمجھنے کی کوشش کرو یہ منگول بچوں کو شہری بنانا چاہتی ہے، یہ تمہیں پڑھا لکھا کر بزدل بنا دینا چاہتی ہے۔ اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ تم یور تو لکے شہر سے نکلی کو کسی ایسے شہر میں جا بسو جو اونچے اونچے پکے مکانات ہوتے ہیں، جہاں کے رہنے والے خصوصاً بولتے ہیں اور اپنے اور فعل میں مطابقت نہیں رکھتے۔“

زور عقل سن کر ماریہ بھی آہنگی اور اس نے خود پر لگاتے جانے والے الزامات کی نہیں کی، وہ تاشی کے ردِ برداشت کو کھڑی ہو گئی، اور کہنے لگی۔ ”تمہارا لانا چنگیز خان ایک بہت بڑا آدمی تھا، یہ بڑے لوگ کہیں کہیں اس اتفاق سے پیدا ہو جاتے ہیں، اس نے گھوڑا کی پشت پر بیٹھے بیٹھے جب آدمی دنیا فتح کر لی تو چین کے قتل مندوں نے اسے یہ مشہور دیا کہ خان! تم نے جن مانک کو گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر فتح کیا ہے، ان پر گھوڑے کی اسے حکومت نہیں کر سکتے۔ چنگیز خان عقل مند انسان تھا۔ اس نے داناؤں کی یہ بات ما اور قرار م سے اپنے مفتوحہ علاقوں پر حکومت کرنے لگا۔ میں یہی بات آخانی خان سے کہوں گی کہ وہ اور اس کی نسلیں ہمیشہ یورتوں میں رہیں رہ سکیں۔“

تاشی نے غصے میں ماریہ کو دھکا دے دیا۔ ماریہ شہری لڑکی اس کے دھکے کا تاب نہ لا کر دو دو تک لڑ کھڑی چلی گئی اور اس کا سر زور سے بائیں سے دھکی ہو گیا۔ نے تاشی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ یورت میں ہلاکو خان اور اس کی بیوی د خاتون داخل ہو گئے ہلاکو خان نے مجھے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور مجھے طالع کرنے لگا، اس نے ددشت لہجے میں کہا: ”آغا خان! تو تاشی کو کس طرح مار سکتا ہے؟ یہ تیری ماں رہ چکی ہے۔“ پھر اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر قاہرہ بولا: ”دودن! میری بیوی ہے لیکن بیوی مرنے سے پہلے یہ بھی میری ماں تھی۔ شب کی خلو توں اور تعیشی لمحات یاد میری بیوی ملاتی ہے۔“

دن کے اجالے میں اور فکر یہ لمحات میں یہ میری مشیر ہوتی ہے، یہ سمور کے فرش پر میرے ہ بیٹھتی ہے، اور اس کی عقل پر میرا تصرف اور اختیار ہوتا ہے، کیا تاشی کو تو نے اس کے حقوق ادا کر دیے؟“

میرے جواب دینے سے پہلے ہی تاشی نے احتجاج کیا۔ ”خان! یہ ناصری کی یا آخانی خان کو دروغی رہتی ہے، یہ کہتی ہے کہ آخانی کو شہر دن میں رہنا چاہیے یہ ہاری زہ کو جانور دن اور درندوں کی زندگی قرار دیتی ہے اور خان! تمہیں خانِ اعظم چنگیز خان کا

تو یاد ہو گا کہ ہم میں سے جو بھی بچھڑ کر کہیں اور جا بسے گا اس کا حشر اس بچھڑ جیسا ہو  
 گھرے پانی میں جا گئے یا اس تیر جیسا جو کہیں اور چلی ادبھی گھاں میں گم ہو جائے، وہ  
 دن دن لوٹ ہو جائے گا!

ہلا کو خان نے تائید میں سر ہلایا اور کمرائیت قبیلے کی دو قوز خاتون بھی تاشی کی حمایت  
 زد زور سے گردن ہلانے لگی:

مارہ یہ یورت کے ایک کونے میں بیٹھ کر رہنے لگی، پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے چیل  
 چلی گئی۔

ہلا کو خان اس لئے آیا تھا کہ وہ شیخ الجبال اور بغرا پر حملے کی تیاریاں مکمل  
 کیا تھا اور وہ انکی سے پہلے وہ خان اعظم کے مدفن پر شاندار قربانی دینا چاہتا تھا۔ دو قوز  
 زن تاشی سے باتیں کرتے لگی، باتوں کے دوران جب دو قوز خاتون کو یہ پتہ چلا کہ مارہ  
 چیل میں گئی ہوئی ہے تو وہ بھی وہیں چلی گئی اور جب واپس آئی تو اس نے پہلا سوال  
 ہم کی بابت کیا، پوچھا۔ "تاشی! کیا کلثوم مسلمان سا حرمہ ہے؟"

تاشی نے جواب دیا۔ "وہ سا حرمہ نہیں، میری کینز ہے اور مسلمان بھی!"  
 دو قوز خاتون نے حسی میں گردن ہلائی، کہنے لگی۔ "تو مسلمانوں کو نہیں جانتی، یہ  
 حرمہ ہوتے ہیں!"

ہلا کو خان، دو قوز خاتون کے زیر اثر تھا۔ اس نے بھی یہی کام کا ساتھ دیا اور مجھے  
 دیا۔ آخانی خان! کلثوم کو میرے شانوں کے روبرو پیش کر دے وہ اس سے اس کے ساتھ  
 نے کاراؤ اگوانے کی کوشش کریں گے کیونکہ اگر اس نے ہمارے یورتوں کے اندر ہی کوئی  
 نہ کر دیا تو ہم اپنی نئی مہمات میں کامیابیاں کس طرح حاصل کریں گے!"

تاشی نے جب یہ دیکھا کہ زمانے کی ہوا اس کے خلاف ہو چکی ہے تو اس نے  
 ملحت اندیشی سے غاسوشی اختیار کر لی لیکن اسے اب یہ پورا یقین ہو چکا تھا کہ ساتھ کلثوم  
 ہیں، مارہ ہے جس نے چیل میں دو قوز خاتون کو مسحور کر لیا تھا۔

تاجروں کا ایک قافلہ ہماری آبادی میں طرح طرح کی چیزیں بیچتا پھر رہا تھا ان کے  
 اس آگ جلانے کے پتھر، چینی ریشمی کپڑے منقش چمڑے، چاندی کے ہار اور خوبصورت  
 اتے ہماری دلچسپی کا باعث بن گئے تھے۔ منگول غور میں انہیں نہایت شوق سے دیکھتے  
 درجن میں خریدنے کی استطاعت تھی، اپنی پسندیدہ چیزیں خرید لیتے، یہ تاجر ہمارے  
 مدتوں کے آگے پیچھے آواز میں لگاتے گھومتے رہتے، ان سے تاشی اور مارہ نے بھی کچھ چیزیں

خمری میں مجھے ان تاجروں سے سنت نصرت تھی، کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ یہ لوگ بڑے  
دعا یار ہوتے ہیں، ہم انہیں ٹوپی کر بندوالے کہتے تھے۔

دریا تھے کیرلان اور دریائے تولاک کے درمیان برخان کلدون (کوہستان  
اقدار) کے جنوب میں خاقان اعظم منگوقان، ہلاکو خان اور اریق بوغا اپنے نو یا نور  
ترخانوں (نوجی اور غیر نوجی عہدے دار) کے ساتھ جمع ہوئے، یہیں وہ عظیم الشان  
کا درخت ہے جس کے نیچے ہمارا خان اعظم چنگیز خان نشست کی حالت میں دفن  
ہمارے سامنے حد نظر تک انسان ہی انسان پھیلے ہوئے تھے، یہ اپنے سروں کو گودنور  
ڈھانپ لیتے والی چڑے کی ٹوپوں سے چھپاتے اور سموں کے لبادوں سے سینے اور  
کو ڈھانپے ہوئے اور دھڑھلے گھگھگے پھر رہے تھے، ان کے پیاجے بھی چڑے کے  
ان میں جو اعلا منصب کے مالک تھے ان کے لبادوں میں قیمتی جوہرات وغیرہ  
ہوتے تھے۔

ایک طرف ہزاروں جانور کھڑے پڑے تھے اور ان کے بھونے جانے کا  
ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہزاروں چھکڑوں پر خراب کے ٹکے رکھے ہوئے تھے، ان  
کے باہر دھڑاکنے کے آلات دھڑک رہے تھے، جن کے تیز تیز شعلے فضا میں لہرا رہے تھے  
وہاں ایک چادر کی شکل میں اٹھ کر فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ خاقان اعظم کے پورے  
پہلو میں ایک بہت بڑا یورت آباد تھا جس میں چالیس سفید گھوڑے اور چالیس  
حسین لڑکیاں قید تھیں یہ لڑکیاں چین، منٹا اور آئہر، ایران اور الیٹے کو چک۔  
شہروں سے لائی گئی تھیں، اور انہیں خان اعظم کے مدفن پر بطور تہنہ پیش کرنا  
یہ موسم بہار کے ایام تھے، ہوا میں خوشگوار خنکی تھی، قربانی کی رسم  
گھوڑ دوڑ ہوتی تھی جس میں لڑکیوں تک نے حصہ لیا اور بارہ میل کا چکر کاٹ کر خان  
مدفن کو بوسے دیے پھر خاقان اعظم کے حکم سے ڈھول تانے بجنے لگے، میں ہلاکو  
ساتھ گھوڑوں اور حسین عورتوں کے یورت کی طرف بڑھا۔ خاقان اعظم اپنی بیوی  
تائی کے ساتھ اپنے یورت کے در پر کھڑا ہماری نگرانی کر رہا تھا۔ ہماری بیویاں بھی  
کے در پر کھڑی ادائیگی رسم کا تماشا دیکھ رہی تھیں، میں اور ہلاکو خان جب گھوڑوں  
لڑکیوں کو یورت سے لے کر باہر نکلے تو کمرہ و پیش اتنا ہجوم بڑھ چکا تھا کہ خاقان  
کے حکم پر انہیں ڈنڈے مار مار کر راستے سے ہٹانا پڑا۔ چالیس آدمی چالیس گھو  
لگائیں پکڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے، ان کے پیچھے حسین لڑکیاں تھیں، ان کے

ردمشت سے سفید پڑ گئے تھے، اور ان کے پیروں میں اتنی طاقت بھی باقی نہ رہی  
 دے وہ چل سکتیں، ہمارے طاقت ذر سپا ہی آہنیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ  
 ، شدت کرب اور خوف مرگ سے وہ بین کردہ ہی تھیں، ان کی بند لیوں اور ایڑیوں سے  
 رہا تھا، بعض چل رہے ہی تھیں اور کچھ خاموش تھیں، جو خاموش تھیں، وہ بے ہوش  
 ہیں، اگے چل کر خاقان اعظم اس کی بیوی قنوق تائی، ہلا کو خان کی بیوی دوقوہ  
 درگیری بیوی تاشی بھی ہم میں شامل ہو گئیں، ان میں خاقان اعظم اور اس کی  
 ب سے آگے تھے۔ تاشی میرے قریب آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔  
 ”مار یہ کہاں ہے؟“

تاشی نے نفرت سے جواب دیا۔ ”یورت میں!“  
 ہیں نے پوچھا۔ ”وہ کیوں نہیں آئی؟“

تاشی نے جواب دیا۔ ”وہ کہتی ہے کہ جاودانی نیلے آسمان نے منگوں کو جسم اور  
 طائے تھے، انہوں نے جسم سے تو کام لیا اور دماغ کو زنگ لگا دیا۔ لیکن بن کے  
 ہم کے ساتھ ہی دماغ بھی ہے وہ ان تقریبوں میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے؟“  
 اگر قریبی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اسی وقت مار یہ کے پاس سباتا اور اسے زیر دست  
 مار میں نے تاشی کو چپ کرنے کے لئے کہا۔ ”مار یہ کو اپنے علم اور عقل پر بہت غرور  
 اس کا بہت اچھا جواب دوں گا!“ پھر تاشی سے پوچھا۔ ”کلثوم کہاں ہے؟“  
 تاشی نے جواب دیا۔ ”یورت میں، میں اسے قصداً اپنے ساتھ نہیں لائی، جب تم  
 چلو گے تو جاودانی نیلے آسمان کی برکت سے میں تمہیں ایک بہت اچھا تماشہ  
 ن کی!“

ابھی میں کوئی جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ ہلا کو خان میرے قریب آیا اور تاشی  
 دم کی بابت سوال کیا۔ تاشی نے یہ جاننے کے بعد کہ وہ یورت میں ہے، ہلا کو خان  
 ق سے کہا۔ ”ہاں میں بات کا خیال رہے کہ وہ مسلمان ساحرہ کہیں فرار نہ ہو سکتے۔  
 ماہوں کے رد بہ رد اسے بھی پیشی کر دیا جلتے گا اور پھر کیا ہو گا یہ کوئی نہ  
 جانتا؟“

تاشی نے ہلا کو خان سے کہا۔ ”خان! کلثوم تنہا نہیں رہے گی، اس کے ساتھ  
 جان اور جائے گی!“  
 ہلا کو خان ہکا بکا رہ گیا وہ سمجھا تاشی خود بھی کلثوم کے ساتھ مر سانا چاہتی

ہے، بولا۔ ”تو کیسی مشکول نہادی ہے، جو ایک ناپاک مسلمان ساحرہ کے سا  
چاہتی ہے!“

تاشی نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ”خان! تمہاری بات کا کھل ہی ج  
دوں گی!“

خان اعظم چنگیز خان کی قبر گھلان پر واقع تھی، وہاں مول موتی لکڑیو  
گرمز نما ڈنڈے پہلے ہی سے ہتیا کر دیے گئے تھے۔

خاقان اعظم آگے بڑھا اور اس کے حکم پر یکے بعد دیگرے چالیس  
ذبح کر دیے گئے، ان گھوڑوں کا خون بہہ بہہ کر صندوق برکی ہڑ اور خان اعظم چنگیز خا  
قدروں میں جمع ہونے لگا۔ گھوڑوں کی قربانی کے بعد ہم لوگوں کے رد ہوا چالیسوا  
پیش کی گئیں۔ خاقان اعظم نے ایک لڑکی کو کھلے سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ قربانی کے ج  
طرح بدکنے لگی لیکن طاقتور خاقان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا اور کھا  
لڑکی کا جسم تھرتھرتانے لگا، اور وہ دونوں پر گھسنے لگی، اس کی دونوں آنکھیں اب  
آگیتیں، اور زبان دانٹوں کے درمیان سے نکل کر پھنس گئی۔ خاقان نے پھر کھٹکا ہوا  
خان اعظم کے پائنتی گھوڑوں کے نون کے گڑھے میں پھینک دیا۔ لڑکی کا سر خون  
میں چلا گیا اور بقیہ حصہ اوپر رہ گیا اور وہ منہ پڑی ہوئی تھی۔ خاقان اع  
پر گرمز نما ڈنڈے بردار آگے بڑھا اور ڈنڈے کی ضربوں سے اس کی میڑھ کی ہڈ  
لگا۔ چند ہی ضربوں میں وہ لڑکی بغیر ہڈیوں کے لاشے کی طرح الجلی سی ہو گئی۔

وہ لڑکیاں جنہیں قربان ہونا تھا خوف اور دہشت سے یا تو بے ہوش  
یا پھر نیم جان رہ گئیں اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں، ان سب کو یکے بعد دیگر  
طرح قربان کر دیا گیا۔ قربانیوں سے نارغ ہو کر ہم اپنے یورتوں میں واپس پہنچے اور  
خوری کا قدر شروع ہوا لوگ گوشت کے ٹکڑے حلق کے نیچے اتارے چلے جا رہے  
زیادہ سے زیادہ کھانے کی ہوس تھی جب وہ بہت زیادہ کھا چکنے کے بعد یہ سمجھ  
کہ اب چٹ میں گنجا آتش نہیں رہن تو وہ پیپ چاپ یورت سے باہر نکل جاتے اور  
کے پھر واپس آ جلتے اور پھر کھانے لگتے، کھانے کے بعد شراب کا دور چلا اور میں نے  
تک پی لی کہ اپنے قدروں سے میں خان اعظم کے مدفن سے واپس نہ جاسکا، خا  
اور ہلا کو خان کو بھی ان کے خدمت گار اپنے کانڈھوں پر ڈال کر ان کی اقامت  
تک لے گئے۔

دوسرے دن ہلا کو خان کئی شامان لے کر میرے یورت میں داخل ہوا۔ اس کی توڑ خاتون اس کے ساتھ تھی۔

ہلا کو خان نے مجھ سے پوچھا: ”کلثوم کہاں ہے، شامان آگئے ہیں، وہ اس کے ساتھ رہنے کی تصدیق یا تردید کریں گے!“

ناشی سینہ سپر ہو گئی۔ اس نے جواب دیا: ”میں نے اسے ہٹا دیا ہے۔ جب میں جانتی ہوں کہ وہ ساحرہ نہیں ہے تو خان تم شامانوں کو خواہ مخواہ لے آئے!“

ہلا کو خان نے ڈانٹ پلائی کہ: ”شیطان کی جیٹی! بکو اس بندہ کو اور اس مسلمان کو کھا کر!“

دو توڑ خاتون نے بھی بے مروتی اختیار کی، کہنے لگی: ”میری بہنیں بھی ماریے تھے ہیں کیونکہ وہ ایک چیل رکھتی ہے اور اس میں ناصری کی تصویریں ہیں جس کی دت کرتی ہے!“

میں نے بھی ناشی کو ڈانٹا اور اس سے کلثوم کا ہتہ پوچھا۔ لیکن اس موقع پر باطینان قابل داد تھا۔ وہ ذرا بھی پریشان نہ تھی۔ یورت کے بغلی حصے سے ماریہ بھی وہ اپنے چیل سے اٹھ کر آئی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، اس نے اس اور موگوار سے ہمالیوں کی طرف دیکھا اور ناشی کے پیچھے دبک کر کھڑی ہو گئی۔ ہلا کو خان اور اس اٹھ آئے ہوتے شامان، کلثوم کے منتظر تھے۔

ناشی نے مرطہ ماریہ کو تیز نظروں سے دیکھا اور کہا: ”ماریہ! تم کیا کہتی ہو؟ کیا تم نامی کہتی ہو کہ کلثوم جادوگر ہے؟“

ماریہ نے بیان بدل دیا۔ بولی: ”میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، کلثوم نہایت ہی بار آور سچی صورت ہے مجھے اس کے بارے میں ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی!“

دو توڑ خاتون نے ماریہ کو درشت لہجے میں مخاطب کیا، بول: ”جب تو نے اس نژادی کو ایک بار ساحرہ کہہ دیا تھا تو تجھے آخر دقت تک اپنے بیان سے منحرف نہیں چاہئے تھا!“

ماریہ نے افسردگی سے ناشی کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوالات کرنے لہ: ”تم کیا کہتی ہو؟ میں خاموش رہوں یا کچھ بولتا رہوں؟“

ناشی نے جواب دیا: ”میں کچھ نہیں جانتی جس طرح تو نے اسے یورتوں کے شہر

میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رکھا، اسی طرح میں چاہوں تو تجھے خواہ کر دوں!“  
 مادیرہ نے پھر خوشامدانہ درخواست کی۔ ”لوگو! سچ کہتی ہوں، ناصری نے فرما  
 جو شخص تمہیں بیگاہ میں ایک میل لے جاتے تم اس کے ساتھ خستہ پیشانی  
 میل چلے جاؤ۔ اس مقدس تول کی مدد میں میں درخواست کرتی ہوں کہ کلثوم  
 کو ہی سسرانہ دی جائے!“

لیکن ہلاکو خان کہاں ماننے والا تھا۔ وہ بدستور کلثوم کی طلبی پر مقررہ  
 تاشی نے تنگ آکر حکم دیا کہ ”کلثوم کو معزز خان کے دربار پیش کر دیا جائے یا  
 کے بعد درخواست کی۔“ خان! میں اپنے عقیدے کے اعتبار سے جو کچھ بھی  
 وہ اپنی جگہ لیکن میں تم لوگوں سے ایک درخواست کروں گی، میرا خیال ہے کہ  
 اسے مان لو گے!“

ہلاکو خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاشی کے حکم پر ایک عورت کلثوم  
 لینے چلی گئی۔

مقوڑی دیر بعد کلثوم اس طرح حاضر کی گئی کہ اس کے ساتھ ایک  
 تھا۔ سرخ و سفید، دبلا پتلا بیس بائیس سالہ نوجوان، وہ جیسے ہی سامنے آیا وہ  
 کی اس سے نظریں ملیں وہ چیخ مار کر اپنے چپیل میں چلی گئی۔ تاشی مسکرا  
 ہلاکو خان، دو خور خاتون اور میں اشرافوں کے ساتھ اس اجنبی کہ جبریت اور  
 نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے تاشی سے پوچھا۔ ”تاشی یہ کون ہے؟“

”ایک تاجر اور مادیرہ کا عاشق!“ تاشی بہت خوش تھی۔ ”یہ تاجر معلوم نہیں  
 سے مادیرہ کو تلاش کرتا ہوا آیا۔ یہ اپنا سامان بچنے کے پہلنے کئی دن سے میرے پورے  
 لگا رہا تھا، پھر میں نے اسے ادب سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ  
 زبان میں مادیرہ سے باتیں کرتا تھا کلثوم اس سے اچھی طرح واقف ہے اور اسی نے  
 بتایا کہ یہ نوجوان تاجر مادیرہ کا عاشق ہے اور مادیرہ کی تلاش میں یہاں تک ایک تا  
 رجب میں آ گیا ہے۔ میں نے اسے دھوکے سے بلا کر ایک پورے میں قید کر دیا، اور  
 میں خان سے انصاف کی طالب ہوں، اس اجنبی نے آغا فی خان کی بیوی مادیرہ کو  
 اور یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنایا کیا یا ساد چنگیزی قانون میں اس جرم  
 سزا نہیں!“



ہلا کو خان نے فکر میں ڈوب کر سر اٹھایا، اور کلثوم سے پوچھا: ”کیا تو اس اجنبی کی  
 سے واقعی واقف ہے؟“

کلثوم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا: ”خوب اچھی طرح۔“

ہلا کو خان نے کہا: ”اچھا تو اس نوجوان سے بیس ناصری کی قسم دے کر پوچھ کہ  
 واقعی ماریہ کے اعزا کی نیت سے یہاں آیا تھا؟“

کلثوم نے شامی عربی میں اس نوجوان سے باتیں کیں، ہلا کو خان اور عین انتہائی توجہ  
 بہت سمجھنے کے باوجود ان کی باتیں سنتے رہے کچھ دیر بعد کلثوم نے منگو لوں کی زبان میں  
 معزز خان! یہ نوجوان اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے!“

ہلا کو خان نے جھگڑا چکانے کے انداز میں شامانوں سے کہا: ”ذرا نرم لوگ کلثوم  
 تیرہ تو لو کہیں یہ مسلمان ساحرہ جیکے جیکے ہم پر جادو تو تمہیں کر رہی؟“

نوکلی اور سفید داڑھی والا شامان کلثوم کی طرف بڑھا اور اس سے کہنے لگا۔  
 ہاں! اگر تو سب کچھ سچ سچ بتا دے تو یہ تیرے لئے بڑی اچھی بات ہوگی، بتا، کیا تو  
 جی ساحرہ ہے؟“

کلثوم نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا: ”میں ساحرہ نہیں ہوں!“

شامان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ”تو جھوٹ بولتی ہے  
 ساحرہ ہے!“

”میں جھوٹ نہیں بولتی، میں ہرگز ساحرہ نہیں!“

ہلا کو خان نے کہا: ”کیا یہ جھوٹ ہے کہ تو نے ہمارے یورتوں پر جادو کر دیا  
 تاکہ جب ہم مسلمانوں سے جنگ کریں تو تیرا جادو مسلمانوں کا ساتھ دے اور ہم ہلاکتوں  
 کا سامنا کرنا پڑے!“

کلثوم نے دلیری سے جواب دیا: ”یہ مجھ پر سر اسر تہمت ہے، اتہام ہے!“

شامان نے چرطے کا خفیہانہ رکھ دیا اور اس میں سے ایک ہتھوڑا اور بہت سا  
 بھین نکالیں، پھر کلثوم سے کہنے لگا: ”یہ تیغیں جادو کا اثر ناکل کر دیتی ہیں اگر تو نے جادو  
 نیلے اور خوف سے اقرار نہیں کر رہی تب بھی ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اپنا علاج جاری رکھیں!“

اس کے بعد دوسرے شامانوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً آگے بڑھیں اور کلثوم کو نیچے  
 گر کر دبا لیں، اس حکم کی نذر تعمیل کی گئی کلثوم پچھاڑ دی گئی۔ بڑا شامان ہتھوڑا اور  
 چند تیغیں لے کر کلثوم کے پیروں کے پاس جا کر کھڑا ہوا۔ اس نے ایک سیخ کلثوم کے داہنے

پیر کے تلوے میں ٹھونک دی۔ کلثوم نے چیخ ماری اور زمین پر لوٹنے لگی۔ ہم لوگ بھی گھبرائے۔ اور کلثوم دھاتیں مار مار کر روئے لگی۔ جب اس نے یہ اچھی طرح یقین کر لیا کہ شاما اسے جتنا چھوڑیں گے تو اس نے زندگی کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا ہلاکو خان سے سوال کیا "خان! اگر میں سچ بول دوں تو کیا تم لوگ میری جانی بخشی کر دو گے؟"

ہلاکو خان نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کلثوم نے جھوٹ موت کہہ دیا۔ "ہاں میں بے شک ساحر ہوں اور میں نے اے یودتوں پر مباد کر دیا ہے؟"

ہلاکو خان کا چہرہ کھلا ہوا تھا اس نے سر کے ہلکے سے اشارے سے حکم دیا۔

جاری رہے؟

دوسرے شاماؤں نے کلثوم کو دل لیا اور بوڑھا نوکیلی دائرہ صافی والا شاماں اپنا ہتھوڑے کی ضرلوں سے میخیں ٹھونکتا رہا۔ اس کے دونوں پیر، دونوں ہاتھ اور ہتھوڑی۔ نیچے میخیں ٹھونک دی گئیں، کلثوم اس طرح پیچیں مار مار کر روتی، جسے ذرا ہونے والا بکریاں میاں ہیں! ابھی کلثوم کا دم بھی نہ نکلا تھا کہ ہلاکو خان نے قیاس حکم دیا۔ "کلثوم کر کے چمڑے کے پھیلے میں سی دیا جائے؟"

اسی وقت شاماؤں نے چمڑے کے پھیلے کو خوب صاف کیا اور اس میں کلثوم کو سبزی کی طرح ٹھوس دیا، پیر اور ہاتھوں کی ہڈیاں آٹے آٹے ہی تھیں، شاماؤں نے انہیں تم دیا اور پھیلے میں بند کر کے اس کا منہ سی دیا اور پھر اس پھیلے کو ہلاکو خان ہی کے حکم پر میں ڈبو دیا گیا۔ اب ہم حب کلثوم کے سمیر سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اب اجنبی تاجر، ماریہ کے عاشق کی بادی تھی، میں آگے بڑھا اور اس کے منہ ایک طمانچہ دسید کر دیا۔

میں نے پچھا "تو جوان تاجر! کیا وہ الزام جو تجھ پر لگایا گیا درست ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے ہلاکو خان سے کہا "یہ اگر واقعی ماریہ کا عاشق ہے تو اسے ہماری زبان ضرور مانی ہوگی، کیونکہ ماریہ بھی ہماری زبان جانتی ہے؟"

ہلاکو خان نے جواب دیا۔ "یہ مہذب لوگ جھوٹے بہت ہوتے ہیں اور عیار!"

میں نے اجنبی تاجر سے پھر سوال کیا "تجھ پر ماریہ کی رحمتیں نازل ہوں؟"

نسم کھا کر پیچ نہیں بول سکتا۔  
 تاجر کچھ بیچا۔ میں نے پھر کہا۔ ”کیا تو واقعی ماریر سے محبت کرتا ہے اگر یہ بات  
 ذہین نتیجہ یقین دلاتا ہوں کہ تو سب کچھ پیچ پیچ بتا دے ہم راحت گوئی پر بھیجے  
 ت بڑا انعام دیں گے۔“

تاجر نے پوچھا۔ ”کیسا انعام؟ کرن ما انعام؟ کیا تم لوگ ماریر کو میرے  
 دو گے؟“

”شاید!“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر تو ہمیں یہ یقین دلا سکے کہ تو نے جو کچھ کہا وہ پیچ  
 بد میں اپنی ماریر بھی ترے حوالے کر دوں!“

نوجوان تاجر میرے حام میں پھنس گیا۔ کہنے لگا۔ ”ماریر میری منیگر ہے سبب تنہا  
 مالٹے ہو، میں بیت المقدس گیا ہوا تھا وہاں میں نے ناصرے میں بیت اللحم کی نیابت  
 پھر حضرت مسیحؑ کی قربان گاہ گلستا چلا گیا جب وہیں آیا تو اس سانچے کا علم ہوا اس  
 ی نیابت سے آیا تھا کہ کسی طرح اسے یہاں سے نکال لے چلوں لیکن قسمت میں ناکامی  
 پھر تاشی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔ ”امین ذلیل عورت نے معلوم نہیں کس  
 سے ارادوں کو بھانپ لیا۔ آج میں گرفتار تم سب کے سامنے کھڑا اپنی موت  
 ہوں!“

ہلاکو خان نے دو تونز خاتون کی طرف دیکھا کہ وہ اس مسیحی عاشق کے لئے کیا مزا  
 لیتا ہے کیونکہ دو تونز خاتون عیسائیوں کی طرح عبادت کرتی تھی اور مسلمانوں کے مقابلے  
 یوں کے ساتھ امن کا ترجمہ سلوک رہتا تھا۔

تاشی بھی امن کی نیابت بھانپ گئی۔ اس نے احتجاج کیا۔ ”خان! اگر اس تاجر کی  
 انصاف سے کام نہ لیا گیا تو میں یہ مقدمہ خاقان اعظم کے پاس لے جاؤں گی، خاقان اعظم  
 با کی عزت آبرو کا لحاظ اور جان مال کا مالک ہے!“

دو تونز خاتون نے ناصرے سے سوال کیا۔ ”اگر تجھے چھوڑ دیا جائے تو کیا تو یہاں سے  
 کے لئے چلا جائے گا؟“

ناصری نے نفی میں گردن ہلا دی۔

تاشی نے نیا مسئلہ اٹھایا۔ بولی۔ ”ماریر کو بھی یہیں بلایا جاتے اور اس مقدمے کی

جائی اس کے سامنے ہوتی چاہیے!“

میں نے بھی تائید کی، اور جھگ کر چیل میں داخل ہو گیا۔ میں سخت مشتعل تھا اور

اگر ہلاکو خان اور دوقوز خاتون آڑے نہ کتے تو میں ماریہ کی سخت پٹائی سمجھتا۔ چنانچہ چیل میں یہ ارادہ کر کے داخل ہوا تھا کہ ماریہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لاقہ میرے پیچھے دوقوز خاتون بھی پہنچ گئی اور باؤاں بلند کہا۔ "چیل میں نہ تو کسی پر ظلم سکتا ہے نہ کسی کو سزا دی جاسکتی ہے بہتر ہے کہ ماریہ کو نرمی سے چلنے کا حکم دیا جائے میں نے غصے میں جواب دیا۔ "میں ناصری نہیں ہوں اس لئے مجھ پر یہ وار نہیں آتا کہ میں چیل کا احترام کروں!"

مجھے سے ہلاکو خان کی ٹھکانہ آواز سنائی دی۔ "خارش زدہ کتے کی اولاد! دوقوز خاتون تیری آنکھ ہے جیسا یہ کہتی ہے اس پر عمل کر۔" میں نے ماریہ کو گتہ دی سے پکڑ لیا اور کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں نے اسے "عاشق کے روبرو کھڑا کر دیا اور ہلاکو خان اس کی پیروی سے کہا۔ "خان! یہ میرا بیگ یا سا کا قانون میں بھی جانتا ہوں، اپنے مقدمے کا فیصلہ میں خود کروں گا اور سزا خود دوں گا!"

ہلاکو خان نے ماریہ کے رخسار پر طمانچہ رسید کیا اور مجھ سے کہا۔ "آخا! تیرا بڑا بھائی ہوں، کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں انصاف نہیں کر سکیں گا۔ یہ لوگوں کا شہر اور انصاف ہی کی وجہ سے تو آیا ہے کیا یہاں کا کوئی بھی شخص یہ پست کرے گا کہ کو ظلم اور نا انصافی سے تیاہ ویر باد کر دیا جاتے۔ مقدمے کا فیصلہ میں کروں گا، عمل درآمد تو کرے گا!"

ہلاکو خان کے طمانچے نے ماریہ کے گال سے خون سا چھلکا دیا۔ دوقوز خاتون سے ہمدردی تھی، آگے بڑھ کر کوشتی دی اور کہا۔ "ماریہ! تو اپنے عاشق سے کہہ کہ وہ عشق سے دستبردار ہو جاتے ہیں ناصریوں کا احترام کرتی ہوں، خان میرے بھتیجے سے نیز کو معاف کر سکتا ہے!"

لیکن ہلاکو خان نے دوقوز خاتون کو بھی ڈانٹ دیا۔ "دوقوز! کیا تو نے بات نہیں سنی کہ قراقرم حق و انصاف کی سرزمین ہے یہاں یا حاکم کے قانون کے مطابق کیا جاتے گا!"

تاشی ابھی تک غاموش تھی۔ اس نے پہلی بار دوقوز خاتون کی کھلم کھلا کی، کہنے لگی۔ "تو نے کلثوم کو بلا وجہ سا عمر قرار دے کر قتل کر دیا تو خواہ مخواہ ناصری اور مسلمانوں کی مخالفت کرتی ہے اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ جار دانی نیلا آسمان تانے لود

آقا اعظم کو مجبور کر کہ وہ بھی یا سا کو چھوڑ کر ناصری ہو جائے!“  
ہلا کو خان نے دونوں عورتوں کو ڈانٹا۔ ”تم دونوں ہماری مائیں تھیں لیکن اس  
دونوں تمہارے شوہر ہیں، اس لئے ہم تمہیں حکماً خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہیں؟“  
ہلا کو خان کے حکم سے سرتابی!! کس کی مجال تھی جو کرتا۔ دونوں چپ ہو گئیں۔  
ہلا کو خان نے مجھے حکم دیا کہ ماریہ کے عاشق ناصری کو میں جس طرح چاہوں ہلاک  
کر دوں۔

تاشی کی خوشی اور ماریہ کی غم سے جہنمیں نکل گئیں، میں نے منصف ہلا کو خان اور  
دونوں عورت سے یہ کیا ادا نہیں کھوئی کا دودھ پیش کیا۔ وہ دونوں دودھ  
دہک گئیں۔ میں نے دونوں میں نکالیں اور ناصری سے دریافت کیا کیا تجھے لڑائی  
ہے؟“

اس نے انکار میں گودن ہلا دی۔  
میں، ماریہ، تاشی اور ناصری کو ساتھ لے کر یورت سے نکلنے لگا اور ہلا کو خان سے  
تم دونوں چاہو تو باہر نکل کر اس ناصری کا حشر دیکھ سکتے ہو!“  
وہ دونوں فوراً نہیں اٹھے، میں نے ایک تلوار ناصری کے حوالے کی اور دوسری پلٹے  
لے کر اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے حکم دیا۔ ”ناصری! تیرا  
لئے میں پناہتا ہوں کہ تو مجھ سے مقابلہ کر، تیری موت تو یقینی ہے لیکن میں تجھے  
دعوت کی دعوت دیتا ہوں!“

میرا خیالی تھا کہ وہ کم ہمت ناصری تلوار نہیں اٹھائے گا لیکن اس نے تلوار اٹھا لی  
اس ریتے پر میں حیرت زدہ بھی ہوا اور میری شان بھی، وہ تلوار لے کر تاشی اور ماریہ  
، اٹھے قدموں ہٹا، میں یہ سمجھا کہ وہ دونوں کے پیچھے پناہ کی تلاش میں جا رہا ہے لیکن  
نے خلاف توقع ماریہ کو زخمی کر دیا یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ ہلا کو خان اس وقت یورت  
نکل رہا تھا اور اس نے ناصری کی کٹی ہوئی ہر گھونسا مار کر گرا دیا۔ ماریہ کا شانہ زخمی ہو گیا  
وہ بیخ مار کر یورت میں چلی گئی۔ میں بے ہوش ناصری پر مدد دے کی طرح ٹوٹ پڑا۔

اس کے بعد اس کے ناک کان کاٹ لئے، اس کی انگلیاں، اس کی زبان  
اڑائی، مجھے یہ معلوم تھا کہ وہ سراسیمہ، بلکہ بے ہوش ہے اس لئے میں اس کے جوش  
نے پر ٹپٹپٹے تھکرنے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا بلکہ ماریہ اور تاشی کو بھی دکھانا  
تھا۔

ہلا کو خان امدد تو دختاؤن داپس چلے گئے۔ میں نے امدد جا کر ماریہ  
 دوا لگائی امدد دونوں کو لے کر باہر آ گیا۔ ماریہ نے غیر معمولی صبر و ضبط کا ثبوت  
 ہوش میں آتے ہی آپہنیں بھرنے لگا اور اس کا جسم قربان کئے ہوتے جانور کی  
 مہر کئے لگا۔ ماریہ نے شاید جبر کے ساتھ یہ منظر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاید  
 عاشق کے قاتلانہ ردیے سے بہت ناخوش تھی اور تلوار کے گھاؤ نے اس کے  
 ناصری کی محبت بھاپ کی طرح اڑا دی تھی۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا بادشاہ مغرب کے کسی بغاوت نامی شہر میں  
 میں مشغول تھا۔ ہلا کو خان ایک لاکھ بیس ہزار فوج لے کر شاہراہِ یثیم سے چل پڑا  
 بیوی دد تو دختاؤن بھی اس کے ساتھ تھی امدد اس کا چھوٹا سا چیل بھی ساتھ  
 تاشی امدد ماریہ بھی میرے ساتھ تھیں، تاشی نے ماتھے کے بال مونڈ دیے تھے  
 گوندھنی تھی، ہمارے بیشتر بدمست سفید اون کے تھے، ان کا ڈھانچا لکڑیوں کا  
 سفید اون کا بدمست منڈھ دیا گیا تھا۔ یہ پیہیے دا لگاڑیوں پر ملا دیے گئے، گاڑی  
 پہنتوں کا اور میانی فاصلہ دونوں ہاتھوں کے پھیلاتے سے جو فاصلہ بنتا ہے اس  
 گنا زیادہ تھا۔ ایک ایک بدمست کو بیس یا تیس یا بیس ہیل کھینچ رہے  
 ددیاؤں کے حامل ہونے کی صورت میں اونٹ گاڑیاں بھی ساتھ رکھی گئی تھیں تا  
 کہ عبودہ کمرے کے لئے یورتوں کو اونٹ گاڑیوں پر منتقل کیا جاسکے۔ ہماری عورتیں  
 ان یورتوں میں یک جات تھیں، یورتوں کے اندر دفنی سطح پر طرح کی تصویریں  
 انگود کی ہیل، چڑیاں، گھوڑے، اونٹ اور تبت کے پاک کی تصویریں یقیناً ہمارے  
 کے دل بہلا رہی ہوں گی۔

خاقان اعظم امدد دوسرے معزز لوگ ہمیں رخصت کرنے کے لئے گھ  
 بیٹھ کر ساتھ ساتھ چلے، یہاں تک کہ ہم لوگ اپنی آرائی پر رگاہ میں داخل ہو  
 ہمیں دد ہی سے پاک کی نودھوں والا پرچم زمین پر گرنا ہوا دکھائی دیا۔ اس  
 ہمارے خاقان اعظم چنگیز خان کی عظیم سونہ (دھج) حلوں کر چکی تھی اور اس  
 اور ہر حاصل کئے بغیر ہم آگے کس طرح بڑھ سکتے تھے، خاقان اعظم، پرچم  
 پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا اس کی پیروی میں ہم لوگ بھی گھوڑوں کی پشت  
 گئے۔ خاقان اعظم نے اپنے بھائی ہلا کو خان کو حکم دیا۔ ”پرچم کو بوسہ دے“

معا کر! ہلا کو خان نے حکم کی تعمیل میں پیرچم کو بوسہ دیا اور گردن کو اکڑا کر دھاما لگی۔  
 نکی عظیم سولہ ایکہ تو ہیں دیکھ ہی ہے کیا تجھے یہ نہیں معلوم کہ ہم کہاں جا رہے  
 ہیں تیری آخری آرام گاہ کے قدموں میں چالیس گھوڑوں اور چالیس حسین  
 قربانی نہیں وحی؟

ہلا کو خان کو اپنے سوالات کے جواب دہ کار تھے، خاقان اعظم نے اردو کے تین  
 کار طلب کیے اور ہلا کو خان کو حکم دیا کہ انہیں تلوار کے ایک ایک دھار سے قتل کر دو  
 طرح کہ ان کا خون پیرچم کی جڑ کی زمین میں جذب ہونے لگے، ہلا کو خان کے لئے یہ  
 ت معمولی کام تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تینوں کو ایک کے توڑوں والے پیرچم  
 پر چڑھا دیا، اس کے بعد ان کی نظریں اوپر آسمان پر اٹھ گئیں وہ فضا میں دھڑکی  
 سی اس مائل پہاڑی چوٹیوں کے اوپر کسی چیز کو تلاش کر رہے تھے، اچانک اونٹ  
 جیسی ایک چوٹی کے سمیٹے سے ایک عقاب نمودار ہوا اور اڑتا ہوا ان کے منہ  
 اس نے ادھر ادھر خنڈا کر کئی چکر لگاتے اس کے بعد غوطہ مار کر نیچے آ گیا۔  
 لڑتے لڑتے لاٹھوں پر چھپا لیا، مارا اور مارا، بعد پیرچم پر بیٹھ کر آدمیوں کے  
 کا شمار کرنے لگا۔

خاقان اعظم نے مبارک باد دی۔ "تیری قربان قبول ہوئی ہلا کو خان! اب تو  
 مکے آخر میں قلعے تک بڑھا چلا جا اور ہاں شیخ الجبال کو قطعی معاف نہ کرنا، جب تو  
 گھوڑوں جیسے قلعے تیار دے گا اور چلے تو شیخ الجبال کو میرے پاس بھیج دیتا اور ہاں  
 دربار میں نصیر الدین طوسی نامی ایک عقل مند انجان بھی موجود ہے اسے عزت و  
 سے میرے پاس بھیج دینا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ سپاہیوں کو مار کر ان کے بچوں کی طرف سے  
 برتاؤ نہ دینی ہے، جب تو سپاہیوں کو کچل چکے تو ان کے بچوں کو بھی کچل دینا اور اس  
 پر وہ نہ کرنا کہ ان کے بہت سارے بچے پنگوڑوں میں اپنے انگوٹھے چوس رہے  
 ہیں تو تو ان کے ملک میں دذاب بن کر داخل ہوگا اور پنگوڑوں کے بچوں تک سے ہرگز  
 اور رحم دلی نہ برتنا!"

ہلا کو خان نے تعمیل حکم کا وعدہ کر لیا۔  
 اس کے بعد ہم شاہراہ ریشم سے کاشغر کی طرف روانہ ہو گئے، ہمارا سفر کوئی معمولی  
 تھا۔ ایسا لگتا جیسے بہت بڑا شہر مشرق سے مغرب میں محو سفر ہے۔ شکار کھیلنے گھوڑوں

کو اچکاتے کداتے مہینوں سفر کرتے رہے، جب ہم تیان شان سے گزر رہے تھے  
 نے مجھے بلایا۔ وہ منگولی باندھے اپنے شہر کی طرف دیکھ رہی تھی، مجھ سے کہنے  
 داپسی میں تم مجھے ایک بار میرے شہر میں لے چلو گے؟“  
 میں نے وعدے کے طور پر اپنی گردن ہلا دی۔

دندان سفر ہی ماریہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ دو توڑ فان اور ہلا کو خان نے  
 دیا کہ ”اسے سفری چیل میں لے جاؤ اور بتا سیمہ دو۔“  
 ماریہ کی بھی یہی خواہش تھی، میں نے اس پر عمل کیا ماریہ نے کہا  
 بچے کو تعلیم دلاؤں گی، علم سکھاؤں گی، اور عقل مند بنادیں گی مادر لے ایسی زندگی  
 کروں گی جو ادبچے اور بچے سچے مکانوں میں پالی جاتی ہے!“  
 میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”چپ رہ کیتا! بھلا بیٹریے کو بکری کی طرح باڑھ  
 طرح باندھ سکتی ہے تو؟“

ماریہ نے کہا۔ ”یہ میرا بچہ ہے کیا اس پر میرا کون حق نہیں؟“  
 میں نے کہا۔ ”یہ میرا بچہ ہے۔“ اس پر میرا حق مقدم ہے!“  
 تاشی نے جل کر کہا۔ ”ایک عقاب کو کیو تو کس طرح بنایا جاسکتا ہے،  
 عقاب ہی رہے گا!“

ماریہ نے بھی غصے میں جواب دیا۔ ”تو چپ رہے اولادی! تجھے کیا پتہ  
 اور عقاب کو کیو تو کس طرح بنایا جاسکتا ہے، یہ طریقہ میں جانتی ہوں!“  
 اس کے بعد ماریہ کا یہ طریقہ ہو گیا کہ جب بھی میں اس کے پاس جاتا  
 تشدد، رحم، ادنیٰ کی بے ثباتی اور تہذیب و ثقافت پر بات کرتی تو ہتی اور جھا  
 دلیلوں سے مجھے قاتل کرنے کی کوشش کرتی، میں بھی کچھ کچھ قاتل ہو جاتا لیکن  
 مجھے سنان اعظم کا قول یاد آتا کہ جو بھی اپنے قبیلے سے جدا ہو گا اس کی مدد  
 پتھر جیسی ہوگی جو گھر سے پانی میں ڈھب گیا ہوا یا پھر اسی تیر جیسی جو ملی ملی  
 نہیں گم ہو جاتے!

تاشی ہمیشہ ماریہ کی مخالفت کرتی، اسے اپنے صہرا اور اس کے رسم و  
 گہری دلچسپی تھی، ایمان میں ہر طرف ادنیٰ ادنیٰ عمارتیں اور چوڑی چوڑی سڑ  
 ماریہ بے قابو ہونے لگتی، وہ چیل میں بیٹھ کر معلوم نہیں کیسی کیسی رعایتیں  
 جس سے تاشی نے ماریہ پر یہ الزام لگا دیا کہ ماریہ بھی ساحوہ ہے اور معلوم نہیں



نے میں مشغول رہتی ہے۔ ہلاکو خان امدد قلعہ خاندن چوہدری کے عیسائی تھے، ان کے  
 کی طرف داری کہتے رہتے، میں ابھی تک نصرانیت سے فاری تھا اور میں چاہتا تھا کہ  
 مذہب کو اختیار کر کے دوسرے مذہب کے خدات کو ناراض کر لوں !  
 ہم اپنی راہ کی ازاحتوں اور آبادی کو تہہ دبلا کرتے ہوئے اصفہان تک پہنچ  
 سن کے مغرب میں، لبنان تک شیخ الجبال کے گھونسلے نالغے بکھرے ہوئے تھے،  
 ان سے شیخ الجبال کو حکم بھیجا کہ "خود کو ہمارے حوالے کر دو، ورنہ اگر تم نے جنگ کی تھانی  
 کا انجام جو کچھ ہوگا نہ تمہیں معلوم ہے نہ ہم جانتے ہیں !"  
 یہاں ہم نے جنگ سے پہلے خوب عیش کئے، یہیں ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ  
 اسلام اہل سے باز رہا، شکستیں اٹھانے کے بعد اب ہمارے زیرِ مایہ آئے کے لئے ہے  
 تھے، ورنہ سوچا اس عیسائی آئے، اور مخبریٰ اور چاسوسی کے لئے اپنی خدمات پیش  
 تے لیکن ہلاکو خان کی تمنا میں بہت زیادہ تھیں، اس نے ماریہ کے لئے ایک بوڑھا  
 ی فراہم کر دیا اور ہمیں بتایا کہ یہ ماریہ اور اس کے بچے کو ذہنی اور اخلاقی تربیت  
 دے گا !  
 اب ماریہ کی بخوشی کا کوئی شک نہ تھا۔

شیخ الجبال سے کوئی مقابلہ نہ ہوا، یہ نصیر الدین طوسی اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ  
 کی غرض سے حاضر ہوا۔ ہلاکو خان نے اسے قید کر دیا اور نصیر الدین طوسی سے خوش اخلاقی  
 پیش آیا اسے معلوم ہوا تھا کہ طوسی آسمانوں کے علوم جانتا ہے اور ان کے دالے حالات اور  
 نعات کا علم اسے پہلے ہی ہو جاتا ہے، ہلاکو خان کو یہ عجیب و غریب انسان اچھا لگا اور  
 ملنے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا اس کے بعد ہم لوگ شیخ الجبال کے گھونسلوں میں گھس  
 گئے۔ انہی میں وہ مشہور قلعہ بھی تھا جو الموت کہلاتا تھا۔ الموت دراصل آلہ الموت تھا۔  
 چونکہ وہاں کی مقامی زبان میں آرنشیمین کو اور الموت کہتے تھے جس کا مطلب تھا  
 قلاب کا نشیمین، ہلاکو خان ان عجیب و غریب قلعوں میں گھومنا پھر اسے یہ معلوم تھا کہ شیخ  
 الجبال کے فدائی بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور یہ کہیں اور کسی وقت بھی اپنے دشمن کا کام تمام  
 کر سکتے ہیں احتیاط کے طور پر مددہ اپنے گرد و پیش جنگیوں کا حفاظتی دستہ رکھا۔ یہاں کے  
 فرائض کو اپنے قبضے میں کر لیتے کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ یہاں کی پولیہ آبادیوں  
 کو تہ تیغ کر دیا جائے کیونکہ اسے خاقان اعظم نے بھی حکم دیا تھا۔ اس حکم کی تعمیل پوری

سفاکی سے ہوئی جب قتل ہونے والوں کی چیخ و پکار سے پہاڑی چٹانیں گونجیں اور بارگشت سے شور و غل میں تو اتر اور تسلسل پیدا کر دیا تو ہلاکو خان پر خوشی کا دورہ وہ دیر تک قہقہے لگاتا رہا ہم نے ماؤں سے ان کے بچے چھین لئے سادہ انہیں بھی منہ سے پکڑ کر چٹانوں پر روئے مارا ہم نے پنگوڑوں سے چھتے چلاتے تھے نیزدوں میں چھپا اٹھ لئے، ہمارے ساتھی عیش کرنے پھر رہے تھے تو ننگہ مہمان کی حسین و جمیل عورتوں کو خیر لڑکیاں ہمارے اختیار اور تصرف میں تھیں، گھوڑی کے دودھ اور شراب کی ٹوانا میں گیارہ عورتوں اور لڑکیوں کو ریوڑ کی طرح اپنے یورت میں ہٹکا لایا اور مارا اور تانہ موجودگی میں انہیں کچلتا دوندتا رہا۔ وہ دونوں ایک فاتح قوم کے خاتمہ کو اس سے کس طرح محروم کر سکتی تھیں۔ انہوں نے چہروں پر مسکراہٹ پیدا کر کے مجھے بادیشی کی۔

یہیں ہلاکو خان کے رد و بد و چند ایسے نریمان بھی پیش کئے گئے جن پر حق کا الزام لگایا گیا تھا اور جو بڑے پیلے پر جنگ کرنے کے لئے اپنے آس پاس آدمی جمعیت اکٹھا کر رہے تھے، ہلاکو خان نے ان کے لئے ایک گہرا گڑھا کھدوایا اس کے نو جوانوں کے ہاتھ پر باندھ کر گڑھے میں دھکیل دیا گیا اور ان گڑھوں کو دوبارہ بند کیا۔ پس ایک طرف خدا سا سوادخ البتہ رکھا گیا جس سے ان نو جوانوں کی چیخیں گھٹ کر نکل رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے کہیں بہت دور کچھ لوگ چیخ چلا رہے ہوں ہلاکو ہنستا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا من کی بیوی دودھ تو خاتون بھی بہت خوش تھی۔ ایسے تھانہ کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں !!!

ہلاکو خان نے ہمدان میں قیام کیا اور شیخ المجلال کو قراقرم بھیج دیا نصیر طوسی اپنی زبان آدمی اور عقل مندی سے ہلاکو خان کا وزیر اور مشیر بن گیا۔ اس نے ہلاکو کو بغیر اور حملہ کرنے کی ترغیب دی اور یہ یقین دلایا کہ یہ صرف اس کی خواہش نہیں، وزیر ابن حلقی اور بغداد کی رعایا بھی یہی چاہتی ہے، ہلاکو خان مجھے پہلی بار خدا سے آیا اس نے جواب دیا "میں مرہ دست کوئی بڑا خطرہ نہیں مول لینا چاہتا کیا عباسی خاندانی کمزور ہو گئی ہے کہ وہ ہمارے لئے سرنگوں ہو جاتے؟"

نصیر الدین طوسی نے جواب دیا۔ "مجھے آسمانوں کے فیصلے کا علم ہے وہاں خلافت عباسی کے زوال اور اختتام کا فیصلہ سادہ ہو چکا ہے اور خوش بختی اور اقبال ستاروں کی چالیں تمہارے حق میں ہیں!"

ہلا کو خان نے پوچھا۔ ”کیا تیرے خلیفہ کے ذریعہ ابن حلقی سے تعلقات ہیں؟“  
طوسی نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں اس سے خط و کتابت کر رہا ہوں!“  
ہلا کو خان نے کہا۔ ”تو ابن حلقی کو لکھ دے کہ وہ خلافت کی انوائج کم کم دے اور  
ذبح موجود ہے، اس کا بیشتر حصہ ادھر ادھر سے مرحدوں پر مدانہ کر دیا جلتے۔ اس کا ردائی  
بعد میں بغداد پر حملہ کر دیا گا!“  
طوسی نے اسی دن ابن حلقی کو ہلا کو خان کی طرف سے ایک خط لکھ دیا اور جب  
خط ہلا کو خان کو پہنچا تو وہ سنا یا جا رہا تھا میں مشیروں میں موجود تھا۔ اس نے ابن حلقی  
بکھا تھا۔

”کتاہوں کے رسیا اور مالی دولت کے دلدادہ اور حریص خلیفہ کو نزع کی کمی پر آمادہ  
رہو اس کو سمجھاؤ کہ جو جوں پر بڑی دولت خرچ ہو رہی ہے، جس کا کوئی مفائدہ نہیں،  
لافت کا رعب اور دبہ رہی اتنا زیادہ ہے کہ دشمن ابھر آکھ اٹھنے کی ہمت تک  
میں کر سکتا۔“

نزع کی تنخواہیں اب تک خزانے سے دی جا رہی تھیں، اب یہ نیا طریقہ جاری  
رہ کہ سپاہی اپنی تنخواہیں باخدا میں چلا پھر کر محاصل سے حاصل کیا کریں، اس طرح  
بہریدہ نظمی کا شکار ہو جاتے گا اور اسے قاتلہ خلیفہ کے خلاف ہو جاتے گی جس سے ہمیں  
فائدہ پہنچے گا۔

دیکھو یہ ایک بہترین موقع ہے جس سے خلافت عباسی کا خاتمہ اور خلافت  
بلویہ کا قیام عمل میں آسکتا ہے، اور ہم مصر میں خلافت فاطمیہ کے عباسیوں کے ہاتھوں خاتمہ  
یا انتقام لے سکتے ہیں، یہی تو وہ لوگ ہیں، جن کے آباؤ اجداد نے مصر کی خلافت فاطمیہ کو  
ختم کر کے عباسی خلافت میں ضم کر لیا تھا۔

اس خط و کتابت سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ بغداد پر حملہ کرنے میں ابھی دیر  
ہے، میں نے سوچا کہ چلو کچھ دن عیش ہی کر لیا جائے۔ شیخ ابوالی کی روایا میں کمی کیلئے  
عورتیں اور لڑکیاں میرے یوت میں موجود ہی تھیں، میں کچھ دنوں کے لئے یورٹ ہی میں  
بند ہو گیا اور خن خزلے اور قتل و خوات گری سے طبیعت میں جو یکساں اور بے کیفی  
سی پیدا ہو گئی تھی، اس کے اثرات کم کرنے لگا۔ تاشی تو خیر منگول تھی لیکن مجھے پہلی بار  
مادیر کے کردار کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑا۔ وہ شہری ہونے کے باوجود ہندیت صبر و شکر  
اور خندہ پیشانی سے رنگ رلیوں اور عیش کو شیروں میں شریک و معاون رہی، میں نے مارے

کا شکریہ ادا کیا کیونکہ میرے دل پر اس کے اشار اور خاموشی کا بڑا اثر تھا۔ جواب میں ماریہ نے عجیب سی بات کہی، اس نے کہا۔ ”میں نے مگرش نفس کو قابو میں کر لیا ہے تم لوگ مدد حال بیمار ی میں مبتلا ہو، اصل خوشی یہ نہیں ہے کہ تم مال دولت جمع کر کے رنگ ریاں منائے لگو بلکہ سچی خوشی اس میں ہے کہ نفس کا مگرش گھوڑا قابو میں کر لیا جائے اور دوسروں کی خوشیوں کو اپنی مرضی کے خلاف گوارا کر لیا جائے!“

میں نے پوچھا کیا تجھے اپنا نامری عاشق بھی کہی یا دانتا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”نہیں، نامری نے مجھے تیرے حوالے کر دیا ہے اب میں زندگی بھر تیری وفادار رہوں گی؟“

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”ماریہ! تو سمجھ اس لائق ہے کہ تیری بات غور سے سنی جائے اور تیرے مشورہ دل پوئل کیا جائے!“

اس نے کہا۔ ”خان! تیری طرح میں بھی دل رکھتی ہوں کیا تو میری معمولی خواہش پوری کر سکتا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بے شک! بول کیا چاہتی ہے؟“ ماریہ نے کہا۔ ”میں کھیتوں کی سیر کرنا چاہتی ہوں، باغات میں گھومنا پھرنا چاہوں، ادنیٰ ادنیٰ شاندار عمارتوں کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہوں!“

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”یہ کون سا مشکل کام ہے، آج اس شہر کی ہر چیز قبضے میں ہے!“

تاشی نے مخالفت کی، جھنجھلا کر کہنے لگی۔ ”غان! ہو مشاعرہ چالاک ماریہ تجھے فتح کرتی جا رہی ہے!“

میں نے تاشی کو ڈانٹ دیا لیکن اس وقت مجھے یہ کہاں معلوم تھا کہ صحرے رہنے والوں کو کھیتوں کے مکاتوں اور باغات کی آبی ہو جا اس نہیں آتی۔

میں ماریہ کو لئے ہوئے کھیتوں کے پاس سے گزر رہا تھا ماریہ نے ہلہاتی فہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”غان! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس اناج کی تمہیں ضرورت رہتی ہے؟“

”معلوم ہے، بہت زیادہ، لیکن ہم اناج کی جگہ جانند بھی تو کھا سکتے ہیں؟“ ماریہ نے کہا۔ ”تم ہی تو نہیں جانتے کہ اناج کے ایک دانے سے ہزار دان پیدا کئے جاسکتے ہیں، لیکن ایک جالور سے ہزار جالور نہیں پیدا کئے جاسکتے، اور پھر“

حقیقت کو کس طرح جھٹلا سکتے ہو کہ انسان ہمیشہ جانور ہی پر زندہ نہیں رہ سکتا!

میں نے بے بسی سے پوچھا: ”آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”وہ لوگ جو انسان کے لئے غلہ پیدا کرتے ہیں ہم سب کے لئے لائق احترام ہیں، ہمیں ان کا شکر گزارا اور احسان مند ہونا چاہیئے، تم ہلاکو خان سے کہا انہیں قتل کر کے وہ محسن کشی سے باز رہو!“

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ایک چھٹکا دیا اور درشت لہجے میں کہا: ”بے وقوف عودت! تو ہمیں جو کس کہہ رہی ہے کیا تجھے معلوم ہے اگر تیری باتیں ہلاکو خان سن لے تو وہ تجھے اس کی کیا سزا دے گا؟“

ماریہ نے پرستون لہجے میں جواب دیا: ”میں سترائے نہیں ڈرتی، سچ بات کہنے ہی کے لئے ہوتی ہے، پھر میں چپ کیوں رہوں!“

میں نے اسے دھکیل دیا اور کہا: ”لیکن خبردار جو تو نے یہ باتیں تاشی یا کسی اور منگول کے سامنے دہرائیں؟“

اس کے بعد میں اسے لے کر ایک ایسی عمارت میں داخل ہوا جہاں سے کچھ عجیب و غریب بو اٹھ رہی تھی، ایک لمبی داڑھی والا مسلمان ہمارے قریب آیا اور اس نے درہشت اندہ آواز میں پوچھا: ”صغیر خان یا خاتون کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے، کیا وہ یہاں علاج کی غرض سے آئے ہیں؟“

میں نے اس بوڑھے کی داڑھی مٹھی میں دبالی اور ہلکے ہلکے جھٹکے لے کر دیرانت کیا۔ ”یہاں کیا ہوتا ہے اور تم کون ہو یہاں کیا کرتے ہو؟“

بوڑھے نے اہستہ سے کہا: ”جناب میری داڑھی تو چھوڑ دیں، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اس کی بے عزتی تو نہ کریں۔“

میں داڑھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور بے عزتی وغیرہ کا صحیح مطلب نہ سمجھ سکا اور داڑھی سے بدستور کھیل رہا۔ آخر جب بوڑھے نے یہ یقین کویا کہ اس کی داڑھی یوں نہیں جھٹکی گی تو اس نے جواب دیا:

”جناب میں ایک طبیب ہوں اور یہ جگہ شفا خانہ ہے یہاں مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے، اگر وہی بوڑھیوں کے تجربے کیے جاتے ہیں!“

میں نے کہا: ”بوڑھے! کیا تیرے پاس ہر مرض کا علاج موجود ہے؟“

اس نے جواب دیا: ”موت کے سوا ہر مرض کی دوا موجود ہے اور موت کسی بھی مرض

کی شکل میں آسکتی ہے؟“

میں نے اس کی دائرہ سی چھوڑ دی اور اسے حکم دیا کہ وہ ہمیں پورا شفا خانہ گھما پھر اکرا چھی طرح دکھائے!

یہ عمارت تقریباً پچیس چھبیس کمروں پر مشتمل تھی، اس کے بیشتر کمروں میں جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کا ذخیرہ تھا۔ جن کی ملی جلی پورا دہخو شیو سے کمرے ہلکے رہتے تھے، اس نے کئی ایسی دوائیاں بھی دکھائیں جو تلوار یا تیر کے گھاؤ کے لئے پڑبہد فحشیں، یہ ہیں میں نے وہ آئے بھی دیکھے جن کے ذریعے دواؤں کا عرق کشید کیا جاتا تھا، مجھے انسان کی عقل مندری اور خوش تدبیری پر بڑا تعجب ہوا۔ مادہ یہاں کی ایک ایک چیز نہایت غدر سے دیکھ رہی تھی، لڑکھے نے ہمارے حیات مت کرنا چاہی، جسے میں نے درستی سے مسترد کر دیا۔

مادہ نے مجھ سے سوال کیا۔ ”خانی! بحیثیت مجموعی دنیا کو جتنے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ان میں دو نہایت خاص اور ممتاز ہیں، ایک وہ خانہ جس میں جنگجو رہتے ہیں، دوسرا وہ جس میں معالجین رہتے ہیں!“

میں نہیں سمجھ سکا کہ مادہ کہتا کیا سنا ہوتا ہے، میں اس غیر معمولی عاقلہ کی صحت دیکھنے لگا۔

اس نے حوالہ کیا۔ ”وہ لوگ جو انسان کو قتل کر دیتے ہیں، اور موت کے فرشتے جن کے ہمراہ رہتے ہیں، بہتر ہیں یا وہ لوگ جو مرنے والوں کو زندہ گیاں بخشتے ہیں اور انسانی مصائب اور دکھوں کا علاج کرتے ہیں، انسان کو دوبارہ زندگی بخشتے ہیں؟“

میں نے ناوازی سے جواب دیا۔ ”یہ تو کھلی بات ہے کہ زندہ گیاں چھیننے والوں سے بخشتے والے عظیم ہوتے ہیں!“

”یہی میں بھی کہتی ہوں!“ مادہ جلدی سے لونی۔ ”یہ لوگ جو درواؤں اور جڑی بوٹیوں سے ہمارا علاج کرتے ہیں تمہارے محسن ہیں انہیں قتل کو کے تم محسن کشی کر رہے ہو؟“

میں نے ایک بار پھر اس کے بال پکڑ لئے اور ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اپنے سامنے کو لیا اور پیادے کہا۔ ”شریر عورت! آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“

مادہ نے جواب دیا۔ ”صرف یہ کہ میری اولاد میں قراقرم میں نہیں رہیں گی، شہروں میں رہیں گی، پڑھیں گی، لکھیں گی اور انسانیت کی خدمتیں کریں گی!“

”لیکن میں خود قراقرم جاؤں گا!“ میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ ”میں صحرا“

یہ شہروں میں کس طرح رہ سکتا ہوں؟

ماریہ ابیدہ ہو گئی، اداس آواز میں کہنے لگی۔ "لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی کیا

میری خوشی کی خاطر قراقرم نہیں چھوڑ سکتے، میری خاطر اپنی اولاد کی خاطر؟"

میں نے جواب دیا۔ "تو مجھے درغلد ہی ہے لیکن پھر بھی اگر میں تیری اذیتری

راہ کی خاطر شہر میں رہ پڑوں تو کیا تو کبھی کبھی میرے ساتھ قراقرم آتی جاتی رہے گی؟"

ماریہ کے جواب دیا۔ "مجھے منظور ہے لیکن میں شیطان زادہ تاشی سے ڈرتی ہوں

و تمہیں درغلد کمر قراقرم واپس لے جاتے گی؟"

میں نے کہا۔ "پیر اور فضول ہے آغا خان کے دل پر کسی کی بھی حکومت نہیں

اپنے دل کا مالک ہے جو چاہے کرے۔ چاہے تو صحرائیں رہے اور چاہے تو شہر

میں رہے!"

اور اس کے بعد ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بغداد کی تسخیر کے بعد اپنے حقے

کا خزانہ اور مال و دولت لے کر ہم دونوں کسی درغلد علاقے میں چلے جائیں گے، اور

باقاعدہ شہری زندگی اختیار کر لیں گے معلوم نہیں کیوں یہ شہری لوگ مجھے واقعی محسن نظر آتے

لگے تھے لیکن صحرائی سمرت مجھ میں تدبیر اور ہچکچاہٹ پیدا کر رہی تھی۔

ابن علقمی، وزیر خلافت لباسی اور طوسی کے درمیان، عرصے تک خط و کتابت

جاری رہی اور آخر کار ابن علقمی خلافت کی فوج میں تخفیف اور طوسی کی تجاویز پر عمل درآمد

کمرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ہلا کو خان بغداد پر حملہ آندہ ہونے کے لئے پوری طرح تیار

تھا۔ اس نے احتیاطاً موصل کے حکمران بدر الدین سے متجینین اور ہتھیار طلب کئے بدل لیا

کو جو سفارت بھیجی گئی تھی اس کا سردار میں تھا۔ میں سات آدمیوں کے ساتھ وال موصل

بدر الدین کے دربار میں پہنچ گیا اور ہلا کو خان کا رقعہ اس کے حوالے کر دیا۔

میں نے زبان فی عرض کیا۔ "موصل کے حکمران! ہم غیر معمولی لوگ ہیں، جادہ دانی

نیلے آسمان کی توتیں ہمارے ساتھ ہیں، ہم تیرے ظالم اور غیر منصف خلیفہ مستعصم باللہ پر

قہر خداوندی بن کر نازل ہونے والے ہیں کیا مصلحت اندیشی اور پیش بندی کا یہ تقاضہ

نہیں ہے کہ تو متجینقوں اور ہتھیاروں سے ہماری مدد کر، تیری خدمت کا صلہ ہم یوں دیں

گے کہ ہم تجھ سے کوئی تحریک نہ کریں گے اور تو موصل پر بدستور حکمرانی کرتا رہے گا؟"

ابھی ہماری گفتگو کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی کہ لمبی لمبی عیا اور چیخے والے دربار میں

داخل ہوتے، یہ محض اتفاق تھا کہ بغداد کے خلیفہ اور ہلاکو خان کے نمائندے اپنی اپنی ضرورتیں  
لے کر والی موصول کے دربار میں ایک وقت میں داخل ہوتے۔

والی موصول پریشان ہو گیا کہ وہ ہم دونوں کو کس طرح راضی رکھے۔ پھر بھی  
اس نے احتیاطاً خلیفہ کے وفد سے دریافت کیا۔ ”آپ لوگ ہم سے کس قسم کی  
مدد کے طالب ہیں؟“

خلیفہ کے وفد کے سربراہ نے جواب دیا۔ ”ہم آپ سے مدد نہیں چاہتے بلکہ  
امیر المومنین نے ہمیں آپ کے پاس بہترین مغنیاء اور سازندوں اور رقاصوں کے  
بھیجے ہیں، امیر المومنین مطالعے کی کثرت سے غیر معمولی تکان محسوس کرنے لگے ہیں۔“  
پدرالدین نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔ ”اسلام اور مسلمانوں  
کا خدا حافظ!“

اس کے بعد پدرالدین نے خلیفہ کے لئے گانے والیوں، سازندوں اور  
رقاصات کے طائفے کا انتظام کیا اور ہمارے لئے منتخبین، اسلوبیات اور دوسرے قلد  
شکن آلات کا انتظام کر دیا۔

ہلاکو خان نے کچھ عرصے بعد عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کو چند سطری پیغام بھیج  
دیا۔ اس میں لکھا تھا۔

”تم جانتے ہو کہ دنیا کی مختلف قوموں اور حکومتوں کا چنگیز

خان کی مغل فوجوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوا، بغداد کے دروازے

خوارزمیوں اور سلجوقیوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہے ہیں پھر کیا وجہ ہے

کہ تم ہمارا استقبال نہیں کرتے اور ہم پر بغداد کے دروازے بند کر

دیے ہیں لیکن ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم بغداد میں داخل ہو کر رہیں

گے کیونکہ ہم طاقتور ہیں، دیکھو تم پر چم چنگیزی کے مقابلے پر آنے کا

نیال بھی دینی میں نہ لانا دہن تمہاری غیر نہیں، اپنی میاہ کے ہتھیار

ہمارے حوالے کر کے ہم سے معافی اور رحم کے خواستگار بنو!“

حالات سے نہ واقف اور فاضل خلیفہ نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا۔ ”اے  
مغل اپنے گھوڑوں کی غلیں نکلادیں تو ہم بھی بغداد کے دروازے ان کے لئے کھول د  
گے اور ان کا شایان شان استقبال کریں گے۔“

ہلاکو خان فطاعت میں کھڑا ہو گیا اور جو وہ خلیفہ کا یہ جواب لے کر آیا تھا



سے حقارت سے مخاطب کیا۔ کہا۔ ”تم اپنے احمق خلیفہ سے کہہ دو کہ اب تمہاری تہذیبیں  
یہ فالو نعلیں تمہارے سروں میں ٹھونک دی جائیں گی!“

اس کے بعد بغداد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ ہماری ایک لاکھ سے زائد فوج کے مقابلے  
میں خلافت کی بیس ہزار فوج صف آرا ہو گئی، اس دوران خلیفہ کا غدار وزیر ابن علقمی  
نے بارہ لاکھ خانے ملنے آیا۔ چونکہ نصیر الدین طوسی اس کا اسم عقیدہ اور ہم مذہب تھا  
س لئے وہ ہلاکو خان سے اپنے لئے امان نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دونوں  
خلافت عباسی کو ختم کر کے خلافت علویہ قائم کرنا چاہتے تھے۔

محاصرہ اور چھڑپیں پچاس دن تک جاری رہیں، اور جب ہماری افواج نے  
خلافت کی بیس ہزار فوج کو شکست دے کر منتشر کر دیا تو ایک دن ابن علقمی پھر  
ملنے آیا۔ ہلاکو خان نے پوچھا۔ ”کیا خلیفہ اب بھی جنگ جاوی رکھنا چاہتا ہے؟“  
ابن علقمی نے جواب دیا۔ ”اس کے مشیر اسے گمراہ کر رہے ہیں!“

طوسی نے مستورہ دیا۔ ”تم خلیفہ سے کہو کہ میں نے تمہارے لئے مسعود خان سلطان  
نامہ حاصل کر لیا ہے اور اگر تم مزید جنگ کیے بغیر مسعود خان کے دربار میں پہنچ جاؤ تو وہ  
تمہیں بدستور حکومت کرنے کی اجازت عطا کر دے گا!“

سادہ لوح خلیفہ اس واقعہ میں آگیا اور اپنے بیٹے کے ساتھ ہلاکو خان کے  
دربار میں حاضر ہو گیا۔

ہلاکو خان نے سردہری سے پڑھائی کی اور خلیفہ کو حکم دیا۔ ”تم اپنے ارکان  
سلطنت اور علماء کو قہراً کو بھی یہیں بلاؤ تاکہ سارے معاملات میں تمہیں ان کا تعاون  
اور مشورہ حاصل رہے!“

خلیفہ نے ایک خط کے ذریعے ان سب کو طلب کر لیا۔ جب وہ آگئے تو  
انہیں جانوروں کی طرح ذبح کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا کہ  
”تم اہل شہر کو یہ پیغام بھیج دو کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور نہتے شہر کے باہر آ جائیں“  
خلیفہ نے اس حکم کی بھی تعمیل کر دی اور نہتے شہریوں کا جسم غفر بغداد سے  
اہل بڑا، ہماری فوج نے انہیں محاصرے سے لے لیا اور قتل و خون دہری کا بازار گرم ہو  
گیا۔ پھر جمعہ کے دن، جو مسلمانوں کا مقدس دن ہے ہلاکو خان، خلیفہ کو لے کر بغداد میں  
داخل ہو گیا اور قصر خلافت میں قیام کیا، اس ہنگامہ ہمارے دیگر میں ہلاکو خان کے سوا سادی  
شخصیتیں دب گئی تھیں۔ ہلاکو خان نے دوبارہ منعقد کیا۔ جس میں نصیر الدین طوسی، ابن

علیقی، خلیفہ اس کا لڑکا اور ہم سب شریک ہوتے، دو تو زقانون اور ماریہ نے خلافت کو ترنگوں اور شمسار دیکھ کر بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ پادری اسے اپنا نجات دہندہ قرار دینے لگے۔

ہلاکو خان نے خلیفہ کے ظلم و جور کی تفصیل بتاتے ہوئے درباریوں سے پوچھا: ”بتاؤ کہ ایک غیر عادل مسلمان حکمران کے مقابلے میں عادل غیر مسلم حکمران کیا وجہ رکھتا ہے؟“ اس نے طوسی اور ابن علقی سے بطور خاص کہا: ”تم دربار میں موجود مسلمان علماء سے فتویٰ لواد مجھ سے فیصلے سے مطلع کرو۔“

دربار میں موجود علماء نے قائل اختیار کیا لیکن نصیر الدین طوسی آگے بڑھا اور یا آہ از بلند کہا: ”میں بھی ایک مسلمان عالم ہوں، اور مجھے معلوم ہے کہ غیر مسلم، عادل حکمران، غیر عادل مسلمان حکمران سے افضل ہے!“

اسی وقت ایک محضر نامہ تیار ہوا جس میں دربار کے موجود علماء نے طوسی کے فتوے کی تائید میں اپنے اپنے دستخط کروئے، خلیفہ خاموشی اور بے بسی سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔

ہلاکو خان نے خلیفہ سے کہا: ”ہم تمہارے مہمان ہیں، ہمارے لئے کچھ حاضر کرو۔“

خلیفہ پر اتنی رہشت طاری تھی کہ وہ محل کی کنجیاں تلاش کرنے لگا لیکن وہ نہیں ملیں، عجورائے تانے توڑ دیے گئے اور خلیفہ نے دہ ہزار نفیس پوشاکیں، ہزاروں دینار اور سونے کے زیورات ہلاکو خان کی خدمت میں پیش کئے۔

ہلاکو خان نے تحقیر آمیز انداز میں ان چیزوں پر نظر ڈالی اور کہا: ”یہ چیزیں اگر تم نہ دو تب بھی ہماری ہی ہیں، میں تو ان خزانوں کا پتہ پوچھ رہا ہوں جنہیں تم نے چھپ رکھا ہے۔“

ہلاکو خان نے خلیفہ کی پیش کردہ چیزیں میری طرف بڑھا دیں، کہا: ”انہیں تقسیم کر لو۔“

خلیفہ نے چھپے ہوئے خزانوں کا پتہ بتا دیا جو زمین میں دفن تھے۔ آئیں اسی وقت کھود کر نکال لیا گیا۔

خلیفہ کو محل میں قید کر دیا گیا اور کئی دن تک بھوکا رکھا گیا۔ میں دینار پوشاکیں اور زیورات لے کر جب ماریہ کے پاس پہنچی تو وہ بہت

ہوتی، اس نے کہا۔ ”ابھی تو اوپر بھی بہت کچھ ملے گا!“ پھر ہاتھوں کی طرح چینی۔ اس  
 اتھار اور ہم دونوں کے بچوں کا شاندار مستقبل تعمیر ہوگا۔  
 ناشی، ماریہ کا مفہوم نہ سمجھ سکی، کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں ہم دونوں کی  
 بن دھکتی رہی۔

ہلاکو خان، خلیفہ کی سزا کے سلسلے میں بہت متامل تھا، اسے بعض مسلمانوں نے  
 دکرار کھا تھا کہ خلیفہ مسلمانوں کی مقدس ہستی ہے اگر اس کا خون بہا تو قیامت برپا  
 تے گی۔ یحییٰ بن عمر الدین طوسی اور ابن علقمی نے اس دہم کی تردید کر دی طوسی نے  
 فان کو یقین دلایا کہ ”یہ خیال غلط ہے کیونکہ خلیفہ علیؑ سے بڑا آدمی نہیں ہے مہم  
 نے خون نے قیامت برپا نہیں کی تو خلیفہ کی کیا حیثیت ہے؟“  
 ہلاکو خان نے پوچھا ”پھر ہمیں خلیفہ کو کس طرح ہلاک کرنا چاہیے؟“  
 طوسی نے جواب دیا ”اسے مذبح میں لپیٹ کر محل کے ستون سے باندھ  
 جاتے اور چپا ہی لاتیں مار مار کر اسے ہلاک کر دیں“ اس طرح خلیفہ کا خون بھی نہ  
 گرا اور یہ اپنے انجام کو بھی پہنچ جاتے گا!

ہلاکو خان نے خلیفہ کو بھوک سے بے حال خلیفہ کو لپٹے دو برو  
 کیا، خلیفہ نے خلیفہ آواز میں کہا۔ ”میں بھوکا ہوں۔ کھانا، کھانا!“  
 ہلاکو خان نے چند آدمیوں کو مخصوص لب و لہجے میں حکم دیا۔ ”خلیفہ کی  
 مسیدہ غذا فراہم کی جائے!“

غذا سی ویر میں بھی سر بندہ خوان خلیفہ کے سامنے رکھ دیئے گئے خلیفہ نے  
 میٹ کر خوان پوش اٹھا کر ایک طرف پھینکے اور طشت میں ہاتھ ڈال دیا لیکن وہاں  
 مانے کی جگہ ہرے جڑا ہرات رکھے ہوئے تھے۔  
 ہلاکو خان نے ظالمانہ انداز میں حکم دیا۔ ”انہیں کھاؤ!“

خلیفہ نے بے بسی سے کہا۔ ”انہیں میں کس طرح کھا سکتا ہوں؟“  
 ہلاکو خان نے طنزاً کہا۔ ”یہ دوقوف حکمران! جس شے کو تو کھا نہیں سکتا۔ اس  
 لذخیرہ کیوں کیا کیا تو اس سے ایک شاندار فروغ نہیں تیار کر سکتا تھا جو تیری بعد دنیا کی  
 در تمام مسلمانوں کی حفاظت کا کام انجام دیتی۔“

خلیفہ کے ہوش و حواس بجا نہ تھے، جواب دیا۔ ”خدا کی مرضی ہی یہ تھی کہ  
 میں اس مال کو پہنچوں!“

ہلا کوٹان نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ "خدا کی مرضی کا بقیہ حصہ بھی ہم پہنچایا جلتے۔"

مستعصم باللہ کو نمرے میں پیٹ دیا گیا بے بس اور بھوکے پیاسے خلیفہ معمولی سی مزارعت کی، لیکن طاقتور آدمیوں نے اسے بے بس کر دیا وہ جینی چلایا لیکن نہ گولائی میں پیٹ دیا گیا اور خلیفہ کا پورا جسم اس میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد ابن علقمہ آگے بڑھا اور اپنی نگرانی میں اس نمرے کو ستون لے بندھوا دیا۔ نصیر الدین طوسی ابن علقمی سے کہا۔ "بسم اللہ، بڑھو اور لاٹوں کی ضربات سے اس کا کام تمام کر دو۔" ابن علقمی ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اچھل اچھل کر لائیں ماننا شروع کر دیں، خلیفہ کا بیٹھا یہ عبرت ناک منظر کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے فرش پر بیٹھ گیا جب ابن علقمی تنک گیا تو چند سپاہیوں کو حکم ملا کہ وہ اپنی طاقتور ضربات سے خلیفہ کا کام تمام کر دیں، کئی کئی سپاہی باری باری آگے بڑھتے اور نمرے کو لاٹوں کی ضربات پہن کر واپس آجاتے۔ سبب ہلا کوٹان کو یہ یقین ہو گیا کہ خلیفہ مر چکا ہو گا تو اس نے نمرے سے خلیفہ کی لاش باہر نکلوائی، اس وقت خلیفہ سسک سسک رہا تھا۔

ہلا کوٹان کے حکم پر ہمارے طاقتور اور ذہین سپاہی آگے بڑھے اور سوتے خلیفہ کی پیروں سے رو نہ ڈالا، خلیفہ کی شکل مسخ ہو گئی۔ اور دونوں رخسار ہاتھوں سے گڑھ کر آپس میں پیوست ہو گئے، واپس لوٹ کر لوٹ کر لوٹ گئے اور پسلیاں کٹی کٹی چم لے لوٹ کر گوشت میں اتر گئیں۔

بغداد کے گلی کوچوں میں قتل عام جاری تھا۔ میں سنا بھگتا گیا رہ عورتیں اور لڑکیوں کو خوب اچھی طرح مار چکا تھا اس لئے اب ان کا رکھنا فضول تھا۔ میں نے آہ گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور بغداد کی افراتفری سے دس نو خیز اور حسین لڑکیاں پیچ ہانک لایا۔ میں نے بغداد کی لوٹ مار میں کافی دولت کمائی، قتل ہونے والوں کی لاشیں دجلہ میں پھینک دی گئیں، جس سے دریا کا پانی سرخ ہو گیا۔ اس کے بعد ہلا کوٹان خلافت کے کتب خانے کو بھی دریا برد کر دیا یہ اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اس سے دریا کا پانی گہرا اور کتابوں کی سپاہی سے دجلہ کا پانی کالا ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں بغداد کی خلافت میں آٹھ لاکھ مسلمان قتل ہوئے!

ماریہ عیسائی ہونے کے باوجود اس خون خرابے سے بہت بددل ہوئی، اس نے مجھے اس پر آمادہ کرنا سنا ہا کہ میں کسی دور دراز علاقے میں نکل چلوں جہاں

شہتی کی زندگی گزاری جاتے اور اولاد کو باقاعدہ تعلیم و تربیت دی جاتے ہیں۔ تھوڑا  
 مدت تو پھر کچھ چکا تھا۔ ماریہ مزید پڑھانا چاہتی تھی، میرا دل ماریہ کی بات مانتے ہیں  
 زبذب تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے حصے کی دولت قبضے میں کی اور ماریہ کے بے  
 ادھر پر پاس کے ساتھ بیت المقدس چلا گیا۔ دیاں میں ناصر کے بیت المقدس پہنچا، جہاں  
 جمع پیدا ہوئے تھے اور مسیح کی ماں مریم اور مریم کے منگے یوسف نجاران کی پسرورشاہ  
 گہرا وقت کرتے رہے تھے۔ پھر ہم لوگ گھلتا پہنچے جہاں مسیح کو تیس سال کی عمر میں مصلوب  
 لیا گیا تھا، یہاں ماریہ پھوٹ پھوٹ کر دھوئی۔

یہاں میں نے ماریہ کو ایک گرجے میں چھوڑ دیا اور بہت ساری دولت اس  
 کے حوالے کر دی۔ میں نے اس کا بچہ بھی اس کے پاس بٹھ دیا۔ ایک دوسرا بچہ بھی  
 آنے والا تھا، میں نے ماریہ سے کہا: "اگر لڑکا ہوگا تو اسے سیاہی بتانا کیونکہ پہلے لڑکے  
 کی تعلیم و تربیت تیری مرضی کے مطابق ہوگی اور دوسرے کی میری مرضی کے مطابق۔ لیکن اگر  
 لڑکی ہو تو اس کی تو مالک ہوگی!"

ماریہ روتے لگی، بولی: "میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے پاس رہو  
 گے لیکن تم پھر اسی صحران میں واپس چلا رہے ہو، جہاں انسان جانوروں کی طرح رہتے  
 ہیں!"

میں نے جبر سے کام لیا اور نہ عام طالات میں، میں اس کی ناک پر حرکت کر سیکر  
 دیتا۔ میں نے کہا: "ماریہ! اس وقت تو گرجے میں ہے اگر ماہر ہوئی تو میں ایسی سزا دیتا کہ  
 تو زندگی بھر یاد رکھتی!"

ماریہ نے کہا: "آغا خان! تم میرے پاس رک جاؤ اور اتنے ظالم  
 نہ بنو!"

میں نے ہنس کر جواب دیا: "میں صحران میں چھوڑ سکتا۔ تو یہیں رہ، میں پھر آؤں  
 گا۔ اپنی اولادوں سے ملنے اور یہ دیکھنے کہ وہ کیسی نکلتی ہیں اور دنیا میں کیا نام پیدا  
 کرتی ہیں!"

میں ماریہ کو چھوڑ کر واپس چلا آیا۔ تاشی نے ماریہ کی بابت پوچھا تو میں نے یہی  
 جواب دیا کہ وہ جس ماحول کی تھی اسے وہیں پہنچا آیا!  
 تاش کے ملتے یہ بڑی اچھی خبر تھی، لمبی: "ان پڑھے بھروسوں میں اپنی زندگی کس  
 طرح گزار سکتی تھی بھلا!"

میں تاشی اور کئی لڑکیوں کو لے کر قراقرم واپس چلا گیا۔

قراقرم میں انتشار پھیل چکا تھا۔ خاقان اعظم منگوقان مرچکا تھا۔ ادیق بوخان اور قبلانی خان میں خاقانی کا جھگڑا چلا جس میں قبلانی منخان نے فتح پائی اور قبلانی خان قراقرم کے بجائے چین میں رہنے لگا۔ اور وہیں سے حکومت کرنے لگا۔ شاید میں ایران کی طرف ہلاکو خان کے پاس پھر واپس چلا جاتا کیونکہ اب قراقرم میں خاک اڑنے لگی تھی لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ہلاکو خان قراقرم واپس آتے ہوئے پتے پتے چچا کے بیٹے برتانی خان سے الجھ پڑا۔ برتانی خان قفقاز اور روس پر قابض تھا اور مسلمان ہو چکا تھا۔ اس نے ہلاکو خان کے مسلمان دشمنی کے اعمال پر سخت کٹہہ چینی کی تھی اور اس سے جواب طلب کیا تھا کہ وہ بغداد کی تباہی، مسلمانوں کے قتل عام اور مساجد اور قرآن پاک کی بے حرمتی جیسے افعال پر قیہ کایوں مرتکب ہوا۔ ہلاکو خان نے جھجکا کہ اس پر حملہ کر دیا اور برتانی خان کے ہاتھوں اسے شکست فاش اٹھانی پڑی اور شاید اسی غم میں وہ چل بسا۔ سننے میں آیا ہے کہ ہلاکو خان کے مرنے کے بعد کئی حسین لڑکیاں بھی اس کے ساتھ زندہ دشن کر دی گئیں۔

اب قراقرم میں خاک اڑتے لگی تھی۔ قبلانی خان خاقان بن کر چین کے شہر شیانگ چوے حکومت کر رہا تھا۔ جن لڑکیوں کو میں بغداد سے لے کر آیا تھا ان میں کئی مرکھپ گئیں اور چند بھاگ گئیں، تاشی پوری واداری سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ تشنگ اور بے کیف زندگی نے جینا دو بھر کر دیا تھا۔ تاشی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے جو کچھ بڑھاتا تھا اس نے میرے اندر ایک انقلاب برپا کر رکھا تھا۔ کئی بار ماریہ اور اس کی اولاد میں یاد آئیں لیکن سردست وہاں پہنچنا میرے بس میں نہ تھا۔

پھر مجھ پر مرضوں نے یلغار کی، ہم میں گھٹیا کا مرض عام تھا۔ میں بھی اس کا شکار ہو گیا۔ بڑا علاج کیا لیکن قراقرم میں کوئی نہایتی طبیب نہ تھا۔ اس لئے صبح علاج بھی نہ ہو سکا۔ پھر بخار نے آدیا اور میں روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا۔ مہاراشک کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ ماریہ نے جبراً ہوتے پچیس سال گزر چکے تھے اور مجھ پر بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ زندہ بھی ہوگی یا مر چکی ہوگی، مجھے اپنے بچے یاد آتے، میں نے سوچا اگر دو تین زندہ ہوں گے تو جو ان ہو چکے ہوں گے۔ میرے دل میں ایک ہزک سی اٹھی اور یہ جی چاہا کہ کسی طرح اڑ کر بیت المقدس پہنچ جاؤں اور ماریہ اپنے بچوں

ہم زندگی گزارنے لگوں، لیکن بیماری نے مجھے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ میں اس کی طرف سے تقریباً بالکل بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس صبح میں ناشی کا میرے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اس کا ادا اس چہرہ بتاتا تھا کہ وہ میری زندگی سے بالکل بے ہوش ہو گئی ہے۔ میں اسے تسلی دلا سے دیتا رہتا لیکن وہ کچھ نہ تھی میری کسی بات کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

گھٹیا کا درد اتنا پریشان کر رہا تھا کہ میری چینی نکل جاتی تھی، ناشی یہ سمجھی کہ میں مرتے والا ہوں، سو گوار میری باتیں بابت بیچھڑ گئی اور رو کر دیانت کیا۔ ”خان! تم مجھے کس کے رحم پر چھوڑ جاؤ گے؟“

میں اس وفادار عودت کو غور سے دیکھنے لگا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے پھر پوچھا۔ ”آغا خان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ تمہارے بعد میں کہاں رہوں گی؟“

میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا تم میرے بقیہ زندگی کو موت تصور کر رہی؟“

”ہاں خان! میری زندگی تم اور تم نہیں تو کچھ بھی نہیں!“

میں نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔ جب وہ قریب آگئی تو میں نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تم میرے بعد کسی اور کے رحم و کرم پر رہو، تم میرے ساتھ چلو!“

”کہاں؟“

میں نے نیلے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس جاودانی نیلے آسمان کے ادھر، اس پار، جہاں ہماری روحیں مستقل قیام کرتی ہیں!“

ناشی نے میری آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا تھا اس نے پھر سے مجھے ہٹا چاہا

لیکن میں نے نہایت پھرتی سے سر ہلنے دکھا ہوا خیر اٹھا کر اس کے پیٹ میں اتار دیا

وہ چیخ مار کر گر گئی۔ میں نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تو یہاں میرے بعد بے آمر رہ کر رہے، میں جا رہا ہوں میرے ساتھ تو بھی چل!“

جسم کے جوڑوں میں اترا ہوا گھٹیا کا درد مجھے ہلنے چلنے کی بھی اجازت نہیں

دے رہا تھا لیکن میں پھر بھی گھسیل کر زخمی ناشی کے پاس پہنچا اور خچروں کے تئیں

درا کر اسے اس کا کام تمام کر دیا۔

اور بستر پر گر کر اپنی سوت کا انتظار کرتے لگا۔

دھڑکتے دل سے میں گہرے میں داخل ہوا اور ایک نوجوان پادری سے دریافت کیا۔ بیٹے یہاں ماریہ نامی بزرگ عورت رہتی ہے؟

اس نے مجھے سر سے پیر تک بغور دیکھا اور پوچھا۔ ”ان سے کیا کام ہے؟“  
میں نے جواب دیا۔ ”میں بہت دھندلا رہا ہوں“ ان سے ملنے۔  
نوجوان مسکراتے بگا۔ اور مجھے لئے ہوئے خانقاہ کے ایک رہائشی حجرے میں لے گیا۔ یہاں ایک بڑھاپے کی عورت میں قدم رکھ دینے والی عورت کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول نظر آئی۔ نوجوان پادری نے کہا۔ ”ماں دیکھنا تو یہ کون آیا ہے؟“  
اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر وہ کمرے ماحثہ مجھ سے چہرٹ گئی۔  
”تم آگئے۔ آخر تم آگئے، میں جانتی کہ تم ضرور آؤ گے!“

میری آنکھیں بھیگ گئیں، میرا دل اندر سے نکلا پڑ رہا تھا۔ اور دماغ جھنجھٹا رہا تھا۔ میں نے محبت سے اس کی پیٹھ پیچھتیانی اور کہا۔ ”ماریہ! اب میں ہمیشہ کے لئے تیرے پاس آ گیا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے!“

ہم دونوں دیر تک آسودہ ہلتے رہے، پھر ایک دوسرے کے لئے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے پوچھا۔ ”میرا بچہ کہاں ہے؟“

”کون؟ یعقوب؟“ پھر نوجوان پادری کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اور پادری سے کہا۔ ”بیٹے! یہ تمہارے باپ آغا خان ہیں!“

نوجوان پادری سر دھری سے کھڑا رہا۔ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر نمودار ہوئی اور پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔

میں نے اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہا لیکن وہ وہاں سے چلا گیا۔ میرے دل پر ایک گھونٹا سا لگا۔ میں نے کہا۔ ”ماریہ! کیا تو نے اسے خوب اچھی طرح تعلیم تربیت دے دی ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں خوب اچھی طرح، کیوں، کیا تمہیں اب بھی کسی قسم کا شبہ ہے؟“

میں نے دکھ سے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، یعقوب میں جو رش و خروش نہیں ہے، محبت کا جوش، خلوص کا جوش!“ پھر پوچھا۔ ”اور وہ دوسرا بچہ؟“  
وہ لڑکا تھایا لڑکی؟“



ماریہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”وہ لڑکی تھی، جو چند ہی دن زندہ رہ کر

لاسی!“

میں چپ ہوا۔ اور کچھ دیر بعد ماریہ سے کہا۔ ”ماریہ! میں بیمار ہوں ابھی

بھیانے سنا دکھا ہے!“

ماریہ نے کہا۔ ”مت گھبراؤ میں تمہارا علاج کراؤں گی، لیکن یہ تو بتاؤ کہ اب

میں واپس تو نہیں جاؤں گے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”اب میں کہاں جاؤں گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں

گیا ہوں!“

ماریہ نے جس طبیب سے میرا علاج کرایا وہ ایک نہایت خوش اخلاق نوجوان

طبیب تھا۔ جس کے لئے، عرصے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ میرا ہی بچہ تھا۔ وہیں بچہ، جسے

ماریہ نے لڑکی کہہ کر فوت شدہ بتا دیا تھا۔ ماریہ یہ جھوٹ اس لئے بولی تھی کہ وہ

اسے میری ہدایت اور خواہش کے مطابق سپاہی تہیں بتا سکی تھی اس میں یہ دلدوغ

گونی کا عیب کتاب اور شہری زندگی نے پیدا کیا تھا۔

میرا مڑا لڑکا مجھ سے دودھ دہتا اس نے مجھے کئی بار عیسال ہو جانے

پر مجبور کیا لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ”میں کسی ایک مریب کو اختیار کر کے

دوسرے مریب کے خداؤں کو ناراض نہیں کر سکتا“

وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خفا ہو گیا۔ ماریہ اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہے

گھٹیا کے موذی مرض نے مجھے چلنے پھرنے تک سے معذور کر دیا، ماریہ کی توجہ مجھ پر کم

ادراتے لڑکوں پر زیادہ رہتی ہے، میں نے کئی بار سوچا کہ قراقرم واپس چلا جاؤں لیکن اب

واپسی کی محنت میں سکتا ہی نہیں رہی اب ماریہ کبھی یہ کہنے لگی ہے کہ ”تمہارا خاں

قبلانی خاں چینی تہذیب کے ہاتھوں مسخر ہو چکا۔ تم بھی بیت المقدس میں ہرمان

زندگی گزارنے پر مجبور ہو، ہم شہری لوگ بھڑھے تو نہیں بن سکتے تھے لیکن تعلیم اور تہذیب

کے ذریعے ہم نے تمہیں بکری ضرور بنا دیا ہے اب تم کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ یہیں رہو

اپنی اولادوں میں، لیکن ایک اجنبی کی طرح ان کی محبت سے محروم“

میں جانتا ہوں کہ ماریہ کا گلا گھونٹ دینا مکالمہ کے اس کی ناک تو ٹھنڈی لیکن

یکپوں کو ممکن ہے۔ مگر میری انگلیوں کے جوڑے سوچے ہوئے ہیں اور میری کلاہوں میں اتنی طاقت بھی

نہیں رہی کہ انہیں اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ایدھر اُدھر گھما پھرا سکوں۔ \*

# آوازه گردبادشاه



میں سخت الجھن میں ہوں کہ اپنی داستان کا آغاز کس طرح اور کہاں سے کروں کہ جب میں کچھ کہنے کے لئے اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ دیکھ کر میری الجھنوں پر اضافہ ہو جاتا ہے کہ مصائب و ابتلا، حوادث و سانحات اور نشیب و فراز کا ایک وسیع و بے انتہا جنگل تھا جس سے گزر کر میں اپنی زندگی کے چالیسویں سال میں داخل ہوا۔ ان میں عشق و نام کی رنگینیاں اور جوانی کی کیف اور گھڑیاں اس طرح آئیں جیسے گھنگھوڑات میں کوندا جاتے ہیں نے شاہی خاندان میں پرورش پائی، کہتے ہیں حضرت بادشاہ ہمایوں کے بیٹے مرزا کامران نے کچھ دن میری ماں کا دودھ پیا تھا اس نسبت سے میں مرزا کامران کا دھڑک بھائی تھا۔ میں نے اپنی زندگی مرزا کامران کے زیر سایہ گزاری لیکن بعد میں کچھ انقلاب آیا کہ مجھے مجبوراً مرزا کامران سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

میں مرزا کامران کو آکا مرزا کہتا تھا۔ اسے کابل کی حکومت تفویض ہوئی تھی۔ ایک نامہ پہر کو آکا مرزا نے مجھے خلاف معمول بلا بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا، اس وقت وہ ایک بدحشی تاجر سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا، آکا مرزا نے مجھے سرسری نظر سے دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے سلام کا جواب دے کر بدحشی تاجر سے گفتگو جاری رکھی۔ وہ کہہ رہے تھے: ”اگر قسمت نے باوری کی تو ہند کی حکومت بھی اپنے پرہیزگاروں کو اچلتے گی، ہم اس وقت تجھے اتنا نواز دیں گے کہ تو اس وقت اس کا اندازہ نہ کر سکتا!“

پھر مجھ سے دریافت کیا: ”علی مرزا! کیا تجھے حسین لڑکیوں کی صحبت میں رہنے کا شوق نہیں ہے؟“

میں آکا مرزا کا ادب کرتا تھا لیکن دلچسپ اور چتر کیف سوال نے حوصلہ پیدا کر دیا، جواب دیا: ”ہے کیوں نہیں، لیکن جب میں اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو شرمندہ ہوں

جاتا ہوں۔“

آکا مرزا ہنس دیتے، بولے۔ ”اچھا تو تو بھی کیا یاد کرے گا، ہم تیرا یہ شوق پورا کر دیں گے۔“ پھر بخشی تاجر سے پوچھا۔ ”اس وقت تم کتنی لڑکیاں لا کے ہو؟“ تاجر نے جواب دیا۔ ”حضور دالا، کل دس لڑکیاں لیکن یہ ساری کی ساری انہیں“

آکا مرزا نے کہا۔ ”اچھا تو کل انہیں لیتے آنا!“

”جیسا حضور دالا کا حکم!“

آکا مرزا نے اسے کچھ نقد رقم دی۔ جب وہ چلا گیا تو آکا مرزا نے مجھ سے کہا ”علی مرزا! سننے میں آیا ہے کہ آگے میں حضرت بادشاہ (دیا بر) سخت علیل ہیں اور زندگی کے آثار نہیں پاتے جاتے ام چاہتے ہیں کہ تو چند آدمیوں کے ساتھ آگے سے سامنے آدہ ہیں صبح صوبہ سر حال کی خبر دے!“

مجھ میں اتنی اہمیت کہاں تھی کہ میں آکا مرزا کی حکم عدولی کو سکتا، میں نے پورا حضور دالا! اپنا منشا تو دلی اس خادم پر ظاہر فرماتین تاکہ اس کے تھکے کی تگ و دو اپنی جان کھپا دوں!“

آکا مرزا نے تنہا ہی شفقت سے کہا۔ ”ام چاہتے ہیں کہ تو کابل اور ہند کے عظیم بادشاہ کا بھائی کہلاتے۔ اس وقت ہند اور کابل کے تاج و تخت ہمارے منتظر ہیں۔ تو آگے پہنچنے کی تیاری کر اور حضرت بادشاہ کی بیماری کی صحیح کیفیت سے ہمیں مطلع کر اور خبر کے مطابق اپنی کوشش کے قدم بڑھائیں گے!“

پچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس خیال سے میں بے حد خوش ہوا تھا کہ اگر آہند اور کابل کے بادشاہ بن گئے تو میں ان کے وسیلے سے بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا دوسرے دن طلوع آفتاب کی دو گھنٹی بعد مجھے پھر طلب کیا گیا۔ اس دن آکا مرزا اپنی بارہ درمی میں سفید چاندنی پر نیلے گاڑتیکے کے سہارے بیٹھے ہوتے تھے۔ درمی چوڑے شاہی محل کے اندر واقع تھی اس لئے یہاں دن کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچتی تھی۔ بارہ درمی کی چھت سے لٹکے ہوئے خالوس اس وقت بھی روشن تھے اور ان روشنی میں بارہ درمی افسردہ افسردہ سی محسوس ہورہی تھی۔ آکا مرزا کے سامنے درش حسب جمیل اور فتنہ سامان لڑکیاں ناز دلاؤ سے کھڑی ہوتی تھیں۔ ان کے سامنے اور آکا کے کعبائیں جانب امید و بیم کی کیفیت کا شکار کل دالا بدخشانی تاجر بھی لڑکیوں کو دیکھتا ا

مرنا کو دیکھتے لگتا۔ اس طرح وہ معاملے کے اُمید افزایا حوصلہ شکن پہلو کو سمجھنے کی رہنمائی کرتا۔

میں نے ان سے اپنا قیامت لڑکیوں کو دیکھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ اکامرانے پوچھا۔  
 ”یہ کیا ہو گیا۔ کہیں تجھے آشوب چشم کی شکایت تو نہیں؟“  
 میں نے کھسیا کر جواب دیا۔ ”خدا نہ کرے، میں تو اچھا بھلا ہوں۔“  
 اکامرانے ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تیرے لیے ہیں لیکن  
 تیرے سوانے کی باتیں کی جب تو آگے دالے منصوبے پر ہوشیاری اور عقل مندی  
 برآمد کر چکے گا۔“

اس کے بعد اکامرا مجھے تنہا چھوڑ کر اندر چلے گئے ہم لڑک ان کا بڑی دیر تک  
 تے رہے لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ بدبختی تاجر مجھ سے باتیں کرتے لگا۔ اس نے ایک  
 چاہ و زرخیزان والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب! مجھے نہیں  
 ان لڑکیوں میں سے کوئی کون سی لڑکی آپ کے حصے میں آئے گی لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ  
 کوئی پسند کی ایک لڑکی منتخب ہی کرنا پڑے تو اس چاہ و زرخیزان والی لڑکی کو ہرگز نہ  
 گا!“

میں نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش رہا، غالباً بدبختی تاجر نے آنکھ کے اشارے سے  
 ان کو آگے بلایا۔ وہ سر ہمایک ٹوپی پہنے ہوئے تھی، یہ ٹوپی جسے طاق کہتے تھے، اس  
 علامت تھی کہ جس کے سر پر یہ ٹوپی ہوگی وہ کنواری ہوگی کیونکہ شادی کے بعد لڑکیاں  
 اندر سے لگتی تھیں۔ لیکن ایک قسم کا بڑا روٹا ہوا ہے جس کے دونوں سرے موڑ کر  
 سنبھال لیتے ہیں اور ٹھوڑی کے نیچے ایک یا دو گہریں لگا دیتے ہیں۔

بدبختی تاجر نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”خدا اس  
 تھ کو چھو کر تو دیکھو، کیسا نرم و نازک اور لچکیلا ہاتھ ہے۔“ اس کے بعد اس نے میرا  
 بروستی لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔ ”جہیں علم قیافہ آتا ہے، ایسے  
 ہاتھ اور لمبی انگلیوں والی لڑکیوں کی بابت یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ مزاج کی مالک ہوتی  
 ران میں جذبات حسن و عشق کی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ اپنے عاشق سے نہایت گرم جوش  
 میں آتی ہیں!“

میں نے اس لڑکی کا ہاتھ آہستہ سے دبایا لیکن گرم جوشی کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ  
 لڑکا کہ کہیں کسی طرف سے اکامرا نہ آجائیں۔ اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی بالعام

جیسی آنکھیں اوپر اٹھائیں اس کی لمبی لمبی پلکیں نیزوں کی طرح میرے چہرے  
 تن گئیں ایک ایسی مکرابٹ میں کا ہونٹوں پر کوئی اثر نہ تھا، اس کی آنکھوں پر  
 کی جاسکتی تھی۔ بدشتی تاجر ہم دونوں کی قلبی کیفیات نہایت ہوشیاری سے سمجھنے کا  
 کر رہا تھا۔

اتنے میں اکلمرزا آگئے۔ میں نے اپنا ہاتھ یکھنچ لیا۔ اکلمرزا نے کہا: ”  
 کرتا ہے۔ یہ تیری ہی امانت ہے، جو بالآخر تیرے حوالے کر دی جائے گی!“ پھر  
 سے کہا: ”ہم نے اپنے خزانچی سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہیں ان لڑکیوں کی مجموعی قیمت  
 کر دے گا۔“

اکلمرزا نے مجھے بارہ وری سے لمحہ ایک کمرے میں سے گئے۔ میری  
 تھپھپائی اور کہنے لگے ہم نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے تو ہنرِ حقیقی بھا  
 اور یہ تیرا فرض ہے کہ اپنے اکلمرزا کو ہند کی حکومت حاصل کرنے میں مدد دے۔  
 اگرے چلا جاؤ۔ میں، ہم خبریں بھیجتا رہے، اگر بابا جان نے ہمایوں کو تاج و تخت  
 بھی دیا تو ہم ان سے زبردستی حاصل کرنے کی تدبیر کریں گے۔ جیسن و جمل لڑکی  
 روشن جہیں ہے، تیرا انعام ہے۔ ریسے یہ ساری لڑکیاں تجھے انعام میں بخش دے  
 لیکن ہم پہلے تیری صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں!“

اس کے بعد اکلمرزا پھر چلے گئے اور شاید خود انھوں نے روشن جہ  
 کمرے میں بھیج دیا۔ یہ فتنہ سالانہ اور سراپا قیامت میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔  
 تیرے بڑھی اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مکرر دواڑے کی طرف دیکھ  
 وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر اس نے اور دواڑہ جرات سے کھل دیا اور  
 ہاتھ میں لے کر آیا اور ایک بار پھر دواڑے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہاں اکا  
 جھٹک دکھائی دی۔ ان کے ہاتھ میں شجرِ حیک رہا تھا۔ مادہ اس شجر کی ٹوک ہم دونوں کی طرا  
 سہم گیا۔ میرا خیال تھا کہ روشن جہیں بھی ڈر کر تجھ سے مودہ ہٹ جائے گی۔ لیکن اس کا اس  
 توقع کے سراسر خلاف نکلا۔ وہ مجھ سے قریب لگئی، بڑی طرح، پورے جوش اور سرگرمی۔  
 تاجر کے بقول، اس کی لمبی انگلیوں اور نرم دھاتم چمکیلے ہاتھ کی خصوصیات اور صفات  
 میں میرے سامنے تھیں۔ اکلمرزا کے خوف سے بے نیاز میرے ووں میں سمائی چلی گئی۔  
 جذبات میں بہہ گیا اور روشن جہیں کی گداز اور لطیف حسن میں ٹوٹنا چلا گیا۔ مجھے  
 اور کیف اپنی لگ وپے میں دوڑتا ہوا محسوس ہوا جس کے نطف اور لذت کو لطف

جاسکتا، جسم میں خون کی جگہ لطف و مسرور کی لہریں روڑ رہی تھیں انہی لہروں  
 بولی اور حقیر سی ڈور کی لہر بھی دوڑتی محسوس ہوتی آکا مرزا اور ان کے عریاں خنجر  
 لہر مار دیتے جلنے یا زخمی کر دیتے جلنے کی دہشت کی لہریں روشن جبین کی  
 سنو و نلکا سا سرور اس دہشت پر غالب آگیا



دن بعد میں آگرے روانہ ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ آکا مرزا نے  
 با سے ہم ملاقات دلے واقعے کا اشارہ بنا بھی ذکر نہ کیا اور یہ بات ایک مدت بعد  
 آئی کہ اس روز جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ آکا مرزا کی خواہش اور حکم پر ہوا تھا۔  
 نے روشن جبین کو بے تکلف ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اس حکم کی تعمیل کمانے  
 و بہ بہ نہ خنجر لئے دروازے پر موجود تھے اور شاید روشن آئی نے گھوم گھوم کر  
 کی طرف دیکھتی بھی رہی تھی شاید اس عجیب و غریب طریقہ کار سے ان کا یہ مقصد  
 کے حلق میں چند قطرے ٹپکا کر اس کی تشنگی کی آگ کو نری طرح بجھ کر دیا جائے۔  
 آگ کے مشتعل ہو جانے کے بعد میں بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا تھا اس توقع  
 مہم جوئی میں کامیابی کے بعد میں روشن جبین کا حق دار ٹھہروں گا اور میرے حوالے  
 سے گی۔

چلتے وقت روشن جبین نے ایک عجیب سی بات بھی سنی اس نے دوپٹے کا آئچل  
 ہاتھ کی پہلی انگلی پر لپیٹے ہوئے کہا تھا، علی مرزا! میں بدخشاں کی سہنے والی ہوں  
 حکومت، بادشاہ سلامت (بابا) نے ہمایوں کو عطا فرمائی ہے تم حق اور انصاف سے  
 ہرگز نہ کرنا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔

میں نے اس سے حق اور انصاف پر چلنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن جب راستے میں  
 ایک ایک بات پر غور کیا اور اس کے معانی و مطالب نکالنے لگا تو روشن جبین کی مہم  
 ی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ جہاں تک حق و انصاف کا تعلق تھا اس کی زد سے مجھے  
 کا فائدہ ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ سے وفاداری کا مطالبہ آکا مرزا کر رہے تھے،  
 یہ میں سخت الجھن میں پڑ گیا اور اس کا اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ان چکرؤں میں نہیں  
 ہے آکا مرزا نے میرے پیرو جو کام کیا ہے اسے انجام دے کر روشن جبین کو  
 زلیلا چلیے اور پھر انعام میں آکا مرزا سے کوئی جاگیر سے درخواست ہو جانا چاہیے۔

اور پوری زندگی لطف و مسرت میں گزار دینا چاہتے۔

میلوں در سے آگے کی بوجھوس ہونے لگی۔ جتنا کہ مشرقی کنارے  
بادشاہ بابر اپنے تعمیر کردہ بارغ گل افشاں کی سرخ پتھر دسے قرشی ہوئی عمارت پر  
علاکت پر مدناز تھے اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب مجھ ان کے حضور پہنچا یا  
کے گرد پیش بڑے بڑے امرا جمع تھے۔ یہ امر حضرت بادشاہ کی زندگی کے ہر موڑ پر  
دفا و استا ثبات ہوتے تھے۔ وہ شاہی تخت پر بیٹھ کر ایک لمبے تحت جیسی قرسی پر  
ادراں کے قریب ہی شہزادہ ہمایوں وحت بستہ کھڑا تھا۔ حضرت بادشاہ کو جب میری  
ہوا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا شفقت سے میرا ہاتھ لے  
دیں لے لیا اور اسے سہلانے لگے۔ پہلے آکا مرزا (مرزا کا مران) کی خبریت پوچھی۔ پھر مرزا  
کی بابت متعدد موالات کیے۔ انہوں نے ایک عظیم شہنشاہ کی شان سے کہا: "اے  
تمام اطوا میں اس وقت نظروں کے سامنے ہوتیں لیکن کوئی تحریر نہیں" اب کی مرضی  
پر غالب ہے!"

حضرت بادشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہمایوں کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر  
انرا کو مخاطب کیا: "دوستو! یہ شہزادہ نصیر الدین ہمایوں ہمارا جانشین اور وارث  
تاج ہے۔ ہماری ذات سے وابستہ دفا داریاں اب تم سب اپنے نئے بادشاہ کی ط  
کر دے۔" پھر ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ تخت پر بیٹھ جائے۔ ہمایوں اچکچاتا ہوا تخت  
حضرت بادشاہ ادرا امرانے ایک ساتھ دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے اور قرآنی آیات  
چکے چکے دعا میں دینے لگے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے منہ پر دو لٹوں ہاتھ پھیر کر  
سے کہا: "ہمایوں! اب تم اس مملکت کے شہنشاہ ہو اور تمہارا یہ فرض ہے کہ پورا  
سے خدا کی اطاعت اور بندگان خدا کی خدمت کرو، انصاف اور سچائی کو کبھی بھی ہا  
نہ جانے دو اور بیرون در بے آمر لوگوں کو سہارا دے اور ہاں ایک اور خاص بات۔" یہ  
کہتے حضرت بادشاہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ معلوم نہیں کیا سوچنے لگے۔ پھر کہا: "ہاں  
اپنے بھائیوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آنا، ان کا جرم کتنا ہی سنگین  
نا قابل معافی کیوں نہ ہو انہیں معاف کر دینا، غصے میں آکر کبھی بھی ان کے خلاف  
قدم ہرگز نہ اٹھانا!"

امکبار ہمایوں نے حضرت بادشاہ کی اس نصیحت پر سختی سے عمل پیرا  
مگر گرفتہ آدا میں عہد کیا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ ستوتے خلد میں تشریف۔



اس کے ترخ محل میں گہرا ہو گیا۔ مغل افسرانے یہ مشورہ دیا کہ حضرت بادشاہ کی دھپایا جائے۔ چنانچہ کئی دن تک یہ خبر راز میں رہی لیکن ایک دن آراکش شان نای بندہ امیر نے ہمالیوں سے بھینٹے ماندارسی دودناری مشورہ عرض کیا کہ "حضرت بادشاہ کی موت کی خبر چھپاتے رکھنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ماضی میں جب بھی ایسا کیا گیا شیعے نے جڑ پکڑی اور بازار میں لوٹ مار شروع ہو گئی!"

ہمالیوں نے فکر مندی سے دریافت کیا: "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" آرائش خان نے جواب دیا: "کسی شخص کو سنادی کی خدمت شونپ کمر ترخ پہنایا جائے اور اسے ڈھول دے کمر ہاتھی پر بٹھا دیا جائے۔ وہ شہر کے بازاروں کو چوں میں ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کر دے کہ اعلا حضرت بادشاہ نے گوشہ نشینی کر لی ہے اور درویش بن کر بادشاہت ہمالیوں کو شونپ دی ہے!"

ہمالیوں نے اس تجویز پر عمل کیا اور لوگوں کے شکوک کو رفع دفع کر دیا۔ حضرت ناہ مرحوم کی لاش ایک تابوت میں امانا رکھ دی گئی کیونکہ درجہ بادشاہ کی دھیت کے بقا اسے کابل میں دفن ہونا تھا۔

میں نے یہ ساری دودناری تفصیل لکھ کر آکامرنا کو روانہ کر دی۔ میرے ساتھ ہمالیوں کوک بہت اچھا تھا اور وہ آکامرنا اور عسکری مرزا کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتا تھا۔ ہمالیوں میں جیسی نیک نفسی اور شرافت نظر آتی اس کے پیش نظر میں نے آکامرنا کو ن دلایا کہ اگر وہ دلاسی ہمت سے کام لے تو ہندوستان کا تخت و تاج اس کے قدموں پر آوگا۔

آکامرنا نے مجھے لکھا کہ "تم ہمالیوں کے آس پاس سو جو در ہو اور اس کی ہر بات نظر رکھو اور مجھے آگے پہنچا سجدو!"

اسی دوران گجرات کے حکمران سلطان بہادر نے سرکشی اختیار کی اور ہمالیوں اس کی رکوئی کو آگے سے باہر نکلا۔ میں نے آکامرنا کو جی صوبہ حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا ہمالیوں کی عدم موجودگی آگرہ سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ ردش جہیں کی دانتے بیچتے، سوتے جانتے تاقی رہتی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک خلیا کہ میں نے ط کے آخر میں آکامرنا سے درخواست کی کہ "ردش جہیں اس ناچیز کی آپ کے پاس امانت ہے۔ آپ کی عاید کردہ شرط کی تکمیل میں معلوم نہیں کتنا وقت لگے گا اس لئے کیا یہ بات باتر اور ناممب نہیں ہے کہ ردش جہیں کی ایک تصویر بھی ماہر حضور سے ہوا کر اس ناچیز

کو مدد نہ کر دی جاتے !

آکا مرزا نے میری درخواست پوری کر دی، روشن جبین کی تصویر نے میرے اشتیاق اضطراب میں اور زیادہ آگ لگا دی۔ میں تنہائی میں اس تصویر کو بسنے سے لگا کر دیا جیسی باتیں کرتا رہتا۔ گو یہ ایک منجیدہ تصویر تھی لیکن مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ ہمالیوں نے سلطان بہادر کے تعاقب اور مقابلے میں سینکڑوں میل کا سفر کیا اور اسے شکست فاش دے کر گجرات کی حکومت مرزا عسکری کے حوالے کر دی۔ مرزا نے اور مرزا کامران ایک ماں کے پیٹ سے تھے۔ ہمالیوں آگے واپس آیا۔ آکا مرزا ابھی تک حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر ہمالیوں افغان باغی شیر خان ستوری سے آجھ گیا کہ شیر خان کے عزائم بہت ہی خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ اسی موقع پر میں نے آکا کو مدد دے کر لکھا کہ اب اس سے بہتر موقع شاید کبھی بھی نہ آئے اہمیت کر کے لگے پڑا اور آگے پر قبضہ کر کے ہمالیوں کو جلا وطن کر دیتے۔

مجھے اسی بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ چند حاسد اور چغل خود میرے کردار اور افکار نگرائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسی غفلت اور لاعلمی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرا آخری خط پکڑا گیا۔ مجھے خط سمیت ہمالیوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہمالیوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا یہ تیری تحریر ہے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہمالیوں نے سختی سے پوچھا۔ ”مرزا کامران کیا

ہے؟“

میں نے سادہ لہری سے جواب دیا۔ ”اعلا حضرت کی قربت اور حضورؐ کی ہمالیوں نے فیض میں کہا۔“ دہلی اور آگرے پر قبضے کی ترغیب دیتے ہوئے جلا وطن کر دینے کا مشورہ دے رہے ہو اور جب تمہاری سازش پکڑی گئی تو یہ ہو کہ مرزا کامران ہماری قربت اور حضورؐ کا خواستگار ہے۔“

میں نے جواب دیا۔ ”اعلا حضرت! اسی ناپیر نے وہی کچھ لکھا ہے جو حضورؐ نے پڑھا ہے لیکن اسی کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا بظاہر اظہار ہوتا ہے۔ حضورؐ نہیں جانتے کہ آکا مرزا کے مشیر کیسے ہیں۔ وہ آکا مرزا کو ہر وقت اس پر آمادہ رہتے ہیں کہ وہ آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کو آگرے اور دہلی سے باہر کریں۔ میری معترضہ عبارت میں درپہرہ آکا مرزا کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ دہلی آگرے کی طرف بڑھیں اور آپ سے مل کر حاسد اور مثری امرا کو جلا وطن کر دیں۔“

ہایتوں کے درمیان اختلافات اور مناقشات کی خلیج نہ حائل کر سکیں!“

ہمایوں میرے اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اسی دوران یہ پتہ چلا کہ مرزا عسکری نے احمد آباد میں مکرشی اختیار کی اور اپنے نام پر پڑھوانے کی فکر میں ہے۔ ہمایوں کو اسی خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور جواب دہی کے سٹری مرزا کو طلب کیا۔ ادھر شیرخان کو بھائیوں کے اختلافات کی رتی رتی خبریں دہی تھیں اور وہ اس مکرشیش میں تھا کہ یہ اختلافات کم نہ ہوں، پڑھتے ہی رہیں۔ زانے مجھ اپنے خط میں لکھا تھا کہ ”شیرخان سے کسی بھی طرح خفیہ طور پر ملو اور اسے جاری رکھنے کا مشورہ دو۔ اس سے آئیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ ہمایوں کے ایک طاقت پف کی جہیں حمایت حاصل ہو جاتے گی۔“

اتفاق کی بات کہ یہ خط بھی پکڑا گیا اور ہمایوں نے مجھ سے پھر جواب طلب کیا۔ بار بھی میں نے بات بڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہمایوں میری بات سے مطمئن را، بولا۔ ”مرزا کامران ہمارا بھائی ہے اور تم اس کے دو دو شریک بھاتی ہو۔ اس رشتے تم ہمارے بھائی بھی ٹھہرے، کیا تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم اگر ہم بھائیوں میں کسی کے اختلافات محسوس بھی کر رہے ہو تو انہیں اپنے ذاتی اثر و متوجہ اور فکر و تدبیر سے رکرو، چہ جائیکہ ہمیں آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔“

میں ہمایوں کی بات سے بہت متاثر ہوا اور تندہ میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کونا چاہیے؟ آکاسرزا کے لئے جاسوسی یا شریف النفس ہمایوں کے لئے آپس میں فاد و نیک نکت کی کوشش؟ ابھی میں اسی فکر و تردد میں تھا کہ ہمایوں کی قوت میں یہ زاہ گم ہوئی کہ مرزا ہندال دہمایوں کا ایک اور بھائی (ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آگرے کا بادشاہ بن بیٹھتا ہے اور خطبے میں اپنا نام پڑھوا کر دہلی کی طرف ٹھہرتے والا ہے اور مانتا ہی یہ بھی سنتے ہیں آیا کہ آکا مرزا لشکرِ حجاز کے ساتھ دہلی کی لڑ چل پڑا ہے اور غالباً مرزا ہندال اور آکاسرزا میں جنگ و عدال برپا ہونے والی ہے۔“

مجھے آکاسرزا کی یلغار سے خوشی ہوئی اور بالکل ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا نے آگرے اور دہلی پر قبضہ کر کے اپنا بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے اور جمعے کی نمازوں کے خطبے میں آکا مرزا کا نام پڑھا جانے لگا ہے۔ اس خوش فہمی اور فصول احساس نے ذرا سی دیر کے لئے مجھے خافل اور لاپرواہ بنا دیا۔ میں اپنے خیمے میں چلا گیا اور روشن جہیں

کی تصویر ملنے رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے تصویر سے کہا: ”روشن جبین اب وہ دن دور نہیں کہ میں تمہیں حاصل کر چکا ہوں گا، تم نہیں جانتیں کہ تمہاری مفارقت نے مجھے نیم جان کر رکھا ہے؟“

عین اُس وقت جب میں تصویر کو بوسہ دے کر سینے سے لگاتے ہوئے تھ ایک سپاہی نے میری چوڑی پکڑ لی اور نہایت پھرتی سے روشن جبین کی تصویر مجھے چھین لی۔ اس کی اس حرکت پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تصویر کی داہسی کے لئے اس پر بھڑ بھڑ حملہ کر دیا۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں سے اس کے سینے پر ایک ضرب لگائی، لیکن اس نے دارِ حال کو دیا اور میں اپنے زہر میں آپ ہی ڈھیر ہو گیا۔ میرے رگوتے ہی وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا اور چپخنے لگا: ”لوگو! دوڑنا، میں نے اس کی ایک ایسی چوڑی پکڑی ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔“

خدا سنی دیر میں بہت سارے آدمی میرے خیمے میں داخل ہو گئے، مجھ جیت اور اس سپاہی کو میرے سینے پر سوار جو دیکھا تو ہنسنے لگے، کسی نے پوچھا: ”یہ وہ شخص ہے نا جس نے مرزا کا مران کے لئے حاسوسی کی خدمات انجام دی ہیں؟“

کسی نے جواب دیا: ”ہاں یہ وہی ہے!“

کسی نے پوچھا: ”کیا پھر کوئی سطح پتر پکڑا گیا؟“

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حریف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا!

”تفصیل میں بتاؤں گا تو خاموش رہ!“

اتنے میں مشورہ غل کی آواز سن کر ہمالیوں بھی میرے خیمے میں داخل ہوا، میرے حریف نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک طرف سو دبانہ کھڑا ہو گیا۔

ہمالیوں نے نرمی سے پوچھا: ”کیا بات تھی؟ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے تھے۔؟“

میرے حریف نے ادب سے جھک کر عرض کیا: ”حضرت والا! یہ شخص ہمیں مسلمان نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تصویر پر حجت ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس تصویر پر اس شخص کو سجدہ کرتے دیکھا ہے!“

ہمالیوں نہایت غور سے روشن جبین کی تصویر دیکھتا رہا۔ پھر بے دلی سے پوچھا: ”علیٰ مرزا تم پر جو الزام لگایا کیا یہ درست ہے؟“

میں نے آہستہ ہو کر جواب دیا: ”یہ اس ناچیز پر سرسراہتا ہوتا ہے، خاکہ

ان ہے اور ایک مسلمان تصویر پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے؟  
 ہمایوں نے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"  
 میں نے شرما کر جواب دیا۔ "ناچیز کی سنگت کی!"  
 ہمایوں نے طنز بہ کہا۔ "اُسے سینے سے لگاتے کیوں پھر رہے ہو؟"  
 اس سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہمایوں نے تصویر میرے حریف کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا۔ "اگرے منہجے  
 یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے وہاں اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم تصویر پرستی کے  
 اہل کے مرتکب ہو چکے ہو تو تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی!"  
 میں مہم گیا، خوف کے ساتھ ہی یہ قلق مجھے اور زیادہ پریشان کرنے لگا  
 روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھین گئی تھی۔ اب میں یہ تصویر لڑ جھگڑ کر بھی واپس  
 لے سکتا تھا۔

بھائیوں کی سرکشی اور باغیانہ روش نے ہمایوں کو بد دل اور فکر مند کر دیا تھا  
 سی وجہ سے وہ زیادہ سیاہ رکھنے کے باوجود شیر خان کے مقابلے میں کمزور چہرہ  
 تھا۔ اس تازک موقع پر ہمایوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال شیر خان سے نہ الجھا جائے  
 اور اس سے صلح کر کے اگرے واپس جا کر پہلے بھائیوں کی سرکشی کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ  
 سوچ کر اس نے ملا محمد غریزہ نامی ایک امیر کو طلب کیا۔ ملا غریزہ کے شیر خان سے یارانہ  
 تعلقات یہہہ کے تھے اس موقع پر معلوم کہیں کیوں ہمایوں کو میری یاد آگئی اور اس نے  
 مجھے تجھے میں طلب کیا۔ "علی مرزا! شاید تو جاسوسی کے کام میں خاص مہارت رکھتا ہے  
 یہ بہترین موقع ہے کہ تو ملا غریزہ کے ساتھ شیر خان کے پاس جائے اور ان  
 دروں میں جو بات چیت ہو لفظاً لفظاً ہمارے گوش گزار کرے۔"  
 میں نے شکریہ کے ساتھ بادشاہ کی خدمت قبول کی۔

اسی وقت بادشاہ نے میرے حریف کو طلب کیا اور خلاف توقع اُسے حکم دیا کہ  
 روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی جائے۔ میرا حریف حیرت زدہ رہا اور ناگوار سی  
 کے آثار تھے واپس آگیا۔ ہمایوں کے اس حکم نے مجھے خود بھی حیران کر دیا تھا۔ غالباً بادشاہ  
 نے میرے احساسات کا اندازہ لگا لیا کہنے لگے، "علی مرزا! تم ایک ہوش مند نسیکن

عاشق مزاج نوجوان ہو، بہارِ اخیال ہے کہ تمہیں کلہران مرزا نے حسین رکھیوں کا لالچ  
رے کر اس ناپسندیدہ کام پر آمادہ کیا ہوگا، کیا تمہیں رسول اللہ کی اس حدیث کا علم نہیں  
جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ دوسروں کی جستجو مت کرو۔

غلام مجھے پہلی بار بادشاہ کی ذہانت اور فراست کا دل کی گہرائیوں سے  
قائل ہونا پڑا۔

اس گفتگو کے بعد ہائیوں نے نرمی سے کہا: کل جب میں تمہاری تصویر پرستی  
کا علم ہوا تھا تو ہم واقعی مشتعل ہو گئے تھے لیکن دیر بعد تنہائی میں جب اس مسئلہ پر  
پھر غور کیا تو شرمندہ ہو گئے جو انہیں کون ہے جو عشق و محبت میں مبتلا نہیں ہوتا  
تم اس مٹکی سے محبت کرتے ہو تو ضرور کرو لیکن آئندہ اس کی تصویر کو سجدہ ہرگز نہ  
کرنا!

میں نے جلدی جلدی عرض کیا: اعلیٰ حضرت کو غلط نہیں ہو گئی ہے کہ اس  
با چیز نے تصویر کو سجدہ کیا تھا، ایک مسلمان بت پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے؟  
اعلیٰ حضرت نے مزید فرمایا: علی مرزا! میں ایون کھانے کی عادت ہے، کبھی کبھی  
افراط آجاتا ہے۔

بادشاہ کی صاف گوئی اس کی صدق دلی کی گواہی دے رہی تھی۔

میرے حریف نے روشن جبین کی تصویر میرے حوالے کر دی۔ یہاں میں اپنے  
آن احسانِ سترت کا کس طرح اظہار کر دوں جو مدِ شن جبین کی تصویر پر اگر مجھ پر طاری ہوئے  
تھے میں نے بادشاہ سے نظریہ چمکا کر نہایت احتیاط اور دلا پر دانی سے روشن جبین  
کی تصویر پر پشتی بھری نظر ڈالی اور اسے اپنی عیا میں چھپایا۔

جب میں ملّا غزنہ سے ساتھ شیرخان کے شکر میں داخل ہوا تو اس کے  
سپاہی ہمیں ایک کھڑی ہوئی خندق کے پاس لے گئے۔ اس چلچلیاتی دھوپ میں  
شیرخان اپنے بہت زیادہ سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھا، اس  
کا چہرہ اور دائرہ میٹھی میں لٹے ہوئے تھے۔ اس نے کدال نصائیں بلند کی اور زور  
سے کھڑی ہوئی خندق کے کنارے پرست کر دی، مٹی کا ایک بڑا ٹکڑا غبار آٹا ہوا  
خندق میں گر گیا۔ اسی عالم میں اُسے ہماری اطلاع دی گئی وہ خندق سے باہر نکلا اور کدال  
ایک طرف رکھ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہمارے لئے دہلیں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا جائے

ن حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور شیرخان پانی منگو کر ہاتھ دھونے لگا۔

پھر سب اس لئے جیسے میں اکٹھے ہو کر بیٹھے اور ملاعرزے تے نہایت وقار سے شیرخان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی شیرخان بلا کا ذہین تھا وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ ہایوں کے بھائیوں کی سرکشی سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہایوں پر تم قیادت مغل فوج میں اتحاد اور جوش و خروش پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا ملاعرزہ آپ ہادی طرف سے ہایوں سے یہ عرض کر دیں کہ ہم دونوں فرسی مشکل میں پھنس گئے ہم خود بادشاہ سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن ہمارا شکر جنگ پر منحصر ہے اسی طرح ہایوں خود ہم سے جنگ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا شکر جنگ پر آمادہ نہیں۔

شیرخان کے جواب نے یہی صلح کی طرف سے ہایوں کو دیا۔ اس وقت وہ میں پر بے تکلف بیٹھا ہوا تھا اور شیرخان کی ہر ہر ادا اور جملہ طور طریقہ میں بار ہے تھے کہ بھائیوں کی نا اتفاقی اور فوج کی بددلی کا شکا د ہایوں میں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم ہایوں کے پاس واپس گئے اور شیرخان کے جواب سے مطلع کر دیا۔ دوسرے دن صبح شیرخان کی فوج ہادی طرف بڑھی ان کا ایک جنگ بھو باقی ہایوں کے لشکر کی طرف بڑھا چلا آیا ہاتھ ہایوں نے عجلت میں طبل جنگ بجا یا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کے ہاتھی کے آگے بٹھا ہایوں کا ناسی جنگ جو میر چک کے اور اس سے دونوں جہانے پیٹے سامنے موجود تھے ہایوں نے انھیں حملہ آور ہونے کو حکم دیا۔ لیکن تینوں بے فکر سے گورن جھکا کر کنارے ہٹ گئے ہایوں نے میر چک کے سے ایک بیٹے کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور دشمن کے ہاتھی کی پیشانی میں اتار دیا۔ دفعہ تہ ہاتھی کی سعادتی سے ایک تیرا کر ہایوں کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا۔ ہایوں نے آف تک نہ کی۔ اور پیوستہ تیرا کر پر دھاک کے بغیر ہاتھی کی پیشانی نے نیزہ نکلنے کی کوشش کرتا رہا اور جب انتہائی زور آزمائی کے باوجود نہ نکال سکا تو وہاں سے بھاگ کر اپنے لشکر میں آیا اور چونچ چونچ مڑھلے کا حکم دیا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ افغانی مغل لشکر کو زیر دہر کرنے میں مصروف تھا اور مغل سپاہ چڑھوں کی طرح بل کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکی پھرتی تھی۔ خود میرا یہ حایا تھا کہ بدحسامی میں فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں گھر کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اور ایک بادگی میرے ہی میں آئی کہ اس بے مرد سامانی میں نلوار کا ایک بھر تویر ہا تھا۔ ہایوں کی گردن پر دسید کردن تاکہ آکا مرڈا کی راہ کا سب سے بڑا کانا ڈر رہا۔

جانتے لیکن معلوم نہیں وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اس ادا سے باز رکھ  
لوگ کہتے ہیں بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے جو سکتا ہے اس  
خطرناک موقع پر کسی دلی کا سایہ محیط ہو جس سے وہ میرے جملے ادا انتقام سے محفوظ رہا۔  
میں نے آگے بڑھ کر بادشاہ کی عنان پر دلی اور خوشامدازہ عرض کیا: اعلیٰ حضرت  
اب کیوں ٹھہرے ہیں مغل سپاہ زبردہ ہو چکی یہ وقت ٹھہرنے کا نہیں، فرار ہو جانے کا ہے  
آپ یہاں کس ترقی اور کس کے ہمارے پروردگار ہیں؟

ہایوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور گھوڑے کو دوڑا کر مدد یا کے  
کنارے پہنچا وہاں بادشاہ کا گرو باز نامی ہاتھی پہلے سے موجود تھا۔ بادشاہ نے  
ہماہوت کو حکم دیا کہ ہاتھی اس کے قریب لایا جائے مگر ہماہوت نے کوئی پروا نہ کی اور  
بہروں کی طرح بادشاہ کی بات سنی ان سنی گمراہی بادشاہ نے مجبوراً گھوڑے کو مد  
میں ڈال دیا ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ باڑا کا گھوڑا اس کی ران سے نکل گیا اور بادشاہ ڈبکیا  
کھانے لگا اسی عالم میں، میں اس کی مدد کو بڑھا لیکن مجھ سے پہلے نظام نامی ایک  
سقم مشک پھلا کر بادشاہ کی طرف بڑھا اور مشک کی مدد سے بادشاہ کو دوسرے  
کنارے پر پہنچا دیا۔

کنارے پہنچ کر بادشاہ نے سقم سے پوچھا: تمہارا نام؟

سقم نے جواب دیا: "نظام الدین"

ہایوں سرے پر تنک سے دیکھتا رہا، پھر کہا: تم ہمارے ساتھ آکر۔  
جلو ہم اس عظیم خدمت کے صلے میں تمہیں اردن ہندوستان پر حکومت کرنے  
سوق دیں گے۔

بادشاہ میری وفاداری سے بہت متاثر تھا۔ راہ میں اس نے نظام سقم  
کی بابت سنے ایک عجیب مشیے کا اظہار کیا، اس نے مجھ سے کہا: "علیٰ مرزا! کیا تمہا  
اس بات کا یقین ہے کہ نظام الدین واقعی ایک سقم ہے؟"  
میں نے تردد سے عرض کیا۔ اعلیٰ حضرت مدثر ضمیر میں یہ ناچیسہ کیا عذر  
کہہ سکتا ہے؟

بادشاہ نے حجاب دیا: "ہمارا خیال ہے یہ حضرت محبوب الہی نظام الدین  
ادلیا تھے جو ہمارے دستگیری فرماتے آئے تھے؟"  
کے ہایوں کی اس خوش عقیدگی پر میرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کیونکہ



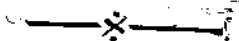
ہاویسیاں حد سے زیادہ غلبہ کرتی ہیں تو آدمی کو معجزات اور کرامات ہی سہارا دیتے ہیں۔  
 سفر میں مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ بادشاہ جب کاپی سے گزرا تو وہاں کے حکمران  
 پانڈوانے نے کراہ کر حاضر ہوا، ان نذرانوں کی بابت بادشاہ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ  
 انے تو بہت نیامدہ تھے لیکن جب بادشاہ کی شکست کا اسے علم ہوا تو اس نے نذرانوں کی  
 رقم کو دی اور بادشاہ کی سرسری توفیق کہ بادشاہ کو اس خبر سے صدمہ پہنچا اس نے  
 آپ کے ساتھ نذرانے واپس کر دیے اور آگے سے رطن ہو گیا۔

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگرے میں کلہان مرزا بادشاہ بننے کی فکر میں  
 ت گزریں ہیں۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دونوں بھائیوں کو آپس میں ہمت بگڑیاں  
 بھا اور بھیرے بھی دیکھا کہ کلہان مرزا اور ہاپوں میں سے کسی ایک کا لاشعہ زمین پر  
 پڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ لاشعہ بدستہی سے کلہان مرزا کا نکلا تو میرا کیا حشر ہو گا۔  
 یمن جیسی کو کس طرح حاصل کروں گا۔ دربادی امراجو میرے مخالف ہیں اور حارث ہیں میرا کیا  
 شر کرینگے۔ یہ اندیشے مجھے پریشان کرنے لگے۔

ہاپوں نے آگرے پہنچنے سے پہلے مجھے ایک نصیحت کی۔ کہا: علی مرزا! ہم  
 بات ہمیشہ یاد رکھنا جب وہ بھائیوں میں رنجش ہو تو ان بھائیوں کے دوستوں اور  
 بیٹوں کو غیر جانبدار مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ایک  
 بددست خطرہ موجود رہتا ہے؟

میں بادشاہ سے آنکھ ملانے کی ہمت تو نہ رکھتا تھا لیکن جس طرح سکوت اختیار  
 لیا اس میں بادشاہ کی بقیہ بات سننے کا اشتیاق پایا جاتا تھا۔ بادشاہ نے غالباً مجھ پر  
 ایک سرسری نظر ڈالی اور بات پوری کر دی۔ کہا: دونوں بھائیوں کی ہمت بھی ایک  
 ہو سکتے ہیں اور جب بھی ایک ہوں گے۔ نفاق پھیلانے والے دوستوں کی شامت  
 آجائے گی؟

یہ بادشاہ کا اشارہ میری طرف تھا۔ بات قیمتی تھی میں نے گہ میں پانڈو کی اور  
 یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو آگرے پہنچ کر آکامرنا کی اس خطرناک خدمت سے سبکدوشی  
 حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔



آکامرنا ہارن کلفٹان مجھے شرم محل کے ہراپردے میں غافل بیٹھے تھے کہ

بادشاہ اپنے اتر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، بادشاہ کے گھوڑے نے زور سے اپنے پاؤں پہ  
 محل کے خدام بدحواسی میں بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے اور بادشاہ کی رکاب پکڑی ابھی ہوا  
 گھوڑے سے اترا بھی نہ تھا کہ میرا پر دے سے آکا مرزا بدحواسی میں نکلا اور بادشاہ کے پا  
 چومنے لگا۔ ہمایوں گرتے گرتے بچا، گھوڑے سے آکا مرزا کو بیٹے سے لگایا اور اس  
 پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں ہمایوں کی پشت پر کھڑا تھا۔ آکا مرزا کا ہم آغوش سر ہمایوں کے کا  
 پر دکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مجھے گھوڑے ہی تھیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

آکا مرزا اور ہندال مرزا نے جویم یکساں کیے تھے۔ لیکن ان دونوں میں فرق  
 تھا کہ ہندال مرزا بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گیا تھا اور آکا مرزا نے حالات کا حوص  
 مندری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس موقع پر آکا مرزا نے جس غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا  
 نے مجھے چونکا دیا۔ آکا مرزا نے ہندال مرزا کی سفارش کر کے خود کو بچا لیا۔ کہا: ”مجھ  
 سلامت ہندائی مرزا نادان اور نا سمجھ ہے اس با چیز کی خواہش ہے کہ حضور والا اسے سوا  
 فرادیں۔“

صاف دل ہمایوں نے جواب دیا۔ ”ہم ہندال مرزا کی لغزش تمہاری وجہ سے  
 معاف کرتے ہیں اسے تلو اور فصیحیتیں کر دے کہ آئندہ ان گستاخیوں کا مرتکب نہ ہو۔“

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

**احساس کھتری**

کتاب کا مطالعہ آپ کا  
 بے گناہ کا کہ :-

- احساس کھتری سے کس طرح  
 نجات حاصل کی جاسکتی ہے
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں
- کیا آپ واقعی احساس کھتری کا شکار ہیں صرف
- یہ آپ کا خیال ہے۔ جو کہتا ہے کہ صرف اس  
 کتاب کے مطالعہ سے ہی آپ کا یہ احساس ختم  
 ہو جائے

اسباب  
 تدارک  
 علاج

قیمت ۲۵ روپے

ڈاک منیج  
 ۱۹۷۰ء

مکتبہ نفسیات

اس کے بعد بادشاہ نے نظام ستقہ کا آکا مرزا سے تعارف کرایا اور کہا کہ "ہم نے  
سے وعدہ کیا ہے کہ اسے دو دن حکومت کرنے کی سعادت عطا کریں گے۔"  
آکا مرزا نے ناگواری سے منہ بنایا "زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔"  
ہالیوں بہت تھکا ہوا تھا وہ آرام کرنے محل میں چلا گیا تو آکا مرزا مجھے محل کے  
گوشے میں لے گیا۔

موتیا کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ دوسرے پھولوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی  
ن اس خوشبو میں ترشی، معلوم نہیں کیوں پائی جاتی تھی جس کمرے میں ہم دونوں بیٹھے  
تھے اس میں مرقع و منقش سپاہی کا خطبہ (شیخ دان) سر پر لٹکا ہوا بارہ شمعوں کی روشنی  
سے رہا تھا۔

آکا مرزا نے پہلے تو مجھ سے شیرخان سے جنگ اور ناکامی کی تفصیلات سنیں، پھر  
چھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ اعلا حضرت ہالیوں نے ہمارے خطوط پکڑ دیتے تھے؟"  
میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

آکا مرزا بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے، پھر بولے چھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟ حضرت  
سلامت نے کیا فرمایا؟"

میں نے جواب دیا۔ "انہوں نے حیرت انگیز درگزرے کام لیا۔"  
"افسوس!" آکا مرزا ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "تم اگر ذرا اسی ہمت اور  
ہوشیاری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کے تخت و تاج پر ہمارا قبضہ ہوتا لیکن تم ہندی  
درجے و عوق نکلے!"

سیرا خیال تھا آکا مرزا میری خدشات کو سراہیں گے لیکن مبب وہ اتنی آنکھیں دکھا  
لگے تو مجھے بڑا نقصہ آیا۔

آکا مرزا نے کہا۔ "کسی کو بڑا منصب یوں ہی نہیں ملتا، اس کے لئے بہت تندرہ اور  
جہاد کی ضرورت ہوتی ہے، اول تو تم نے نااہلی اور نالائقی سے خطوط پکڑ دا دیے دوسرے  
یہ کہ جب شکست کی افراق فری میں تمہیں اعلا حضرت کو قتل کر دینے کا موقع ملا تو تم نے کوتاہی  
اور غفلت سے کام لیا جب حضرت سلامت دریا میں ڈبکیاں کھا رہے تھے اگر تم ذرا اسی  
ہوشمندی اور ہمت لے کام لیتے تو وہ کبھی بھی پانی کی سطح پر نہ نہوار نہ ہوئے اور آج ہندوستان  
کا تخت و تاج ہمارے قبضے میں ہوتا!"

میں نے رک رک کر جواب دیا۔ "اعلا حضرت حد درجہ شریف انسان ہیں پھر یہ

بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے اعلیٰ حضرت بھی بادشاہ اور شاید انہیں بھی سلطنت دلیوں کا سایہ حاصل ہے پھر میں انہیں کس طعنے پر ہلاک سکتا تھا؟

۲ کامرزا نے غصے میں میرے رخسار پر ایک طمانچہ بٹردیا۔ طمانچے کی آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا اور اعلیٰ حضرت خلاف توقع اندر داخل ہوئے۔ میں اپنا رخسار سہلانے ۲ کامرزا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اعلیٰ حضرت نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دریافت فرمایا۔ ”یہ آواز کیسی آتھی؟“

۲ کامرزا سے پہلے میں نے جواب دیا۔ ”حضور والا! ایک پتھر میرے تنگ کمر تھا، وہ بار بار میرے رخسار پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تنگ کمر میں نے پتھر کو مارنے کے لیے رخسار پر طمانچہ رسید کر لیا۔“

بادشاہ نے غور سے ہم دونوں کو دیکھ کر بعد دیکھ کر دیکھا اور ایک طویل دم بھری۔

۲ کامرزا کی آنکھوں میں ممنونیت کا جذبہ سمٹ آیا۔ بادشاہ کے ہاتھ میں کاغذات کا پلندا دبا ہوا تھا۔ انہوں نے اچانک مجھ پر ریاضت فرمایا۔ ”علیٰ مرزا! وہ لڑکی دالی تصویر کہاں ہے؟“

میں شرم سے جواب نہ دے سکا۔ انہوں نے پھر سوال کیا۔ ”تم جواب کیوں نہیں دیتے؟“

۲ کامرزا نے پوچھا۔ ”اعلیٰ حضرت کس تصویر کی بابت سوال فرما رہے ہیں بادشاہ نے نہایت سادگی اور سچو لپٹ سے پوری تفصیل بتا دی اور کہا: ”کامرزا! مرزا! تمہارا یہ کوکہ (دودھ بھرتیک) بڑا عاشق مزاج نوجوان ہے“ پھر پوچھا۔ ”کامرزا! وہ لڑکی تمہارے ساتھ آئی ہے؟“

۲ کامرزا نے فطرت سے جواب دیا۔ ”کیوں؟“ کیا اعلیٰ حضرت کو یہ لڑکی پڑ ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”کون ہے جو اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد پڑ نہیں کرے گا؟“

۲ کامرزا نے جواب دیا۔ ”اعلیٰ حضرت سبب آرام فرما کر اٹھیں گے روشنی جب

یاد میں میں پیش کر دی جاتے گی۔“  
 جسے دل پر ایک گھونسل لگا اور مجھے بادشاہ سے زیادہ ۲ کامرزا پر غصہ آیا  
 کہہ سکتے تھے کہ روشن جبین کسی کی امانت ہے اعلا حضرت اس کا خیال دل سے نکال  
 ن ۲ کامرزا تو اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔  
 بادشاہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہے۔ اس کے بعد فرمایا۔  
 ان مرزا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شیر خان افغان ہم سب کے لئے خطرہ بن چکا ہے  
 اس سب کے لئے اس وقت یہ ضروری ہے کہ آپس کی نا اتفاقیوں کو ختم کر کے مل  
 رہیں!“

۲ کامرزا نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا۔“اعلا حضرت! یہ تو جانتے ہیں کہ  
 بعد ازاں لوگ حضور دالک تک خوار اور پردہ ہیں، جیسا حکم دیں گے اس پر عمل  
 پاتے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔“کامرزا! ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شیر خان سے مقابلہ ہوتا  
 ہے۔“

پھر مجھ سے کہا۔“علی مرزا تیری وفاداری سے ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا حالانکہ اعتدال  
 جاتیں پھر بھی تیری خدمات کا خاطر خواہ انعام دیا جاتے گا۔“

۲ کامرزا بادشاہ کی باتوں سے دل ہی دل میں گڑبڑ رہے تھے۔  
 بادشاہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔“کامرزا! کیا تم یہ عہد کرنے کو تیار ہو کہ تم  
 وہ سرکاری اور وفاداری نہیں کر دو گے؟“

۲ کامرزا نے جواب دیا۔“اعلا حضرت کو کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے دوسرے یہ خاکسار  
 بڑی بھڑکتے ہوئے اس طرح کہہ سکتا ہے!“

بادشاہ نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کا پلٹا بیڑہ رکھ دیا اور واپس  
 اتے ہوئے فرمایا۔“ہم کل تمہیں باریابی کا شرف بخشیں گے اس وقت تم سے ہم بعض  
 تم مشورے کریں گے۔“

بادشاہ کے جاتے ہی ۲ کامرزا نے انا کاغذات پر قبضہ کر لیا اور انہیں کھول  
 صول کر دیکھنا شروع کیا، اچانک ۲ کامرزا کا چہرہ مسکینہ پڑ گیا میں نے ان پر اسرار کاغذات  
 دوسری نظر سے دیکھا یہ ۲ کامرزا کے درہ خطوط تھے جو انہوں نے مجھے اور بعض دوسرے  
 لوگوں کے نام لکھے تھے انہیں میں چند وہ خطوط بھی جو جو دستے بنی میں بادشاہ علامت

کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ آکامرزا لہزہ گئے وہ بادشاہ کی ایسا سمجھ چکے۔  
ہمایوں نے اس طرح آکامرزا کو یہ بات بتادی تھی کہ وہ جو کچھ بھی اس کے خلاف  
کے ہیں بادشاہ اس سے باخبر ہیں۔

آکامرزا کمرے سے نکل گئے لیکن پانچ منٹ بعد پھر واپس آ گئے۔ پور  
مرزا اہم یہ دیکھنے باہر گئے تھے کہ وہاں اعلا حضرت موجود تو نہیں، لیکن شاید وہ  
لئے خواب گاہ میں جا چکے ہیں۔

میں نے پوچھا، "بادشاہ کو ہماری مصروفیات کا پورا علم ہے اس لیے ہمارے  
آپ کا کیا خیال ہے کیا بادشاہ ہمیں ان باغیانہ خطوط کی سزا میں قتل نہیں کر دے گا؟  
آکامرزا نے افسردگی سے جواب دیا، "مجھ بہتہ نہیں کہ ہمارا کیا حشر ہو گا لیکن یہ  
نہیں کہ ہمارے لئے کوئی سہرت ناک سزا تجویز کی جائے گی۔"

میں نے کہا، "بادشاہ خواب گاہ میں آرام فرما رہے ہیں، کیا چوری سے ہمارا فرما  
مناسب نہیں ہے؟"

"بزدل کہیں کے۔" آکامرزا نے غصے میں کہا، "ڈرتے کیوں ہو اگر ہمیں سزا ملی  
بھی سزا پاؤ گے۔"

میں نے دبے لفظوں میں پوچھا، "آکامرزا کیا بادشاہ علامت روشن جیہیں کو  
اپنے حرم میں ڈال لیں گے؟"

آکامرزا نے جواب دیا، "کچھ بعید بھی نہیں۔"  
میں نے معلوم نہیں کس طرح جوش میں عرض کیا، "آکامرزا اگر ایسا ہوا تو میں  
ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں سے دُور اختیار کر لوں گا۔"

آکامرزا کے جی میں معلوم نہیں کیا آئی کہ انہوں نے نرمی سے کہا، "علی مرزا،  
بھی تم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اگر اعلا حضرت نے روشن جیہیں کو قبول فرمانا چاہا تو  
اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو تمہارے حوالے کر دیں گے پھر تم اسے جہاں بھی جاؤ گے جاؤ  
جب میں آکامرزا سے جدا ہونے لگا تو انہوں نے مجھ سے کہا، "علی مرزا، یہ  
سخت معرکے کے لئے تیار ہو، بس یہ سمجھ لو کہ ہم دُور لوں کو اگر سے کے تاح دشت  
لئے اپنی اپنی جان کی آخری بازئی لگا دینی ہے، اس کا نتیجہ جو کچھ بھی نکلے ہمیں  
کوئی پروا نہ ہوتی چاہیے۔ سخت یا شغہ دار جو بھی مقدر میں ہو گا مل کر رہے گا، تقا  
سے ڈرنا کیسا؟"

آکا مرزا میر سے اس جھوٹ سے بہت خوش ہوتے تھے جو میں آکا مرزا کے طمانچے کی  
شی کے سلسلے میں بول چکا تھا اور میرا بگھلتا ہوا اعتماد کسی حد تک پھر بحال ہو گیا تھا  
لی نری اور درگیزی نے اسے ذرا بھی ممنون احسان نہ کیا تھا۔ وہ اب بھی ہمالیوں کی جنگ اپنی  
کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے مجھے پھر یہی ہدایت کی کہ میں کسی بھی طرح ہمالیوں  
سے ہٹانے کی کوشش سے غافل نہ رہوں۔

بادشاہ نے نظام سقہ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کا اعلان کیا۔ تمام افراد  
نا کو حکم دیا گیا کہ وہ نظام سقہ کے حضور پیش ہوں اور آداب بادشاہی بجا لائیں۔ نظام  
سہر پھرتاج رکھا اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا، افراد شہزادے کو نش اور قیامات  
تے۔ خود بادشاہ بھی ایک امیر کی حیثیت سے نظام سقہ کے دربار دوست بستہ کھڑا رہا۔  
کی نظریں آکا مرزا کو تلاش کردہ تھیں۔ میں بادشاہ کا مقصد بھانپ گیا اور نیک خدمت  
ذریعے بادشاہ کی قربت کا خواہاں ہوا۔ ہمالیوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور پوچھا: کیا  
مے کچھ کہنا چاہتے ہو؟

میں نے آکا مرزا کا معذرت نامہ ہمالیوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس چند سطری  
مے میں تحریر تھا۔

”اعلا حضرت: ناچیز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے حاضری دینے  
سے قاصر ہے۔ اگر خاطر نازک پر گراں نہ گزرے اور اعلیٰ حضرت ناچیز کو  
اپنا ہمدرد اور بھی خواہ تصور فرماتے ہیں تو حقیر کی اس رات سے ضرور  
اتفاق فرمائیں گے کہ نظام سقہ جیسے مقرر شخص کو رد سمری سخت شین  
اور رعایتیں بھی دی جا سکتی تھیں اور یہ لازم نہ تھا کہ اسے تخت پر  
بٹھایا جائے اور خاص کرا میں تازک گھڑی میں کہ شیرخان ہمارے  
نزدیک آچکے ہے، اعلیٰ حضرت کی یہ حمایت حضرت اور نقصان کا سبب  
بن سکتی ہے۔“

بادشاہ نے آکا مرزا کے اعتدال پر افسوس کیا، بولے: ”اسمہ ہمارے بھائیوں کو  
رگیا ہے کہ وہ ہمیشہ اختلاف کی روش اختیار کرتے ہیں۔!“  
کئی دن تک آکا مرزا سے میری ملاقات نہ ہو سکی، جبراً فیال تھا کہ وہ ضرور کسی  
ش اور موٹر توڑ میں مصروف ہوں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری  
صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں نے آکا مرزا سے عاضری کی اجازت چاہی، جو

با آسانی مل گئی۔ میں نے دیکھا منقش آئینہ سی مہری پر آکا مرزا ادنیٰ کردٹ بیٹے پر  
طیب کو نبض دکھا رہے تھے۔ میں سامنے گیا اور نیاز منانہ آداب بجالایا۔ ہونٹوں پر  
مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے عرض کیا: ”آکا مرزا! مجھے اندس سے ہے کہ میں آپ کی  
سے بتائیں مطلع ہوا۔“

آکا مرزا نے اندس سے کہا: ”علی مرزا! ہم نوراً لا ہور داپس سانا چاہتے  
تم اعلا حضرت سے بصداوب ہماری طرف سے عرض کرو کہ وہ ہمیں آگے سے نہ  
نہروں گے۔“

میں نے اپنی طرف سے بادشاہ کے خیال کی ترجمانی کی۔ میں نے کہا: ”اعلا  
کا خیال ہے کہ اس نازک موقع پر ہم سب کو اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔“  
آکا مرزا نے نہر ملی نظروں سے مجھے گفتور اور اپنے طیب کو حکم دیا: ”  
بیان کیا جائے۔“

طیب نے سر جھکا کر عرض کیا: ”اندس کہ حضور والا کو کھانے میں نہر  
ہے!“

آکا مرزا نے کمرخت آواز میں کہا: ”ہمیں یہ نہر کون دے رہا ہے؟ اس کا ایک  
جواب ہے۔ اعلا حضرت کی ایسا پر محل سرا کی بیگمات کھانے میں نہر دے کر ہمیں ہلاک  
دینا چاہتی ہیں!“

میرے ہی میں آتی کہ میں بلو شاہ کی تائید میں بیروں اور آکا مرزا کو بتاؤں  
بادشاہ خطرناک باغیانہ اور سازشی مخطوطے پکڑے جانے پر غور و درگزر سے کا۔  
رہا ہوا سے کھانے میں نہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ  
شفا کہ شکی اور سازشی آکا مرزا میرا کسی طرح بھی ہم خیال نہ بنے گا اور میں ایک بار  
اعتماد کھو دوں گا۔

آکا مرزا نے چڑچڑھے لہجے میں کہا: ”تم اعلا حضرت پر ہمارے خیالات کا  
کردار و ادان سے کہو کہ ہم لاہور داپس سانا چاہتے ہیں اور سکتے ہی یہ بھی جتا دے کہ  
اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔“

اس گفتور کے دوران طیب نے نصحت ہو گیا۔ میں بھی داپس آنا چاہتا تھا لیکن  
مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا حکم دیا۔

فدا میر بعد آکا مرزا کی بیگمات آنے لگیں۔ چونکہ میں آکا مرزا سے ہمشیری



تھا اس لیے بیگمات مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں ان آنے والیوں میں وہ مرد  
 نہ اور فتنہ سامانِ روشن، جہیں بھی شامل تھی جس کی تصویر میں اپنے دل سے لگاتے  
 تھا اور جس کی وجہ سے میں تصویر پرستی کے الزام سے متہم ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی  
 عجیب حالت ہو گئی۔ میرا دل جیسے میں یوں اچھلا جیسے وہ پسیلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر ہی  
 پاتے گا۔

آکا مرزا میری سالت پر غور کر رہا تھا۔ شاید وہ شکریا بھی۔ روشن جہیں نے مجھ  
 مٹی سی نظر ڈال اور آکا مرزا کی پاستنی جاگھڑی ہوئی۔ میں نے زیر لب چند اشعار پڑھے  
 کا مطلب تھا۔

”چند قریبوں کا فاصلہ میرے حق میں ہزاروں میل کا فاصلہ  
 بن گیا ہے۔ خدا جب دل میں عشق کی آگ روشن کرتا ہے تو اس  
 نسبت سے دیوانگی اور جنون میں بھی اضافہ ہونا چاہیے کیونکہ جو  
 دل محبت کی تپش سے تہخ لگتا رہ رہا ہو وہ جنوں اور دیوانگی  
 کے بغیر ایسا ہے جیسے وہ گہرا سمندر جس کی موجوں میں اضطراب  
 اور تڑپ نہ ہو“

آکا مرزا نے مجھے اپنے قریب بلا کر دوبارہ اشعار پڑھنے کی خواہش کی۔ میں  
 سنا دیے۔ ان اشعار نے جادو کا کام کیا، اس نے روشن جہیں کو حکم دیا کہ وہ چند  
 تئیں میرے ساتھ تھیلے میں گزار سکتی ہے۔ میں اسے اپنی قیام گاہ میں لے گیا۔ اس  
 ت میں جتنا روشنی تھا زندگی میں وہ خوشی دوبارہ بیکسر نہیں آئی۔ روشن جہیں نے  
 تے پر نیم تار (واسکٹ) پہن رکھا تھا سرخ نیم تنے کے کنارے سنہری تاروں سے زینت  
 لے اور سینے کے اوپر دونوں طرف رو پہلے اور سنہری تاروں کی مدد سے گلاب کے  
 دل بناتے گئے تھے۔

وہ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ بدستور اویں رہی میں نے اضطراب کی کاسباب  
 بچا تو کہنے لگی: ”علی مرزا! تم اس وقت تک میرے دکھوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جب  
 ساتھ خود میری جگہ نہ لے لو“

میں نے کہا: ”روشن جہیں! تم یقین کرو کہ میں تمہاری تصویر اپنے دل کے قریب  
 لگتا ہوں ایک دن تمہاری تیں، میں تمہاری تصویر سے ہم کلام تھا اور دانستگی میں بار  
 اس کے بوسے لے رہا تھا کہ کسی چٹل خور نے اعلا حضرت سے شکایت کر دی کہ میں

مسلمان ہو کر مرتبہ پرستی کر رہا ہوں، بادشاہ نے تمہاری تصویر مجھ سے چھین کر اس چغل خ کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا کہ یہ مقدمہ آگے میں پیش کیا جائے یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ حامد اعلا حضرت نے یہ حکم افیون کے نشے میں صادر فرمایا تھا کہ ہو میں آتے ہی تمہاری تصویر مجھے داپس دلا دی اور اسنا حکم داپس لے لیا۔

رودن جبین نے بالکل غیر متعلق سی بات کی کہنے لگی: ”علی مرزا! میں کسی ایک کی ہو جانا سنا ہتی ہوں۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ پہنچتا ہے کہ میں بظاہر تمہاری قرار دی گئی ہوں لیکن تصرف میں تمہارے آکا مرزا کے رہتی ہوں اور اب یہ سننے میں آ رہے کہ بادشاہ سلامت نے بھی مجھے یاد فرمایا ہے!“

رودن جبین کی بات برے کی طرح دل میں لہر اگتی اور میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا: ”رودن جبین! تم نے جو کچھ کہا یہ سچ ہے؟“

رودن جبین نے جواب دیا: ”کلام اللہ اٹھا لاؤ میں یہی بات اسے ہاتھ پر لے کر پھر سے دہرا دوں گی۔“

میں ایک دم اچالے سے تارکی میں چلا گیا اور میرا دماغ بالکل اس لائق مذہب ان حالات اور اس انکشاف کے بعد کیا کہنا یا کیا کرنا چاہیے؟

مجھے گم گم دیکھ کر رودن جبین نے پوچھا: ”تم کیا سوچنے لگے؟“

میں نے بے اختیاری اور مدہوشی میں جواب دیا: ”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جبکہ تم میری نہیں رہیں، مجھے تمہارے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟“

رودن جبین نے چپیں بہ چپیں ہو کر کہا: ”عجیب اضمآن ہو تم بھی، کہاں کو غ کا یہ دعوا کر رہے تھے کہ مجھے عورت سے خدا بنا دیا تھا اور کہاں یہ عالم ہے کہ مجھ کنارہ کشی کی سوچ رہے ہوں۔“

میں نے پوچھا: ”رودن جبین! تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سب سے زیادہ کسے کرتا ہو؟“

اس نے کہا: ”جو مجھے سب سے زیادہ چاہے گا اور عیش و آرام پہنچائے میں اسی کو سب سے زیادہ چاہوں گی۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ابھی تک کوئے کا غد کی طرح ہو جس پر کسی تحریک کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔“

رودش جیسے جواب دیا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“

حیران اچھا ہوا، میں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا جس کی اس نے تعمیل کی اور مجھے باہر نکلتے لگی۔ مجھے اس کی صحیح الدماغی ہونے لگا لیکن بعد میں، میں اس نتیجے پر پہنچی کہ محل حمر کے ماحول ادا کا مرزا کے لئے اسے بگاڑ دیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں رہی کہ میں اس کی مالا جیتا ہوں۔ رادگان کی شکست نے مجھے کہیں کا بھی نہ دکھا اور جی۔ میں آیا کہ میں سب کچھ کر کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ مایوس انسان کی طرح یہ سوچ کر کہ اب کسے رودش جیسے نقل تعلق رکھتا ہے جو بیستر ہے اس سے نطف اندوز ہونا چاہیے۔ میں دیر تک اپنا غم ستارہا۔ رودش جیسے نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بالکل آخر میں جبکہ وہ جانے والی تھی کھل کھلا کر سنس دی اور کہنے لگی۔ ”علی مرزا! میں تمہیں عقلمند انسان نہ تھی لیکن تم اس کے برعکس نکلے، اب تک میں نے جو کچھ کہا تھا۔ جھوٹ کہا تھا۔ میں آزمایا ہی تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھے واقعی سپاہی ہو یا لپ مار رہے ہو۔ پتہ چلا ہے سارے دعوے تشریوت ہی تھے۔“

میں پھر جکر گیا اور اصرارہ آواز میں کہا۔ ”پتہ نہیں کیا پتہ ہے اور کیا جھوٹ ہے ہو یہ بھی جھوٹ ہی ہو جسے تم پتہ کی طرح یاد کر رہی ہو۔“

رودش جیسے ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ ”تمہاری مرضی جو چاہو سمجھو۔ لیکن مجھے تم پسند ہو، اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں کسی ایک سے محبت کر کے اسے اپنا سکتی ہوں جس سے شک و شبہ نہ ہو۔“

میں نے اسے شرط محبت سے آغوش میں لے لیا۔ وہ بے زاری سے ہچکا چھڑنے لگا۔ ”تم نے مجھے مایوس کیا ہے علی مرزا! مجھے تمہارے یہ چومچلے اب اچھے نہیں۔“

اسی طرح ہم دونوں کئی گھنٹے تک ایک جا رہے۔ کبھی وہ روٹھتی میں مڑاتا، کبھی میں ملالیتا اور وہ مٹالے لگتی اور اس میں ہم دونوں نے اتنا مزہ اور نطف حاصل کیا کہ دو تباہ محبت کی سیدھی سادی گفتگو میں نہ بیسر آتا۔

بادشاہ کو آکا مرزا کے شبہات اور شاہی طبیب کی تشخیص کا سب سے ہی علم ہوا میرے آکا مرزا کے پاس پہنچے اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ ”مرزا کا مران! تم ان اندیشوں کو سے نکال دو۔ تم اس کا پتہ دل میں خیال تک نہیں لا سکتے۔!“

آکا مرزا خاموش رہے اور اعلیٰ حضرت کی شکل دیکھتے رہے۔

اس دوران میں یہ خبر ملی کہ شیر خان قنوج تک آچکا ہے۔ بادشاہ نے آگرے کی حکومت آکا مرزا کے حوالے کی اور خود اتنا جرح لے کر شیر خان کے مقابلے پر پہنچ گئے۔ آکا مرزا جیسے ہی یہ خبر ملی کہ بادشاہ نے کشنیوں کے ہل کے ذریعے محمد گنگا کو عبور کر لیا ہے، فوراً آگرہ چل دیا اور اپنی سپاہ کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ عین میدان جنگ میں مجھے آکا مرزا کا یہ خفیہ پیغام ملا کہ

”مگر شہ کو تا ہیوں کو مت دہرانا۔ لاہور یا کابل میں روشن جبین تمہارا انتظار کرے گی!“

میں سمجھ گیا کہ اس طرح آکا مرزا بادشاہ کو دھوکے میں لانے اور اس کے صلے پر روشن جبین کے حاصل کرنے کا پیغام دے رہے تھے۔ دریا تے گنگا کے کنارے بڑے دروازے پر جس میں بادشاہ کو شکست ہو گئی اور وہ بدقت تمام آگرے واپس چلے وہاں کے اترانے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور کا رخ کریں کیونکہ قنوج کے بعد شیر خان دد مراد آگرے ہی میں ہو گا۔

بادشاہ فوراً لاہور روانہ ہو گئے اور شیر خان بھی موت کے سانس کی طرح اُن تعاقب میں لگا رہا۔ آکا مرزا بادشاہ کی آمد سے پریشان ہو گیا اور اس کو کشش میں لگ کر کسی طرح بادشاہ کو لاہور سے نکال باہر کر دیں۔ بادشاہ کا مران مرزا کے باغ و دل آہن ہر گئے تھے۔ یہ باغ کا مران مرزا نے دریا تے ماوسی کے کنارے لگایا تھا۔ بادشاہ یہاں چین سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پتہ چلا شیر خان سر ہند تک پہنچ چکا ہے۔ بادشاہ نے مشورے کے عالم میں مجھے طلب کیا اور کہا۔ ”علی مرزا! تم ایک

بھی شیر خان کے پاس چلے ہو“

میں نے عرض کیا۔ ”بے شک۔ کوئی مینا حکم؟“

بادشاہ نے کہا۔ ”مینا حکم کفری نہیں ہے بے سرو سامانی کے عالم میں حکم کسے ہوش ہے!“

میں نے عرض کیا۔ ”یہ ناچیز اعلیٰ حضرت کا تابع دار ہے حکم فرماتیں یہ مردے کی تعمیل بجالاتے گا۔“

بادشاہ نے اسی وقت مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ کو طلب کیا یہ دونوں معزز اتر میں نکلے جاتے تھے۔ بادشاہ نے شیر خان کو ایک خط لکھا۔

”شیرخان! تم کبھی دربار مغلیہ کے حکم خوار تھے اور اب ہمیں اپنا  
 حکم خوار بنانے کی فکر میں ہو، شیرخان! خدا سے ڈرو، آخر تم اتنا ظالم  
 کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے تمہارے لئے پورا ہندوستان چھوڑ دیا ہے  
 تم لاہور ہمارے لئے چھوڑ دو، اور اس وقت سر ہند میں جہاں تم ٹھہرے  
 ہوتے ہو اسے ہمارے سادراپنے درمیان حد قرار دے لو۔“  
 یہ خط بادشاہ نے ہمارے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسی وقت شیرخان سے مل کر  
 اس کا جواب لاؤ۔

میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ آکا مرزا نے خطیہ طور پر مجھے ایک خط شیرخان  
 کے نام دیا۔ اس میں آکا مرزا نے لکھا تھا کہ ”شیرخان! تم نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے  
 کہ صلح کر لو گے، بھائی ہمالوں، ہندوستان سے رخصت ہونے دے لے ہیں کیا تم اپنا وعدہ پورا  
 کرنے میں تیار ہیں؟ کام لے رہے ہو یا کوئی اور مصلحت ہے؟“  
 میں نے آکا مرزا سے پوچھا۔ ”آپ کی شیرخان سے بات چیت کب سے چل  
 رہی ہے؟“

آکا مرزا نے سنسنی فیزانٹ ف کیا۔ ”جی ہم! آگے سے میں تھے، شیرخان نے ہمیں یہ  
 یقین دلایا تھا کہ اگر ہم اعلیٰ حضرت کا ساتھ نہ دیں اور اپنی فوج لے کر لاہور چلے جائیں تو  
 شیرخان اس نرم رویت کے صلے میں ہمیں لاہور میں حکومت کرنے دے گا اور ہم سے تقابلہ  
 نہیں کرے گا۔“

میں آکا مرزا اور بادشاہ کا پیغام لے کر سر ہند پہنچ گیا۔ مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ  
 شیرخان کے دو سردار پہنچ کر بہت زیادہ مرعوب ہو گئے۔ میں نے بدقت تمام اپنے بادشاہ  
 کا پیغام شیرخان کو پہنچایا اور چٹکے سے آکا مرزا کا پیغام بھی دے دیا۔ شیرخان نے  
 اس کا جواب نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ تم لوگ لاہور واپس جاؤ، ہمارا کوئی جوابات لے کر  
 خود ہی حاضر ہو جاتے گا۔“

ہم لوگ واپس چلے آئے اور آکا مرزا اور بادشاہ بے چینی سے شیرخان کے جواب  
 کا انتظار کرنے لگے۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بادلوں کے متلے متلے ٹکڑے لپتے پیتے پھلاتے  
 آٹے پھر رہے تھے۔ بادشاہ باغِ دلِ آہن کی بارہ دہری میں موسمِ کامرہ لے رہے تھے کہ خدام  
 شاہی نے مطلع کیا۔ ”شیرمنافِ قاعدہ جوابات لے کر حاضر ہو گیا ہے۔“

بادشاہ لفظ "جوابات" پر چونک پڑے انہوں نے اسی وقت یہ فرمان جاری کیا کہ شیرخانی جوابات کو سننے اور اس پر غور و خوض کرنے کے لئے فوراً ایک مجلس منعقد کی جائے جس میں سات سال سے لے کر ستر سال تک کے مرد و بزرگ کمریں۔

وہیں بارہ مدعی میں ہم سب جمع ہو گئے، شیرخانی قاصد ہمارے سامنے بٹایا گیا اور اس نے دو خط بادشاہ کے حوالے کر دیے۔ ۱۔ کامرنا نہایت ہوشیار سی سے فرار ہو کر اپنے "نور لکھا باغ" میں روپوش ہو گیا۔

بادشاہ کے خط کا جواب شیرخان نے دیا تھا۔ "تم سر ہند کو حصر فاصل بنانا چاہتے ہو، ہم تمہاری درخواست سسر دو نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم نے تمہارے لئے کابل چھوڑ دیا ہے تم لاہور سے کابل چلے جاؤ۔"

بادشاہ کو اس مختصر اور پُر غصہ جواب پر غصہ تو بہت آیا لیکن اتر درویش بر جان درویش، کمر بھی کیا سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ اور صبر کا تلخ پھل حلق کے نیچے آ کر لیا۔ اس کے بعد آ کامرنا کے خط کا جواب پڑھا گیا۔ شیرخان نے آ کامرنا کو لکھا تھا، "کامران مرزا! سب تک ہم نے آگرہ فتح نہیں کیا تھا مسالوات سمجھ اور تھے اب حالات کچھ اور بین / چند دنوں کی بات ہے کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں تلے ہو گا ہمارا یہ مشورہ ہے کہ تم ہم سے جنگ آزما ہو کر بلاد ہماچلی فوجی قوت کو نقصان نہ پہنچاؤ تم کابل چلے جاؤ، اہم وہاں نہیں آئیں گے!"

۲۔ کامرنا کی سازش کا سمجھنا تھا کہ مجلس کے جملہ ارکان "شرم شرم" کی آہ ازین بلند کر لے لگے اور کسی قطعی ملتے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجلس برخواست ہو گئی۔ بادشاہ نے شیرخانی قاصد کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سب قتلی احکام کے پابند ہیں، اگر وہ یہی سپاہی ہے کہ ہم کابل چلے جائیں تو ضرور چلے جائیں گے لیکن چونکہ ہمیں ابھی خدا کے آخری فیصلے کا کوئی علم نہیں ہے اس لئے پوری قوت سے ہاتھ پیر باز کمر بھاں رکنے کی کوشش کریں گے۔

بادشاہ دِل برداشتہ ہو کر حرم میں چلے گئے۔ ایک دن اچانک بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا عجب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مجلس مشاہدت جمی ہوئی ہے۔ بادشاہ کے بھائی مرزا ہندال بھی وہیں موجود تھے اور ان کے پہرے کا کھینچاؤ یہ بتاتا تھا کہ وہ کسی بات پر سخت برہم ہیں بادشاہ کے پہرے پر ملال کے اثرات تو ضرور تھے لیکن غصہ نہیں پایا جاتا

تھا۔

بادشاہ نے مجھ دیکھتے ہی اپنے قریب بلایا اور نہایت ملامت سے سوال کیا: علی مرزا! دیکھو، مرزا کامران کے مقابلے میں ہم تم سے کہیں زیادہ وفاداری کا حق رکھتے ہیں پر سچ سچ بتاؤ یہ مرزا کامران آخر چاہتا کیا ہے؟

میں نے عرض کیا: ”اعلا حضرت! یہ ناپسندیدہ انسان ہی عرض کر سکتا ہے کہ جو سودا شیرخان کے دماغ میں سکایا ہوا ہے وہی آکامرزا بھی چاہتے ہیں اور جو بسے حاصل ہے اس سے زیادہ کی ہوس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔“

مرزا ہندال نے طیش میں کہا: ”اعلا حضرت! جب تک مرزا کامران کو غیرت ناک سزا نہیں دی جائے گی، شاہی التوا میں اتحاد اور یک جہتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور تمہیں ہر محاذ پر شکست کا سامنا ہونا پڑے گا۔“

چند دوسرے شہزادوں نے بھی مرزا ہندال کے خیال کی تائید کی اور سر جھٹکاتے، فکر مند بادشاہ کے انداز سے یہ شبہ گزرنے لگا کہ شاید آج مرزا کامران کے خلاف کوئی خطرناک فرمان صادر ہو کر رہے گا۔

مرزا ہندال نے مزید کہا: ”شاید حضور والا کو اس بات کا علم نہیں کہ ہم سے جو لغزشیں یا گستاخیاں سرزد ہو چکی ہیں ان میں مرزا کلران کا ہاتھ ضرور موجود تھا، وہ ہمیں سپاہتاکہ اعلا حضرت بادشاہ کہلاتے ہیں، وہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے!“ اور ذرا دھیمے لہجے میں کہا: ”اور خدا نے ہمیں یہ صریح حکم دے رکھا ہے کہ سودی کو ایذا پہنچانے سے پہلے قتل کر دو!“ ہمالیوں نے بے چین ہو کر سر اٹھایا اور صاف اور صریح لہجے میں جواب دیا: ”مرزا ہندال! باوجود اس کے کہ ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا اور ان کی بڑی سے بڑی غلطی سے دو گز نہ گونا۔ پھر ہم دودھ کی زندگی کو مرزا کامران کے خون سے داغ دار کیوں کر لیں۔ ہم مرزا کامران کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

بادشاہ نے اس دودھ کو قبضے نے ہم سب کو بہت متاثر کیا اور اس کی عظمت کا ہمیں دل و جان سے قابل ہونا پڑا۔



مرزا کامران کو خطرہ ہوا کہ بادشاہ سلامت کہیں کابل کا رخ نہ کریں اس نے بادشاہ کو اس خیال سے باور رکھنے کی کوشش کی اور بالآخر بادشاہ کو بتاتے بغیر اپنی فوج کے ساتھ کابل

مدانہ ہو گیا اور دل میں یہ ارادہ کر کے گیا کہ اگر ہمایوں نے کابل کا رخ کیا تو انہیں بے قوت روک دیا جاتے گا۔

بادشاہ نے مایوس ہو کر واقعی کابل کا رخ کیا، ابھی وہ ہزارہ تک پہنچے تھے کہ خبر دا نے خبر دی، مرزا کامران مرزا احمد اور مقابلے کی نیت سے واپس آ رہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہی پریشا ہو گئے اور انہوں نے دریافت کیا: ”کیا ہم سب بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر مرزا کامران آ انتظار کریں؟“

ہمایوں نے جواب دیا: ”اس کی کوئی ضرورت نہیں، جب ہتھیاروں کی ضرورت ہوگی تو خود ہی اس کے احکام صادر فرمادیں گے۔“

بادشاہ کی نرمی سے لوگ دل برداشتہ اور مایوس ہونے لگے۔ بادشاہ زندہ بکتر پہنچے ہوئے ہم حب کے ساتھ نمودار ہوئے اور یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ ”مرزا کامران آچکا ہے اور بادشاہ نے قہر بوسی کی اجازت پما ہی ہے!“

لوگ سمجھ ہونے کے دھڑکے میں کسی اہم اعلان کی امید کرنے لگے۔ اس وقت میں بادشاہ کے قریب ہی تھا۔ کامران ایک طرف سے اچانک نمودار ہو۔ اور برٹھ کر بادشاہ کے قدموں میں جھک گئے اور منڈریاں پکڑ کر آئینہ ہانے لگے۔ بادشاہ نے اس کی نشت پتھپھانی اور کہا: ”کامران مرزا! میرے بازو میری قوت، دو تے کیوں ہو؟ آٹھو اور مردوں کی طرح آئینہ پونچھ کر ہمارے رتہ برد کھڑے ہو جاؤ!“

سب ہاتھ پکڑ کر کامران کو آٹھایا گیا تو وہ ہچکیاں لے رہے تھے۔ بادشاہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور پوچھا: ”کامران مرزا

تم کیوں رو رہے ہو؟“

کامران نے تقریباً ہچکیوں میں جواب دیا: ”اعلا حضرت! ہندوستان کی آب و ہوا ہمارے صحت بگاڑ دی ہے ایک تو صحت خراب ہے اس پر مسلسل جنگیں، ان پریشانیوں نے ہمیں عاجز کر رکھا ہے!“

بادشاہ نے پوچھا: ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

کامران نے کہا: ”اعلا حضرت! ہمیں کابل چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں!“

بادشاہ نے جواب دیا: ”تم کابل جا سکتے ہو، ادھ کچھ؟“

کامران نے عرض کیا: ”حضرت فردوس سکا فی (ہا ہر) نے اپنی زندگی ہی میں کابل ہمارا والدہ کو دے دیا تھا، اگر اسے جنگ و جدال سے محفوظ رکھا جائے تو بڑا کرم ہوگا!“



بادشاہ کو آکا مرزا کی اس درخواست نے پریشان کر دیا، کہا: "اکامران مرزا، یہ بھی تو سوچو، ہندوستان چھوڑنے کے بعد ہم سر کہاں چھپائیں گے؟"  
 بے حس اور خود غرض آکا مرزا نے جواب دیا: "اعلا حضرت کی فکر فلک گیر بس پناہ گاہیں لاش کر سکتی ہے، ایک کابل ہی پر کیا دو قوف ہے؟"  
 ہمایوں نے کہا: "اکامران مرزا، کابل تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا، ہم تو دلدل میں لیتے ہیں گے اور بس؟"

لیکن آکا مرزا کسی طرح بھی اس پر تیار نہ ہوتے کہ بادشاہ کابل جا تیں، آخر کار بادشاہ نے اکامران مرزا سے وعدہ کیا کہ وہ کابل نہیں جا تیں گے اور وہ ہزارہ سے واپس ہو کر سندھ کی طرف چل پڑے۔ آکا مرزا کابل چلے گئے۔ اور یہیں سے شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ مرزا ہندال نے بھی بادشاہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مرزا ہندال گجرات چلے گئے۔ آکا مرزا نے کابل کی راہ، ظاہر ہے روشن جبیں بھی ان کے ساتھ ہی ہوگی، یس بادشاہ کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں حالات کے ایک ایسے موڑ پر آچکا تھا جہاں مستقبل کا تعین کرنا بہت دشوار تھا، میرے سامنے یا تو انتہاء تاریکیاں تھیں یا سنگلاخ، ویران میدان۔ بے برگ و گیاہ صحرا۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا: "علی مرزا، اگر تم چاہو تو اکامران مرزا کے پاس چلے جاؤ؟"

میں نے جواب دیا: "اعلا حضرت، کابل کا گوشہ مسکون و انبساط لینے واس میں دلیسی عظمت نہیں رکھتا، جیسی مجھے آپ کی بے سرو سامان، ہم رکابی میں حاصل رہے گی۔"  
 بادشاہ نے جیسی نظروں سے مجھے دیکھا، یس یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں میرے لیے شکر اور امتنان، احسان و اطمینان کا بے پایاں جذبہ موجود تھا۔

ہمایوں کی یہ داستان جو آپ پڑھ رہے ہیں، اس میں بڑی عجبتیں ہیں، اس میں انسان کی عظمت و رنالت پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ یس علی مرزا جو اس داستان کا راوی ہوں، بھول ہو کر کا پٹلا ہوں، شرم سے آخر تک میں یہی چاہوں گا کہ دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور مجھ جو جیسا نظر آیا، اس کو اسی طرح پیش کر دیا جلتے۔  
 جب بادشاہ بھگت میں داخل ہوا تو پتہ چلا، ہندال مرزا واپس آ گیا ہے۔ شاہی خاندان نے شہزادے کی واپسی کی خوشی میں اعلا حضرت کی خدمت میں حاضری دی جو توجہ

میں حمیدہ بالو بیگم بھی تھیں۔ یہ مرزا ہندال کی سسرالی عزیزہ تھیں۔ بادشاہ کو حمیدہ بالو بیگم بہت پسند آتیں، تاہم پرائیویٹ دیکھتے رہے پھر پوچھا: "ان کی تعریف؟" کسی نے عرض کیا: "یہ میرا بادشاہ کی صاحبزادی حمیدہ بالو بیگم ہیں!" بادشاہ نے کہا: "میرا بادشاہ دوست ہمارے رشتہ دار ہوتے ہیں!" پھر بیگمات سے فرمایا: "ہمیں حمیدہ بالو بیگم پسند آتی ہیں۔ ان کے بزرگوں سے کہو، انہیں ہمارے نکاح دے دیں!"

مرزا ہندال بگڑ گئے۔ بیوروں پر ٹل ڈال کر بولے: "اعلا حضرت! اس لڑکی کو ہم اپنا بہن یا سچی تصویر کرتے ہیں، آپ غریب الوطن بادشاہ ہیں ان حالات میں اگر لڑکی کو اچھی طرز رکھ سکے تو کیا ہو گا؟" بادشاہ کو میں نے پہلی بار ناراض اور خفا ہوتے دیکھا، وہ غصے میں اسٹھ ادا ایک طرف چلے گئے۔

مرزا ہندال کے کالوں پر جوں تک نہ رہی، بادشاہ کو جاتے ہوئے اطمینان سے دیکھتے رہے۔

مرزا ہندال کی ماں نے بیٹے کو ڈانسا کہ بادشاہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے بادشاہ کو نہایت تسلی آمیز خط لکھا اور اعلا حضرت کو یقین دلایا کہ وہ حمیدہ بالو بیگم کو بادشاہ سے شادی کر لینے پر آمادہ کر رہی ہیں لیکن حمیدہ بالو تیار نہیں ہو رہی ہیں ایک دن بادشاہ سلامت نے تمام بیگمات کو اپنے گھر جمع کیا، شان دار محفل جمی لیکن اس محفل میں حمیدہ بالو نہیں پہنچیں، بادشاہ نے کسی بیگم کو حکم دیا کہ وہ حمیدہ بالو کو بھی بلا لیں۔ جب انہیں بلایا گیا تو انہوں نے کہلو ا بھجوا۔

"اعلا حضرت سے کہو کہ اگر اس ناچیز کی طلبی کو رخصت دے دیا جائے تو اس کی غرض سے ہمارے دل میں یہ عزت حاصل کر چکی ہوں!"

اس بار بادشاہ نے مرزا ہندال کو حکم دیا: "مرزا ہندال! حمیدہ بالو تمہاری عزیزہ ہیں؟ انہیں ہمارے دل میں دلالت!"

مرزا ہندال تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا: "اعلا حضرت! حمیدہ بالو کہتی ہیں کہ بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے لیکن بار بار دیکھنا جائز نہیں کیونکہ بادشاہ بھی ناخبروں میں آتے ہیں۔"

بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا: "اس شریف لڑکی سے کہو کہ اگر ہم ناخبر ہیں تو

بیب محرم بھی بن جاتیں گے وہ سارے تو کہتے۔  
یہ بالکل فطری بات ہے کہ بادشاہ کی طرف سے حمیدہ بانو کے لئے جتنا اشتیاق رہا تھا مجھے اپنی روشن جبین شہرت سے یاد آ رہی تھی۔ لہٰذا ناکامی اور مہجوری نے چولا اور حاسدانہ روش اختیار کی۔ اس دقت پیری سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ اسے کاش وہ حمیدہ بانو کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

میں نے سنا، ہندال مرزا کی ماں چالیس دن تک حمیدہ بانو کے پیچھے پڑی رہیں  
نہوں نے حمیدہ بانو سے کہا: ”بھتی، یہ بات تو نہیں ہے کہ تم شادی ہی نہ کرو اور آخر کار  
انہ کسی سے نہ شادی کہہ دو گی ہی، پھر بادشاہ سے بہتر کون آدمی ہوگا؟“  
حمیدہ بانو بے ستورانہ کر رہی تھیں، بولیں: ”یقیناً میں کسی نہ کسی سے شادی ضرور  
لی گی لیکن وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کا گرمیان میرے ہاتھوں کی دسترس میں ہوگا  
میرے بادشاہ سلامت تو ان کا گرمیان تو گرمیان، دامن تنگ ہاسمہ نہ پہنچیں گے!“  
پھر معلوم نہیں کس طرح حمیدہ بانو شادی پر آمادہ ہو گئیں۔ بادشاہ نے اصطغر  
ہاتھ میں لے کر مبارک گھڑی کا انتخاب فرمایا اور میر ابوالبقاعا ہی ایک بزرگ کے ذریعے  
چیدہ چھوایا اور میر ابوالبقا کو دلا کر رہے بطور حق لکھا نہ عطا فرمائے۔ نکاح کے تین  
بعد بھگت روانہ ہو گئے۔

بادشاہ اور حمیدہ بانو کا ملاپ میر سے دلی پر کوہ گماں بن کر گرا اور بڑی طبیعت  
شاہ کی طرف سے اچھا ہو گئی۔ میں جلد از جلد آکا مرزا کے پاس چلا جانا چاہتا تھا لیکن  
بادشاہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا اور وہ سندرھ کے ریگستان میں بھٹکتے پھر رہے  
جیسلمیر کے ہندو راجہ نے تو میراں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو اپنی اطاعت و احترام  
قین دلا کر کمر بٹا کر لے آئے اس کا ارادہ یہ تھا کہ جب بادشاہ اس کے قبائلوں سے جاتیں گے  
وہ انہیں گرفتار کر کے شیر شاہ کی خدمت میں روانہ کر دے گا اور اس طرح شیر شاہ کا  
خاد واصل کرنے کا لیکن کسی طرح بادشاہ کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ جیسلمیر  
نے کے سچے عمر کوٹ روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بادشاہ کے آدمی  
آدمیوں کو پکڑ لائے اور کہا: ”یہ دونوں جیسلمیر کے راجہ کے جاسوس ہیں!“

ان دونوں کے ہاتھ ریشموں سے بندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت نے ان  
سے باز پرس شروع کی، ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ دونوں قیدیوں نے ہاتھ  
جھٹکا دے کر خود کو ریشموں سے آزاد کر لیا اور بادشاہ کے آدمیوں کی کمرلوں سے تلواریں

کھینچ کر مار کاٹ شروع کر دی بادشاہ گھبرا کر پیچھے ہٹے لیکن اس کوشش میں ان کو گھوڑا مارا گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے ان پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور ان دقتوں کو قتل کر دیا گیا۔ ابھی اس ناگہانی افتاد کا اثر کم بھی نہ ہوا تھا کہ شہر اٹھا جیسلمیر کا لاجپال بادشاہ کو گرفتار کرنے ان پہنچا ہے۔ بادشاہ کا گھوڑا کام اچھا تھا۔ ایک گھوڑا حمیرہ کی سواری میں تھا، بادشاہ کے آدمیوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ نے ترمادی بیگ نامی ایک امیر سے درخواست کی کہ: "ہمیں سواری کے لیے ایک گھوڑا دے دو۔"

لیکن ترمادی بیگ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ پیشانی پر مٹا گواڑی کی شکن لاتے بغیر اپنا اونٹ کی طرف بڑھے اور حمیرہ ہانڈ کو گھوڑے پر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ مہریم بیگ نامی اے دہرہ امیر آگے بڑھا اور اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ آوارہ گرد دور پر نصیبوں کا غافلہ عمر کوٹ کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں مالدیو کے آدمیوں نے رد کرنے کوشش کی لیکن بادشاہ کے کسی تیرانداز کے تیر نے اتفاقاً طور پر مالدیو کی سپاہ کے سر کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرادیا جس سے اس کی سپاہ ڈر کر بھاگ گئی اور بادشاہ کا قلعہ عمر کوٹ پہنچ گیا۔

عمر کوٹ کا رانا بادشاہ کے استقبال کے لیے خود آیا اور نہایت عزت و احترام اپنے قلعے میں لے گیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعے کے باہر ہی رکھا۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ اب میں بادشاہ سے یہ شخصیت ہو جانا چاہتا ہوں بادشاہ نے راجن مستقبل پر ہذا بھی یقین نہ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اس میں غرور و مسافرت میں کسی جگہ بھی بادشاہ مارا جاسکتا تھا۔ جب میں نے بادشاہ سے رخصت کرنا اس بات چاہی تو انہوں نے دریافت کیا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں کابل جانا چاہتا ہوں۔" بادشاہ کچھ دیر سوچ رہا تھا، پھر فرمایا۔ "اچھا، اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو ضرور ہمارے حالات بھی بڑے غیر یقینی ہیں اور یہ تمہیں کسی وقت کیا ہو جائے؟" پھر یہ "ہم تم سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں کیا تم ان کے جوابات خدا کو حاضر و ناظر جان کر دے گے؟"

میں نے قدم باندھ کر عرض کیا۔ "محض سلامت نے اب تک اس ناپہنچ پر جو حکم فرمایا ہے وہ سب سمجھ، اگرچہ میں بھی تو حقیقت نہ بولنے دے گی۔"

بادشاہ خوش ہو گیا اور کہا: "کامرٹن ہمارا بھائی ہے اور ہم تمہارے بادشاہ ہیں، تم کو کہہ دو (دودھ شریک) ہو اب ہمیں یہ بتاؤ کہ اگر کوئی دقت پڑے تو تم کس کا ساتھ لان کا یا ہمارا؟"

اس پر لیٹان ہو گیا، جواب کے ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف کھائی۔ اگر میں حق میں جواب دیتا جو میرا کو کہ تھا تو بادشاہ کی ناراضی کا خطرہ تھا اور اگر جھوٹا تاہ کی حمایت میں جواب دیتا تو مہریراف النفس بادشاہ شاید یہ سوچنے لگتا کہ جو اپنے دادہ کسی اور کا کس طرح ہوگا۔ اچانک دھیران کی روشنی عقل کی گمراہی پر غالب آنے سے جواب دیا: "اعلا حضرت! رسول اللہ کی حدیث ہے کہ مسلمانوں! تم اپنے مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اور جیب کسی نے یہ پلو چھا تھا کہ ظالم کی مدد کی جائے؟ تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دے!"

بادشاہ میرے جواب سے بہت خوش ہوئے اور مجھے دایسی کی اجازت دیتے رہا۔ "ہماری پٹھوئی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، وہ کامران کو دیر راحت پر لانے کی کریں گی۔"

پس بادشاہ کی پٹھوئی خانزادہ بیگم کو لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ اس دقت جہاں شاہ کی ہم نشینی چھوڑنے کا علم تھا وہیں یہ خوشی بھی تھی کہ میں حمیدہ بالواد بادشاہ مرت ملاپ کی تلخی سے محفوظ ہو گیا تھا۔

مجھے ملنے ہی میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ آکا مرزا نیزا ہندال کے علاقے پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ قندھار کے حکمران قراچہ خاں نے ازراہ نوازش شاہ نوازی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے قندھار کی حکومت مرزا ہندال کو ادا کی تھی لیکن آکا مرزا اس فکر میں تھے کہ قندھار بھی اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ حضرت بادشاہ کی پٹھوئی خانزادہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ "کابل کے بجائے قندھار میں دہیں کامران مرزا کو بلا کر دولوں بھائیوں داکا مرزا اور مرزا ہندال) میں اٹھا کر آئی۔"

ہم بدقت تمام قندھار پہنچ گئے۔ عسکری مرزا، آکا مرزا کے حکم پر اس کا محاصرہ کرتے تھے۔ میں قندھار میں داخلے کی اجازت نہیں ملی یا ہر ہی روک لیا گیا۔ عسکری مرزا پٹھوئی کی خدمت میں آداب بجالایا، خانزادہ بیگم (پٹھوئی) نے عسکری مرزا کو حکم دیا کہ

”کامران مرزا کو نذر البلاۃ میں آئیں سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“

چوتھے دن آکامران بھی حاضر ہو گئے۔ وہ خانزادہ بیگم سے ادب و احترام کرتے لیکن مجھے خوشگین نظر دل سے دیکھا۔ خانزادہ بیگم انہیں خلوت میں لے گئیں اور کم تک سمجھاتی رہیں جس کا تفصیلی علم نہ ہو سکا بعد میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ آکامران کو اخلاص کی تلقین کرتی رہیں اور آکامران اس پر متحرک رہے کہ کابل کی طرح قندھار میں بھی نام کا خطبہ پڑھا جاتے۔

پھر آکامران اور خانزادہ بیگم میں زبردور سے باتیں ہونے لگیں۔ خانزادہ رہی تھیں۔ ”کامران! اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہی کہوں گی کہ ہمایوں کی بادشاہ فیصلہ خود فردوس مکانی (دبائر) فرما گئے ہیں اور ایک عرصے تک تم خود بھی اسی کے نا پڑھتے رہے ہو، تمہیں اب بھی ہمایوں کو اپنا بڑا سمجھنا چاہیے، اس کی فرماں برداری کر اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔“

آکامران اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ بولے: ”آپ کا ارشاد سچا لیکن ان یہاں سے بہت دور ہیں سرحدست ہمارے ہی نام کا خطبہ پڑھ دیا جائے پھر جب آجائیں گے تو ان کے نام کا خطبہ شہر درخشاں کر دیا جائے گا۔“

شاید دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ آکامران منہ بناتے ہوئے اور مجھے ایک بار پھر خوشگین نظر دل سے دیکھا۔ جلتے جلتے انہوں نے مجھے اپنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ایک دوسرے نیچے میں سے گئے۔ ان کے تئوہی سے میں نے پاؤں کا فیصلہ پڑھ لیا تھا۔

وہ خود تو بیٹھ گئے لیکن مجھے کھڑا رکھا۔ بولے ”ہم نے تو یہی چاہا تھا کہ تیرے اعلام منصب پر خزانہ کو دیں لیکن تو کوتاہ اندیشی کم ہمت اور ہندل ہے، تو نے اپنی عمر بہترین حصہ بلاوجہ ضائع کر دیا، اگر ہم تجھ سے یہ سوال کریں کہ تو نے اپنے منصب کو کیسے تک پایہ تکمیل کو پہنچایا تو تو اس کا کیا جواب دے گا؟“

میں نے جواب دیا: ”آکامران! عملاً بادشاہ کا کام تمام ہو چکا ہے اور جسے ذلیل کر چکا ہوا ہے انسان کیوں ذلیل کرے؟“

آکامران نے شاہانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ ان کے اطوار اور باتوں سے کہ شخص بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ آکامران میں ایک بادشاہ کا سزاں جلوہ گم ہے، ان درشت اور شاہانہ تھا رہا انہوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع اور صاف صاف جتاہ

اس وقت تو دنیا کا بد قسمت ترین انسان ہے کیونکہ تو نہ تو آوارہ گرد ہمالیوں کا  
مل کمر کا اندر نہ ہی ہماری نظر میں معتد رہا۔ ہم تجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور  
آزاد رہنا ہمارے لئے خطرے کا موجب ہے۔“  
اتن کے بعد انہوں نے تانی بجائی اور تجھے چند سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوئے  
اسے کابل کے قلعے میں قید کر دیا جاتے۔  
اس خلافِ آئینہ حکم نے میرے اداکار خطا کر دیے۔ اسی وقت ان سپاہیوں نے  
باور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

آہ، میں ان اذیتوں کو کین لفظوں میں بیان کروں جو مجھے آکامرا کی طرف سے  
گئیں۔ وہ تمام قدرتی نعمتیں، جنہیں انسان کوئی قیمت ادا کیے بغیر حاصل کر لیتا  
ہے ان سے محروم کر دیا گیا۔ روشنی۔ میں ایک عرصے تک اس سے محروم رہا، ہوا۔  
ایک کوٹھڑی کی گھٹی میں، میں ایک ایک جھوٹے کوترس گیا۔ ہم جنسوں کی آوازیں  
پر نہ تھا کہ میں اب بھی انسانوں کی دنیا میں ہوں یا گوشہ قبر میں یکسرین کا منتظر  
انی۔ نیم گرم پانی نے میرے معدے کو تباہ کر کے نہ کھ دیا۔ کھانا۔ جو بھی ملتا اس  
لذت ہوتی اور نہ مقدار میں اتنا ہوتا کہ میں چیٹ بھر سکتا۔ ایک تہہ ہم سی شمع یوں  
ہنی جسے تاریک ترین رات میں آسمان پر مٹتی اور کمر درسا ایک تہہ ستارہ۔ مجھے  
نیا کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شب و روز کا تصور تک ختم ہو چکا تھا،  
غریب اس کمرے کی مانند تھی جہاں ہمیشہ رات رہتی ہو۔ اس ماحول نے میرے جملہ  
اکو متاثر کیا، ماضی کی یادیں اور ان کا تصور میرے حق میں کتاب کی طرح تھا جسے  
میں دل بہلانے کی کمرشش کرتا رہتا۔ نامعلوم لیکن تاریک خیالی مستقبل قبر کی طرح  
لے سنے کھڑا تھا اور میں چیونٹی کی چال سے زندگی کا سفر طے کرتا اس کی طرف  
بلا جا رہا تھا۔

ایک دن خلافِ معمول آکامرا کی آواز سنائی دی، وہ ایک سلتے کی طرح سلتے  
مجھ سے مخاطب تھے۔

”علی مرزا! کیا تیرے ہوش و حواس اب بھی کام کر رہے ہیں؟“  
جیرالڈ اس حد تک سمجھ چکا تھا کہ اس آواز نے نہ تو مجھے خوش کیا نہ مشتعل۔

آکا مرزا نے کہا: ”کیا تو یہاں سے نکلنا پسند کرے گا؟“  
 میں نے کمزور آواز میں جواب دیا: ”میں موت کا منتظر ہوں آکا مرزا، آپ  
 جانیں اور مجھے مر جانے دیں۔“

وہ منہ سے اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ مجھ  
 کہتے رہے۔ سورج کی روشنی میں میری آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں اور مجھ  
 پر معلوم ہوا کہ میری بصلت بہت زیادہ زائل ہو چکی ہے۔ میرے قدم بڑھ کر اس  
 چلنے کی عادت بھٹکا چکے تھے۔ کئی جگہ میں گرتے گرتے سچا۔

آکا مرزا مجھے ایک نہایت بڑا تکلف کرے ہیں لے گئے، مجھے وہاں  
 دھندلی دھندلی نظر آتی تھی، اور تو یہ ہے کہ مدشن جبیں دیر تک وہاں موجود  
 میں سے پہچاننے تک سے قاصر رہا۔ آکا مرزا نے لذیذ ترین کھانے میرے سامنے  
 لیکن میری اشتہا انزکب کی ختم ہو چکی تھی۔ جب میں نے کھانے سے بھی منہ موڑا  
 آکا مرزا کو پہلی بار اپنے ظلم و جور کا احساس ہوا اور شاید اپنی اس زیادتی پر نیش  
 ہوتے، بولے: ”علی مرزا! غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں، تم پر جو کچھ بتی اس  
 مرضی پر گزرتا ہوں نہ تھی۔ ہم تو ادا صراۃ صراۃ صراۃ میں آئے ہیں اور تم قید تہائی؟  
 لیکن ہم جیسے ہی واپس آتے پہلے تمہارے پاس پہنچے۔“ پھر مدشن جبیں کو آد  
 ”مدشن جبیں! کیا تم نے بھی علی مرزا کو نہیں پہچانا؟ ادھر آقا ان کے قریب۔  
 بینائی کو شاید تاریکی کھا گئی ہے۔“

مدشن جبیں دب بالکل میرے قریب آگئی تو میں نے بھی اسے پہچا  
 کی مغالطہ اور اجنبیت کی روش سے مجھے یہ احساس گزرا کہ شاید وہ بھی اس  
 کو نہ پہچانے ہی میں بہتری محسوس کر رہی ہے۔  
 آکا مرزا نے کہا: ”علی مرزا! اگر تم چاہو تو مدشن جبیں کے ساتھ کچھ  
 گزارو۔“

میں نے اصرار وگی سے جواب دیا: ”نہیں اب میں اس کی ضرورت  
 محسوس کرتا۔“

آکا مرزا نے بھی سزید اصرار نہیں کیا اور سر کے اشارے سے مدشن  
 جانے کا حکم دیا۔  
 تنہائی میں آکا مرزا دیو تک تسلی دلا سے دیتے رہے، انہوں نے:



کہ میرے جو اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں وہ شاہی طبیب سے ان کی پچھلی توانائی بحال کرانے کے لئے دن بعد حرف مطلب زبان پر لاتے ہوئے "علی مرزا! تم ہمارے دودھ بہاؤ اور یہ دودھ ہی کا اثر ہے کہ ہم تمہیں اس کال کو ٹھہری سے باہر نکال لاتے، مگر کہ نیشیت سے تم پر ایک فرض حائد ہوتا ہے کیا تم اسے پورا کرنے پر آمادہ ہو؟"

میں نے زبان کے بجائے آنکھوں سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

آکا مرزا چبا چبا کر بولے۔ "ہالیوں ایران پہنچ چکا ہے اور طہاسپ صفوی سے دکا طالب ہے، حالانکہ تمہیں یاد ہو گا کہ تم نے خود ہی ہم سے یہ کہا تھا کہ عملاً ہالیوں کا اتمام ہو چکا ہے اب اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن وہ تو متا ہی سخت عیان نکلا علی مرزا! یہیں ڈر ہے کہ صفوی بادشاہ اسے مدد دے کر پھر سے دشاہ نہ بنا دے، اب ہمیں ایک جنگ لڑنی ہے جو ہتھیاروں سے نہیں باتوں سے لڑی گئی ہے!"

آکا مرزا اپنی باتوں کا تاثر جاننے کے لئے رستے کے ادیتیز نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگے لیکن اس وقت میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ علی مرزا! کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟ کیا تم ہماری توت سماعت صحیح کام کر رہی ہے؟"

میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "ابھی میں بہر انہیں ہوا!"

آکا مرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بہرے نہیں ہوتے، ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ تم ایران چلے جاؤ، ہالیوں سے ملو اور اسے ہمارے جبر و ظلم کی داستان سنا کر اپنے اعتماد میں لے لو، یہاں تک پہنچ جاؤ تب تم نہایت ہوشیاری سے کسی بھی طرح صفوی حکمران کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ ہالیوں ایک نا اہل انسان ہے اسے کسی قسم کی بھی مدد دینا، اپنی دولت اور آدمیوں کا نقصان کرنا ہے صفوی بادشاہ کو ہر قیمت پر ہالیوں کی دستگیری سے روکنا ہے!"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گم سم پاگل کی طرح ان کی صورت دیکھتا رہا۔ دھندل دھندلی تباہ آلود صورت۔

آکا مرزا نے پھر مڑا لیا۔ "علی مرزا! تمہارے ہوش دجو اس صحیح کام کر رہے ہیں؟"

میں نے پھر جواب دیا کہ "ہاں ابھی میں پاگل نہیں ہوا!"

آکا مرزا نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ تم پاگل نہیں ہو گئے۔ تب پھر تم کب تک ایران چلے جاؤ گے۔ جب تم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو کر واپس لوٹو گے تو قندھار حکومت تمہیں خوش آمدید کہے گی۔ اور روشن جبین، اپنی دس حسین و جمیل کیزوں۔ ساتھ اپنی مکڑ مٹ سے تمہارا استقبال کرے گی۔“

شاید پہلی بار میں مسکرایا اور اس گونگے کی طرح زبان کھولی، جو بولتے ہو۔ ایک دم، مدتِ مہد کے لئے خاموش ہو گیا ہوا، اور سالہا سال کے بعد وہ پھر بولنے لگا۔ جب وہ کمر دیا گیا ہو۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ ”آکا مرزا! گو کہ مجھ پر بڑے ظلم ہوئے، لیکن تم میرے دودھ شریک بھائی ہو۔ میں اب بھی تمہارا وفادار ہوں، مجھے خوشی ہے بات کی ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے جو شکوک اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔“

”ادہ ہمارے بھائی علی مرزا!“ یہ کہہ کر آکا مرزا مجھ سے لپٹ گئے اور وہ تک میری پیشانی اور شانوں کے نو سے لپٹے رہے، میں نے بھی گرم جوشی سے یہ عمل دہرایا۔

اب میرے دلی سے آکا مرزا کا احترام نکل چکا تھا، اب وہ میری نظر میں ایک با ترین خلایق انسان تھا۔

آکا مرزا نے میری طرح گئی اور آدمی بھی اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے ایران بھیج دیے تھے۔ جب مجھے بار شاہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ کچھ دیر تک مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ جب میں نے آکا مرزا کے ظلم و جور کی داستان تنا کر بادشاہ اپنا تعارف کرایا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ بولے۔ ”کامران کو یہ ہو کیا گیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ظلم کی نافرمانی میں وہ سفر کمر ہا ہے، ایک نہ ایک دن اسے حذر دلے ڈوبے گا۔ اب میں واقعی بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی آنکھ کی غرض غایت بتا کر بادشاہ سے عرض کیا۔

”اعلا حضرت! اب بہت دیرا وہ ہوشیاری کی ضرورت ہے، آکا مرزا کے کئی آدمی ایسی مقصد سے ایران آتے ہیں کہ شاہ صفوی کو حتی الامکان آپ کی امداد و اعانت سے باز رکھیں۔“

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ددپہر کے کھانے پر بادشاہ کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی بڑی مونیچوں والا شاہ ہمارا سپ صفوی ہمارا امیر بان تھا۔ ایرانی امرا

اصف میں موقوف ہمارے روبرو کھڑے تھے۔

صفوی بادشاہ نے ہمارے بادشاہ سے اچانک سوال کیا: ”ہم جیران ہیں کہ آپ اعظم حکمران کس طرح اپنے کمزور دشمن سے شکست کھا گیا؟ شیرخان ایک معمولی امیر یہ سلطنت پر آخر کس طرح غالب آگیا؟“

ہمارے بادشاہ نے آندہ دگی سے جواب دیا: ”بھائیوں کا نفاق شیرخان کی مدد پر جس سے وہ جیت گیا۔“

صفوی حکمران نے چونکا دینے والا سوال کیا: ”کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا اپنے بیٹوں کے ساتھ سلوک اچھا نہ رہا ہو اور یہ کہ لب تک آپ ان کے ساتھ جس طرح پیش تے رہے ہیں وہ ناپسندیدہ ہو۔“

ہمارے بادشاہ نے جواب دیا: ”ہاں یہ ہماری نرمی اور مروت ہی تو تھی جس نے میں سے اٹھانے کا موقع دیا اگر ہم انہیں بھائی کی جگہ سرکش اور باغی سمجھتے ادا مان سے ماہی سلوک روا رکھتے تو شاید آج ہمیں یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔“

صفوی بادشاہ نے اپنے روبرو کھڑے ہوتے چھوٹے بھائی بہرام میرزا کو دے دے حکم دیا کہ وہ آفتابہ اور طشت لے کر آگے بڑھے اور بادشاہ کے ہاتھ ملاتے۔

شہزاد بہرام میرزا دوقی غلام کی طرح آگے بڑھا اور بادشاہ کے ہاتھ دھلانے لگا دی بادشاہ نے آنکھ کے اشارے سے بہرام میرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے شاہ سے کہا: ”بھائیوں کو اس طرح رکھنا چاہیے!“

بہرام میرزا کے چہرے کا رنگ آدھ گیا۔ شاید اسے اس بات سے بہت دکھ پہنچا۔ آکا میرزا کے شاطر بھی کسی طرح اس واقعے سے آگاہ ہو گئے ادا مانہوں نے بہرام میرزا سے بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی طرح ظہا سپ صفوی کو ہایوں سے دھت کشتی پر وہ کر لے۔ چنانچہ تنہے میں یہ آیا کہ بہرام میرزا نے کئی بار اپنے بڑے بھائی کو یہ یقین دلانے لوشش کی کہ ”ہندوستان جیسے بڑوسی ملک پر امیر تیمور کی اولاد کی مضبوط حکومت ایران، اپنے ہمیشہ خطرے کا باعث رہے گی۔“

لیکن شاہ ظہا سپ نے کسی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس نے ہمارے بادشاہ کو ایک نذرانہ دعوت دی، اسات دن تک اس ضیافت کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ چھ سو خامیل نے نصب کئے اور بارہ مقالات پر شادیاں اور نقارے آٹھوں پہر بجے رہے۔ شایانوں کے

نیچے نہایت قیمتی شاہی دریاں سمجھائی گئیں۔ پہلے دن تو محض کھانے پینے تک ہی گرمی محفل رہی، دوسرے دن شاہانہ خلعت، مرصع شمشیر اور مرصع خنجر عطا ہوتے اور صفوی حکمران نے ہمارے بادشاہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اس تقریب میں جو اشیاء بھی عطا تھیں، ہمارے بادشاہ کو عطا کر دی گئیں۔ خیمے، چادر، قالین، گھوڑے، ادنت اور خنجر، بلند مقام پر جمع کر دیے گئے۔ سلطنت اور لازمہ سلطنت میں جو چیزیں بھی آتی ہیں سب ہمارے بادشاہ کو عطا ہوئیں۔ شاہ صفوی نے اپنے بیٹے سمیت بارہ ہزار سواروں کی فوج مرحمت فرمائی اور کہا کہ اور سامان بھی مزاجم کیا جائے گا۔

پھر صفوی بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ ہمارا بادشاہ بھی استراٹا کھڑا ہوا۔ صفوی بادشاہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ہمارے بادشاہ سے کہا: "ہماریوں بادشاہ! آپ کے لئے یہ ہاتھ کون لکھی نہیں؟"

ادھر سے فارغ ہو کر بادشاہ قندھار پر حملہ آور ہوا اور اسے فتح کر کے کابل روانہ ہو گیا۔ عمر کوٹ میں حمیدہ بانو سے بادشاہ کا ایک خط کا پیرا ہوا تھا جس کا بادشاہ عبداللہ بن اکبر نام رکھا تھا۔ ان دنوں یہ شہزادہ آکامرنا کے قبضے میں تھا اس نے شہزادہ قلعے کی تفصیل پر عین اسی جگہ بٹھا دیا جہاں گولہ باری ہو رہی تھی لیکن جسے اللہ کے اسے کون چکھے۔ مستقبل کے بادشاہ پر حیات دلیوں کا سایہ تھا، زندہ رہا۔ بادشاہ نے کہا: بھی فتح کر لیا۔ آکامرنا اپنے کنبے کے حاتمہ پر نکلا۔

بادشاہ آکامرنا کا تعجب کرتا رہا: آخر تنگ آکر اس نے بادشاہ سے رحم کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اسے پھر معاف کر دیا اور اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان دنوں بادشاہ جلال آباد کے شمال میں تالپقان کے قلعے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرخان کا قاصد بادشاہ کی خدمت میں عرضی پر مدد ہوا کہ: "مرنا کامرنا حاضری کا خواست گاہ ہے۔"

بادشاہ نے بے چینی سے جواب دیا: "حاضر کرو۔" قاصد کے جاتے ہی بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ: "مرنا کامرنا آج پہلے دندا ادرامر اس کے استقبال کو آگے بڑھیں اور خوشی کے نقارے بجاتے جائیں۔" نقادوں اور غلامانوں کی آوازوں میں آکامرنا نمودار ہوا اور قندھار اور ادرامر کے آس پاس اس کے استقبال کو کھڑے تھے جب وہ ان کے پرچے سے گزر کر اس فر پہنچا جہاں مرنا ہندال بیٹھا تھا تو آکامرنا نے وہیں بیٹھ جانا چاہا لیکن بادشاہ نے

نکم دیا۔ ”دہاں نہیں، تم ہمارے قریب آؤ!“  
 آکا مرزا نے ایک امیر کی کمرے سے رد مال کھول لیا اور اسے اپنی گردن میں ڈال کر  
 لگالی۔ اس طرح وہ خود کو بادشاہ کا قیدی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔  
 جب وہ بادشاہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے رد مال کو کھول کر پھینک دیا اور کہا۔  
 ”مرزا مرزا، تم ہمارے بھائی ہو، قیدی نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں!“  
 اس کے بعد آکا مرزا کو گے سے لگا لیا۔ پھر ثریت طلب کیا اور نصف پی کمر بقیہ  
 مرزا کو بلا دیا۔

بادشاہ نے اس موقع پر مدحی خوشی کا اظہار کیا۔ آکا مرزا کی حاضرت نظر میں شاید  
 تلاش کمر ہی تھیں اور جب انہوں نے مجھے پایا تو مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ آکا مرزا اب  
 راہ و است پر نہیں آیا۔

کئی دن بعد بادشاہ نے کامران مرزا کو کولاب کا قلعہ مرحمت فرمایا۔ آکا مرزا بادشاہ  
 ے درخت ہو کر کولاب چلا گیا اور ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اطلاع آئی کہ آکا مرزا  
 بادشاہ کے علاقوں پر تانت و تاراج شروع کر رکھی ہے۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر  
 امرزا سے کہلایا کہ۔ ”اب تم یہ کیا کر رہے ہو، اگر تم اور علاقہ چاہتے ہو تو ہم وہ بھی دے  
 دیں گے!“

آکا مرزا نے اس کا یہ جواب دیا کہ۔ ”اعلا حضرت! غلام نے فقیری اختیار کر لی ہے،  
 اب سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔“ لیکن اطلاعیں براہِ مہمی آتی رہیں کہ تارک الدنیا  
 کامرزا لوٹ مار کا ایک بازار گرم کیے ہوتے ہیں۔

اور ایک بار پھر جنگ دجہال کا سلسلہ چل نکلا۔ اس جنگ دجہال میں آکا مرزا کے  
 انھوں مرزا ہندال کو شہادت نصیب ہوئی۔ آکا مرزا شکستیں اٹھاتا ہوا ہندوستان میں  
 اخل ہو گیا اور دریائے سندھ کے پار آدم گکھر کے پاس پناہ لی۔ آدم گکھر نے آکا مرزا کو  
 پیر کو کے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ بادشاہ دیوانہ وار آدم گکھر کے پاس پہنچے۔ آدم نے نہایت  
 حترام اور آداب کے ساتھ بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے آکا مرزا سے ملاقات کی۔ اس  
 موقع پر ایک رکابی میں تر بوڑی قاشیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ بادشاہ نے  
 نصف خود کھائیں اور نصف تاشیں آکا مرزا کو بخش دیں۔

آکا مرزا کو قید میں پڑے ہوئے چار دن گزر گئے۔ اس دوران امرا، کدوا اور  
 رفیقانِ دین میں بڑی گرم گرم بحثیں ہوتی رہیں وہ سب بادشاہ کو یہ مشورہ دے رہے تھے

تھے کہ اب آکامرنا کو معاف نہ کیا جائے !  
بادشاہ نے ایک رات مجھے طلب کیا اور مجھ سے دریافت کیا: ”علی مرزا کیا  
جانتا ہے کہ ہم تجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟“

میں نے عرض کیا: ”بندہ منشاءِ سلطانی سے لاعلم ہے!“  
بادشاہ نے آکامرنا کے غیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ”اس غیمے کی  
اندرونی خدمت تیرے سپرد ہے، اب نیند تیرے لئے حرام ہے!“  
اس حکم کے بعد میں غیمے میں داخل ہو گیا۔ آکامرنا نے مجھے اس طرح دیکھا  
پہچانتا ہی نہ ہو۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آکامرنا نے مجھ سے پوچھا: ”علی مرزا کیا یاد  
ہیں قتل کرا دیں گے؟“

میں نے طنزاً جواب دیا: ”بادشاہ کے مزاج سے بادشاہ ہی واقف ہوگا۔“  
پھر آکامرنا نے مایوسی سے کہا: ”بہر حال جو کچھ بھی ہو، علی مرزا! اسال ہمارے  
چہرے دہرے قضا ہو گئے تھے کہ تم انہیں ہمارے عوض ادا کر دو گے؟“  
میں نے جواب دیا: ”میں رکھ تو سکتا ہوں لیکن یہ قضا جناب خود ہی ادا فرمائیے  
تو مناسب ہوگا۔“

اس کے دوسرے دن مفتیان دین ادا کرانے مل جل کر ایک محضر نامہ تیار  
جس کی ابتدا اس مصرعے سے کی گئی تھی۔  
(رخنہ گیر ملک سرافگند بہ درخسنہ گیر۔ ملک کامر قطع کر دیا جاتے۔)  
بادشاہ نے بدرجہٴ مجبوری حکم دیا: ”افسوس کہ ہم قتل کا حکم نہیں دے سکتے  
پھر فرمایا: ”کامران کو اندھا کر دیا جائے۔“

اس حکم کے بعد بادشاہ وہاں سے ہٹ گئے۔ کئی طاقت ور اور تو انا آدھی  
آکامرنا کے غیمے میں داخل ہوتے۔ ان میں سے غلام علی نامی بھاری تن و دوش کا مپا  
آگے بڑھا اور بڑے سے رد مال کو لپیٹ کر گیند بنائی پھر اسے زبردستی آکامرنا کے منہ  
ٹھونس دیا۔ آکامرنا نے بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ دو آدمیوں نے ہاتھوں کو  
مجھے باندھ دیا اور غیمے سے باہر آئے، وہاں کچھ لوگوں نے آکامرنا کو زمین پر گر  
اور اس کے جسم اور ٹانگوں کو یورس طرح قابو میں کر کے آکامرنا کے منہ پر  
جب پانچ نشتر چھوٹے جا چکے تو آکامرنا نے اپنی ٹانگوں پر بیٹھتے ہوئے شخص سے  
”تو ہماری ٹانگوں پر کیوں بیٹھتا ہے؟ انہیں تو چھوڑ دے!“

لیکن کسی نے بھی اس کی باتوں پر توجہ نہ دی اور کم و بیش سچا سچا نشر و دوز  
 نکھوں میں چبھتے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص شک دان لے کر آگے بڑھا اور  
 پٹکیوں سے لپا ہوا نمک نشر زدہ آنکھوں میں بھر دیا۔ درد کی شدت میں آکا مرزا اللہ  
 لے کر تے رہے۔

مجھ سے آکا مرزا کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی، میں بھاگ کر بادشاہ کے خیمے  
 کے در پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے مجھے اندر طلب فرمایا اور پوچھا۔ ”کیا ہمارے  
 حکم پر عمل کر دیا گیا؟“  
 میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”اعلا حضرت! صرف بہ حرف آکا مرزا  
 اندھے کر دیئے گئے!“  
 بادشاہ نے حکم دیا۔ ”ہمارے غسل کے لئے پانی مہیا کیا جاتے؟“

✱

✱

✱

نا بینا آکا مرزا نے بادشاہ سے مدینہ منورہ جانے کی اجازت طلب کی جو دے  
 دی گئی، میں اتن سے ملنے گیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر دریافت کیا۔ ”کرن ہے؟“  
 میں نے جواب دیا۔ ”علی مرزا!“  
 پوچھا۔ ”اب کیا لینے آتے ہو؟“  
 میں نے جواب دیا۔ ”کچھ لینے نہیں دینے آیا ہوں۔“  
 دریافت کیا۔ ”وہ کیا؟“  
 میں نے کہا۔ ”ایک نصیحت۔ تم نے جو مظالم ڈھاتے تھے اور جس جس طرح  
 لوگوں کو متایا تھا، تمہیں اس کا بدلہ اسی دنیا میں مل گیا!“  
 آکا مرزا کی اگر اب بھی وہی تھی۔ بولا۔ ”ہم نصیحتیں نہیں سنا چاہتے۔“  
 میں نے کہا۔ ”نہ سنو، لیکن یہ تو بتا دو کہ ردِ من جہیں کہاں ہے؟“  
 آکا مرزا نے جواب دیا۔ ”جو خود ہی اندھا ہوا ہے کیا چستہ کہ کون کہاں  
 ہے؟“

میں نے غصے میں کہا۔ ”اذ ظالم انسان، تو نے تو میری بنیادی کو نقصان ہی پہنچایا  
 تھا لیکن خدا نے تیری بنیادی ایک پھر سے چھین لی۔“  
 آکا مرزا خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ چلا گیا اور مدین میں اس کا

اشغال ہو گیا۔

بادشاہ نے ہندوستان فتح کر لیا اور مجھے اس کے طفیل بڑا عزت و آرام پیشہ  
 روشن جبین کا کچھ بہتہ نہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہاں انزاہا یہ سننے میں آیا ہے کہ آکا مرزا کے  
 اذرا تفری اور ہنگامہ قرار دانشدار میں خود اس سے بھی کئی کینز میں چھین گیتیں ادر اے خود  
 یہ معلوم نہ ہو سکا کہ روشن جبین کس کے قبضے میں چلی گئی۔

دھندلی بینائی اور غبار آلود نظروں کے سامنے جب بھی کوئی عورت اچانک  
 آتی ہے تو میں غلطی اور غوش ہنسی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہوں کہ شاید روشن جبین میری محبت  
 ہاتھوں بے قرار ہو کر دھونڈتی تلاش کرتی میرے پاس آگئی ہے لیکن اے بسا آرزو کہ  
 شک شدی۔

✱

✱

✱



صداق از دینی



مشرقی ہندوستان میں انگلستان کی تجارت کرنے والی مختلف سوسائٹیوں۔ آپس میں اتحاد کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل اختیار کر لی تھی، پہلے اس کمپنی نے ایجنٹوں کے لئے فیکٹریاں اور اپنے مال کے لئے گودام تیار کئے پھر ان کی حفاظت کے لئے قلعوں کی ضرورت پیش آئی۔ جب قلعے تعمیر ہوتے تو ان کے لئے سپاہی سزور بھیجے گئے اور جب سپاہیوں کی صورت میں انواح دجود میں آگئیں تو ان کے لئے علاقے کی تسخیر کا کام فراہم کیا گیا۔ چونکہ سات سمندر پار سے آنے والی اس تاجر قوم کے ہندوستان کی ہر شے اجنبی تھی اور ہندوستانیوں کے مقابلے میں وہ تعدادی اے بھی کمزور تھے، اس لئے بندوبست اور تلواری کے ساتھ ساتھ انہوں نے سیاست عیاری سے بھی کام لیا وہ جس قلعے یا علاقے کو فتح کرنا چاہتے، پہلے وہاں سائیکلوار ہرا دی دیتے بھیج دیتے جب یہ سازشی سوار ماپنے شکار کو زخمی کر چکے تو آخری فیصلہ کن ضرب ان تاجروں کی انواح لگا دیتیں۔

بنگال، اووہ، مدراس اور حیدرآباد کو زیر اثر لاکھنے کے بعد ان کی نظر سرنگاپٹم کی مملکت خداداد پر جم گئیں۔ یہاں نواب حیدر علی کے بعد اس کا بڑا بیٹا فتح علی ٹیپو، سلطان کا لقب اختیار کر چکا تھا اور دہلی میں کرم خوردہ، رنگ اور گھنی ہونی سلطنت مغلیہ کی موجودگی میں، انگریزوں کی ایما کے بغیر ٹیپو کا سلا بن جانا بڑی جرأت کی بات تھی، اس پاس کی خود مختار ریاستیں سلطان ٹیپو کو حسد کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، سرنگاپٹم کے شمالی مغرب میں پیشوا ملے پونا اس نو مولود مسلم قوت کو فکر دشویش سے دیکھ رہا تھا۔ انگریز ہندوستانی ریاست اور معارفانوں کی رگ رقابت پر انگلیاں رکھ کر اس جان لیوا مرضی کی خوب اچھو تشخیص کر چکا تھا۔

ٹیپو ان تاجروں کے عزائم کا اندازہ لگا چکا تھا وہ ان کے مقابل سید ہو گیا، یورپ میں فرانس اور انگلستان آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ٹیپو بھی ان کو آمیزش سے پوری طرح باخبر تھا۔ اس نے انگریزوں پر فرانسیسیوں کو ترجیح دینے کی دسی ریاستوں سے خط و کتابت کی اور نہایت حد درجہ انداز میں انہیں دلیا کہ اگر اس مرحلے پر بھی ہندوستانی طاقتیں متحد اور متفق نہ ہو سکیں، وہ دن زیادہ دور نہیں کہ پورا ہندوستان انگریزوں کے قبضے میں چلا جائے، وطن کی خود مرضی، موقع پرست اور سرد مہری کی ہمت شکن فضا سے بھی وہ بالو

اور اس نے اپنی ہمعصر دوسری اسلامی حکومتوں سے خط و کتابت شروع کر دی ایران،  
افغانستان اور ترکی کو سفارتیں بھیج کر انہیں امداد و اعانت پر آمادہ کرنے کی کوششیں  
کیں اور ترکی کے سولہ بھیجی نے امید افزا جوابات دیے۔

افغانستان کا زمان شاہ، جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہ شمال مغربی  
حدود سے فوج لے کر ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ لیکن شاطر انگریز نے زمان شاہ کا  
ایکہ اپنی افواج سے نہیں کیا۔ مراد آباد سے ایک شیعہ عالم ایران روانہ کر دیا گیا۔ جس  
نے عباس صفوی کو یہ یقین دلادیا کہ افغانستان میں اس کے ہم قوموں پر سخت مظالم  
صارتے جارہے ہیں، عباس صفوی نے افغانستان پر حملہ کر دیا اور ہندوستان کی حدود  
ن انگریزوں کے خلاف صف آرا زمان شاہ اس حملے کی خبر سن کر افغانستان واپس چلا  
یا۔ شیپو پھر تنہا رہ گیا۔

شیپو ہی کی طرح دھوندر جی داگیہ ناسی ایک آدامہ گرو دھندو سرور بھی انگریزوں  
کے عزائم بھانپ چکا تھا اور اسے شیپو سے عقیدت ہو گئی تھی لیکن اس کے پاس نہ  
ن کوئی علاقہ تھا نہ کوئی مقلعہ، اس نے اپنے اس پاس کچھ آدمی جمع کر لئے تھے اور ان کی مدد  
سے انگریزوں اور ان کے حلیفوں پر چھاپے مارنے لگا تھا شیپو بھی اس کے کارنامے نہایت  
شوق سے سن رہا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ دھوندر جی داگیہ اسلام پر آمادہ ہے تو  
اس کے دل میں ملاقات کی خواہش پیدا ہو گئی۔

داگیہ اپنے جاں نایوں کے ساتھ گھوڑوں کو سر پیٹ دوڑاتا ہوا دریائے شری  
دتی کے کنارے پہنچ گیا سامنے راجا آبشار آٹھ سو تیس خٹ کی بلندی سے گزر رہا تھا۔  
داگیہ اپنے ساتھیوں سمیت اس حسین اور پر لطف منظر میں کھو گیا۔ یہ لوگ چونکا امداد میں  
گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے۔ دھواں اڑاتا آبشار سب کے دلوں میں کھجا جا رہا تھا۔ اگر  
انگریزوں کا خوف دانگریز نہ ہوتا تو داگیہ یہیں دریائے شری دتی کے آبشار "راجا" کے قریب  
جوا میں رہ پڑتا کیونکہ یہاں اس زندگی کے لئے اس سے بہتر جگہ ملنی مشکل تھی۔

دھوندر جی کے پلو سے اس نے اپنا منہ پونچھا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر بندو ق سلنے  
لگے۔ اس کے پاس بچپن چونکا اور مستعد ساتھی بھی فطرت کی رنگینوں سے لطف اندوز  
ہونے لگے کچھ دیر بعد انہوں نے مغرب میں بھلے گئے ہوتے ایک ہرن دیکھا، ان کے  
کان کھڑے ہو گئے۔ انہیں ہرن کی وحشت زدہ رفتار کو دیکھ کر یہ یقین ہو چکا تھا کہ اسی  
کے پیچھے یا تو کوئی ستونخوار درندہ ہے یا پھر انسان اس کا پیچھا کر رہے ہیں ان میں ایک

شخص زمین پر دانتیں کھڑکتے گھس گیا اور کان زمین سے لگا کر کچھ سننے کی کوشش کر لگا۔ بقیہ لوگ اس سمت منہ کر کے بندوقین تان کر کھڑے ہو گئے جدھر سے ہرن بھڑکے یا بھڑکے۔ واگہ نہایت اطمینان سے اپنے ساتھیوں پر نظر پڑی جاتے کسی بات کا انتظا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لپٹا ہوا شخص پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ماددا واگہ کی طرف بھاگتا ہوا چنچا: "واگہ جی! دشمن، تقریباً سو سو اندر دشمن!"

واگہ چلتے جیسی چستی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے اٹھتے بندوق ہاتھ میں لے پوچھا: "کتنی دیر ہیں یہ لوگ؟"

اس شخص نے جواب دیا: "تقریباً ایک میل دور!"

واگہ کی محکمانہ آواز گونجی: "کدھر جا رہے ہیں یہ لوگ؟"

"اسی طرف آرہے ہیں واگہ جی!"

واگہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گھوڑوں کو شمال کے جنگل میں چھپا دیا۔ اپنے ساتھیوں کو راہ گزرنے کے متوازی دور تک پتھریلی پٹانوں کے پیچھے چھپا دیا۔ یہ پایا کہ جب غنیم سامنے آجائیں تو واگہ جی کے حکم کے مطابق اس تو بندوقوں کو پر رکھ دیا جاتے۔ ان کا حوالا حسن سماعت رکھنے والا آہٹ شناس واگہ کے قریب زمین پر کان لگاتے آئے والوں کے دم بدم قریب آنے کی خبر سن رہا تھا۔ تقریباً سو اگھڑے بعد آہٹ شناس کی اطلاع کے بموجب سو سو افراد اور غور توں پر مشتمل قافلہ ان کے سامنے سے گزرنے لگا۔ ان کے ٹھوکریں کھا کھا کر قدم اٹھاتے مولشی پر تھے کہ وہ کسی ابتلا درصا تب کے سمندر سے گزر کر آرہے ہیں، گھوڑوں کے جسم خون سے لہوئے تھے اور مردوں کے چہرے اور کپڑے خون کی لکیروں اور دھبوں سے گلنا رہے تھے کئی گھوڑوں پر دو دو آدمی سوار تھے، ان میں ایک زخمیوں سے چلنے والا ایک کا اندھے پر جھکاتے نیم مدھوش اپنے ساتھی کے سہارے سفر کر رہا تھا غور توں خوفزدہ ہو گئے، اگر وہیں جھکاتے مردوں کے پیچھے پیچھے اپنے گھوڑے بڑھتا رہی تھیں، واگہ انہیں پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ یہ خیر ملکی لوگ ہیں، ان کے سرخ و سفید چہرے، بال اور ٹینگوں انہیں ان کے غیر ملکی ہونے کی شہادت دے رہی تھیں، واگہ کو ان سے نفرت تھی۔ اس نے ان اندر وہ حال مضمحل یا لوگوں کی مجموعی کیفیت سے یہ انداز لگایا تھا کہ اب ان میں مقابلے کا دم نہیں رہا۔ واگہ نے اپنی حلق سے ایک عجیب و ناک آواز نکالی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے ساتھیوں سمیت نیم دائرے میں

نے نمودار ہوا اور ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی بندہ قوں کی نالیں اہل قافلہ کی ہتھیں، واگیہ نے تلگو میں حکم دیا: "اپنے ہتھیار زمین پر گرادو!"  
چند سفید فام اس کا مطلب سمجھ گئے اور اپنے ہتھیار زمین پر گرادیے۔  
ان نے اپنے ساتھیوں کو اپنی زبان میں واگیہ کا حکم سنا دیا اور اس کے فوراً بعد سبھی نے اپنے ہتھیار زمین پر ڈھیر کر دیے۔

واگیہ گردن اکڑاتے اپنے پانچ ساتھیوں کو آہیں پاس لے لے ان کے سروں پر پہنچے۔  
عمدہ تین ہر اسان اور بدحواس نظر دل سے انہیں دیکھ رہی تھیں، واگیہ نے تلگو میں  
ال کیا: "تم لوگ انگریز ہو؟"

انہیں: "ایک ادھیڑ عمر نے جواب دیا: "ہم فرانسیسی ہیں!"  
"اچھا!" واگیہ کو یاد آ گیا کہ فرانسیسی شیپو کے حلیف ہیں، اس نے پوچھا: "تمہارا  
مال کیونکر ہوا؟"

ادھیڑ عمر فرانسیسی نے جواب دیا: "ہم سرنگاچیم سلطان شیپو کے پاس جا رہے  
تھے کہ راہ میں انگریزوں سے ٹکرائے ہو گئی وہ تعداد میں ہم سے زیادہ تھے، ہمارے بیشتر  
تھی مقابلے میں مارے گئے ہم جان بچا کر کسی نہ کسی طرح یہاں تک آ گئے!" اتنا کہہ  
رہ اس نے واگیہ کو حکم طلب نظر دل سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "اب تم جو حکم دو  
ہ اس پر عمل ہوگا!"

واگیہ نے اپنے ساتھیوں کی طرف سوالیہ نظر دل سے دیکھا، ایک منچلے لڑکا  
واگیہ کو اپنی راستے سے بلا پس و پیش مطلع کر دیا۔ فرانسیسی عورتوں پر نظریں  
اڑتے ہوئے کہا: "واگیہ جی! مردوں کو جانے دو، عورتوں کو روک لو، انہیں ہمیں بھی  
زان کی ضرورت ہے!"

پھر سب طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہم سب کی بھی یہی رلتے ہیں سب  
نابھی یہی رائے ہے!"

واگیہ نے مردوں کو ایک طرف کر دیا اور عورتوں کو دوسری طرف، اور خود ان  
دونوں کے درمیان اپنے ساتھیوں سمیت ساٹل ہو گیا۔ پھر عمر فرانسیسی کے گھوڑے  
کے پیٹ پر ایک نور و رات رسید کر دی اور جرح کر حکم دیا: "بھاگ جاؤ۔ نور بھاگ  
جاؤ۔ ورنہ ہمارے ساتھی تمہیں قتل کر دیں گے!"  
جان بچی لاکھوں پلٹے کے مصداق مردوں نے اپنے گھوڑوں کو فوراً آگے

بڑھا دیا۔ عورتوں نے ان کا ساتھ دینا چاہا لیکن واگیہ کے ساتھیوں نے انہیں  
قدم بھی نہ ہلنے دیا۔

فرانسیسی اپنی عورتوں کو واگیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے  
انہیں مڑ مڑ کر اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک بلند دبالا پیچیدہ پہاڑ  
ان کے درمیان حائل نہ ہو گیتیں۔

زائد قطار روتی اور آئسو پہاتی ہوئی فرانسیسی خواتین رحم اور امانت  
نظر وں سے واگیہ کو دیکھنے لگیں، واگیہ کے ساتھی گاہ واگیہ کو اور گاہ فرانسیسی  
کو دیکھنے لگتے۔

واگیہ اپنے ساتھیوں کو جنگل سے گھوڑے واپس لانے کا حکم دے کر فران  
عورتوں کے حسن و جمال کا جائزہ لینے لگا۔

پہلے اس نے ان کی گنتی کی یہ کہ کل چھیا سٹھ تھیں، ان میں سات بوڑھی  
بقیہ اٹھ سولہ اور تیس سال کے درمیان عمر کی تھیں۔ پتھر مڑی دیر بعد جب گھ  
لے کر اس کے ساتھی واپس آ گئے تو وہ فرانسیسی عورتوں کو مہیشیوں کی طرح ہنکا کر  
سب سے بلند پہاڑی چوٹی کی طرف لے گیا جسے وہاں کے مقامی لوگ کدو سے  
دکھوڑے کا مٹہ کہتے تھے۔ کدو سے کھکے کے جنوب میں ایک چھوٹی ہسی داوی چھو  
مر مر و رختوں سے ڈھنپنی ہوئی تھی، یہاں پہنچ کر اس نے فرانسیسی خواتین کو  
قطار میں کھڑا کر دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا: ”یہاں جاؤ ہوں کہ ان غیر ملکی عوا  
اپنے قبضے میں دیکھ کر تم سب کے کیا احساسات ہوں گے تم نے میری خاطر اپنا دم  
گھر چھوڑا اور کسانوں اور میدانوں میں خاک اڑاتے پھر رہے ہو سخت ناان  
گی اگر میں تمہیں ان عورتوں سے دور رکھوں، بھگوان نے تمہاری قربانیوں کے پیش  
انہیں ہمارے پاس بھیجا ہے لیکن یہ فیصلہ کرنا کہ کون عورت کس کے حوالے کی  
دشوار ہے!“

واگیہ کی اس مختصر تقریر سے اس کے ساتھیوں کے چہروں پر تازگی آ  
واگیہ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا: ”تم جب ان عورتوں کی پشت پر آ  
کے متوازی قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔“  
حکم کی فورا تعمیل کر دی گئی اور اس کے چون ساتھی فرانسیسی عوا  
پشت پر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔

واگب نے بوجھتی عورتوں کو قطار سے نکال دیا۔ چون عورتوں کی پشت پر چوٹ  
مقابل قطار میں کھڑے ہوتے تھے یا پنج عورتوں کی پشتیں خالی تھیں، جب  
قطاریں، ایک دوسرے کی پشت پر ٹھہری ہو گئیں تو واگب نے ان دونوں قطاروں  
نیا۔ ”ایک دوسرے کی طرف مڑ کر اپنے چہرے آگے سٹپنے لگے۔“

مرد تو ایک دم گھوم گئے لیکن واگب کے اس حکم کی تعمیل تمام عورتیں ایک  
نہ کر سکیں جو تلگو زبان سے واقف تھیں وہ گھوم گئیں اور جو نہیں جانتی تھیں  
بتوہ کھڑی رہیں۔

واگب نے تلگو جاننے والی عورتوں کو حکم دیا۔ ”تم تلگو نہ جاننے والی عورتوں کو بتاؤ  
ہے انہیں کیا حکم دیا ہے!“

اس حکم کے ذرا دیر بعد تمام عورتیں واگب کے سپاہیوں کے رویہ دکھ رہی تھیں۔  
واگب نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔ ”جو عورت جس مرد کے مقابل ہے اپنے  
میں کرے ادا سے اپنے تصرف میں لے لے!“

کچھ دیر کے لئے واگب کا یہ حکم اس کے ساتھیوں کے لئے ناقابل فہم رہا۔ لیکن  
نے اپنے اس نر لے حکم کی دستاویز کو دیا، اس نے کہا۔ ”ساتھیو! تم میرے اس  
کھے حکم پر تعجب نہ کرو، میں چاہتا ہوں عورتوں کو اپنی مرضی سے تم میں تقسیم کر دیتا  
ن اس صورت میں تم میں پسند اور ناپسند کا سوال اٹھ کھڑا ہوتا لیکن اس طریقہ تقسیم  
جو میں نے اختیار کیا ہے تم سب کو مطمئن ضرور کر دیا ہو گا کہ جو عورت جس کے مقدر  
تھی اسے مل گئی۔“

لوگوں نے جوش مسرت سے تالیاں بجائیں اور واگب جی کی جے کا نعرہ بلند کیا۔  
ادھر سے فارغ ہو کر واگب بقیہ پنج عورتوں کی طرف بڑھا۔ یہ کسی کے بھی حصے  
نہیں آئی تھیں، واگب نے ان کے دوبرہہ پہنچ کر انہیں بادی بادی بغور دیکھا پھر  
نے ساتھیوں سے سوال کیا۔ ”ساتھیو! ان پنج عورتوں کے لئے تم کیا کہتے ہو؟“  
واگب کے ایک پرستار نے جواب دیا۔ ”واگب جی! تم ہمارے سردار ہو اور سردار  
حق کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے، ان پانچوں کے تنہا مستحق ہو!“

تائید میں بھی نے کچھ ایسا جوش و خروش دکھایا کہ تھوڑی دیر کاں پڑی  
اواز تک نہ سناؤی۔ وہ سب شرم ہو کر واگب نے اپنے حصے میں آئی ہوئی خواتین کو  
بانچنے کی نظر سے دیکھا۔ یوں تو وہ پانچوں ہی حسین تھیں لیکن ان میں ایک غیر معمولی

خوبصورت تھی، واگنہ اس کے مدبر و مہینچ کہ کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کی عمر بمشکل انیس بہ سال رہی ہوگی۔ اس کے شانوں پر سنہرے بال بکھرے ہوئے تھے اور دھبے سے بہ نیاز جسم، ایک ایسی قراب میں پھنسا ہوا تھا جس کے گلے میں بطور خاص چند ٹیٹیں پیدا کی گئی تھیں

واگنہ کو گھورتے ہوئے دیکھ کر لڑکی نے شرم و حیا سے نظر میں جھکا لیں۔  
واگنہ نے ہنستے ہوئے لڑکی کے کاندر سے پھر ہاتھ دھک دیا اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا: ”اُدھر آؤ، میرے قریب!“  
لڑکی ڈری آہی اس کے قریب چلی گئی اور خوفزدہ نظروں سے لمحے بھرے  
واگنہ کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔  
واگنہ کا ہاتھ اب بھی اس کے کاندر سے پھر رکھا تھا۔ اس نے پوچھا: ”تمہارا نام؟“

لڑکی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا: ”روڈی ٹینیل!“  
واگنہ نے ترشی سے پوچھا: ”تم روڈیوں کی ہو؟“  
اچانک نظریں لیرا اٹھیں جیسے بجلی کو نہ گئی ہو، لڑکی نے دلی سے جواب  
”میں تمہیں پہنچانے نہیں کرتی۔ پھر بھی تمہارے قبضے میں آگئی ہوں اگر تم خود میری جگہ  
تو کیا خوش ہوتے؟“

واگنہ نے طیش میں اگر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔ بولا: ”تم سفید فام تاجر ہو  
آہو ہندوستان میں کیا لینے آتے ہو؟ کیا تمہارے مردوں نے ہندوستان کی نام  
ہاتھ تمہیں ڈالا؟“

”والا ہوگا!“ لڑکی نے بے تیزی سے جواب دیا۔ ”لیکن میں فرانسیسی  
میری تمام سفید فام ہونے کے باوجود انگریزوں کے خلاف تمہارا ساتھ دے رہی  
واگنہ نے جواب دیا: ”بیکواس ہندو کہہ دو سرنگا بھم کا پیچو تم پر اعتبار کرتا  
کرے لیکن میں نہ تم فرانسیسیوں پر اعتماد کر سکتا ہوں نہ انگریزوں پر تم مردوں  
کے بھائی گروہ کٹ ہو!“

لڑکی نے مستطی کا سہارا لیا۔ ”لیکن ہم فرانسیسی یہ نہیں چاہتے کہ ہندوستان



یوں کا غلام ہو جاتے، سردار! اگر تم سے یہ سوال کیا جاتے کہ تم انگہریز کو زیادہ پسند  
تے ہو یا فرانسیسی کو تو تم کیا جواب دو گے! اس وقت تم یقیناً فرانسیسی کو ترجیح  
دے گے۔“

داگیہ زور زور سے ہنسنے لگا۔  
دلی لڑکی! تم نے کیا مہمل سوال کیا ہے یہ تو ایسا سوال ہے جیسے پوچھا جاتے کہ داگیہ  
بندہ کی گولی سے مرنا پسند کرے گا یا رسی کے پھندے سے!“  
داگیہ کی بات سے اس کے سارے ہی ساتھ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔  
داگیہ نے روزی کے علاوہ چاروں عورتوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے اپنے نرغے  
لے لیا اور روزی کو اپنے گھوڑے پر آگے بٹھالیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے  
ارکی روش اختیار کی اور اپنے حصے میں آئی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے آگے  
یا کر ان کے خال گھوڑوں کو مدھیاں میں لے لیا۔

داگیہ نے روزی کی سنہری زلفوں کو کھینچ کر لیا اور اسے ہاتھ سے لگام پھینک کر  
میلی چھوڑ دی اور سیدھے ہاتھ کو ہوا میں پھرا کر اپنے ساتھیوں کو کوج کا اشارہ  
1۔ ایک ساتھ بہت لمبا رے گھوڑوں کی ٹاپروں سے کدے مکھ کی دای گونج اٹھی۔

یہ لوگ اپنے گھوڑے دھڑاتے ہوئے نیل گری کی حدود میں داخل ہو گئے اور اس  
سب سے بلند چوٹی ڈھلادہ پٹی پٹی کے دامن میں پہنچ کر دم لیا۔ یہاں انہوں نے  
کچھ دن رہنے کا منصوبہ بنایا۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو لوٹنے کی کمانی کا سبز بارغ  
کھا کے ہم نوا اور ہم خیال بنانے کے لیے ساتھیوں میں شامل کر لیا۔ داگیہ نے انہیں ہم  
ند پگوسے (سونے کے سٹک) دے کر رام کر لیا۔ مقامی خود کو ساتیس اور خدمت گار بن  
نے اور اپنے مہمان آقاؤں کو عیش کرنے کے لیے اپنی رہائش گاہیں دے دیں، یہاں دار  
یش دینے کے دوران کئی عورتیں ہلاک کر دی گئیں کیونکہ وہ اپنے ضمیر اور مرضی کے خلاف  
ان مہم نواؤں کا ساتھ دیتے پر تادمہ نہ تھیں، ان کی جگہ بقیہ چار عورتیں کام آئیں جنہیں اور  
یہ انداز سردار داگیہ نے اپنے لئے روزی کو مخصوص رکھا۔

جب وہ روزی کی خلوت گاہ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ اس  
کے ہاتھ میں تقریباً چھ انچی چھرا چھرا ہے وہ ٹھٹھک کر مردھارے پر ہی رک گیا اور روزی  
کو حکم دیا: ”لڑکی! اسے پھینک دو!“

ردزی نے چہرے کی دھار پر انگلی پھیری اور اطمینان سے جواب دیا۔ ”مجھ سے دودھ نہ ہوا اگر تمہیں نہ مار سکی تو خود کو طرہ ہلاک کر لوں گی!“

اس نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ چہرہ ملا کہاں سے؟“

ردزی نے جواب دیا۔ ”اسی کو ٹھہری سے، یہیں اس طاق میں دکھایا تھا!“

داگیہ سپاہیانہ نہایت آسانی سے اس سرکش لڑکی کو دودھ سے چہرہ پھینک ہلاک کر دیتا لیکن اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ لڑکی اپنی موت سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں رہے۔ بخوشی مرنے پر تیار تھی جو خود مرنے پر آمادہ ہو لے مرنے والے کو ان کام نہیں ہے اسے ردزی کی یہ ادائیگی، اس کی صورت شکل سے زیادہ اچھی لگیں، مسکرا کر پوچھا۔ ”تم مرنے کیوں سپاہی ہو؟“

”صرف اس لئے کہ میں تمہاری خواہشات نہیں پوری کر سکتی!“

داگیہ طنز سے ہنس دیا۔ بولا۔ ”کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ اگر میں چاہوں تو تم مجھ سے محفوظ رہ سکتی ہو؟“

”ہاں مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم تو کیا دنیا کی کوئی طاقت، کوئی شخص، مجھے میری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کر سکتا۔“

”اچھا!“ داگیہ کو ردزی کی یہ نا تجربہ کارانہ بھولی بھالی باتیں اس کے نازدندان سے زیادہ اچھی لگیں، ”ردزی کے غصے پر اسے پیار آ رہا تھا نہایت نرم لہجے میں بولا۔ ”بھولی لڑکی! تم نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟“

ردزی نے جواب دیا۔ ”ردزی ڈینیل!“

”خوب ردزی ڈینیل! اپنا یہ چہرہ تو پھینک دو، تمہیں اگر اپنے نازدندان سے سحر اور بھولی بھالی باتوں کے ذہر کا علم ہو جاتے تو پھر کبھی بھی اس حقیقت چہرے کا سہارا لینا پسند نہ کر دو میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ کوئی کام بھی تمہاری مرضی کے خلاف نہ ہو اب اس عہد کے بعد تو اپنا چہرہ پھینک دو!“

لیکن ردزی نے چہرہ پھینکنے سے انکار کر دیا۔

داگیہ چند قدم پیچھے ہٹا۔ ردزی یہ سمجھی کہ داگیہ جست لگا کر اس پر حملہ آور ہو دالا ہے لیکن داگیہ نے ہاتھ میں چھپی ہونٹ سی کو کمند کی طرح اس کے چہرے والے کی طرف پھینکا اور جھٹکا دے کر چہرے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ چہرہ ہوا میں اہراتا ہوا د کے سامنے آگرا۔ داگیہ نے جھک کر اٹھا لیا۔ اور بے ساختہ قہقہہ لگاتا ہوا بولا۔ ”اسی؟“

بلاتھا تمہیں، ہم لوگ مردوں کے شکاری بھلا عورتوں کو کیا نظر میں لاتیں گے؟  
اس کے بعد وہ ددڑی کی طرف بڑھتا ددڑی پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر  
بھٹنے لگی۔

داگیہ نے کہا۔ ”ددڑی! تم پریشان مت ہو، میں اب بھی یہی کہوں گا کہ تم میرے  
میر پر یقین کرو، میں مردار ہوں اور کسی مردار کے لئے عہد شکنی نہایت بری بات ہے!“  
ددڑی نے دد کو پرچھا۔ ”پھر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو؟“  
تمہاری قربت اتم سے باتیں کرنا، تمہارا حال سنا، کوئی ایک خواہش تھی۔  
ددڑی اس عجیب و غریب شخص سے قدم سے لطف اندوز ہوئی، لڑی۔ ”میں  
لاری باتوں پر یقین تو کر لوں لیکن مجھے تم سے خوف آتا ہے۔“

داگیہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ ”اب اگر میں چاہوں تو تم اپنے تحفظ  
ناکس حد تک ممانعت کر سکتی ہو۔“

ددڑی نے کوئی جواب نہ دیا تو داگیہ نے کہا۔ ”اس دنیا کا نظام اعتماد اور اعتبار  
یہی چل رہا ہے!“

وہ ددڑی کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ ددڑی بھی سمٹ کر کنارے پر  
دگئی۔

داگیہ اس سے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا اور اس نے اپنی کسی بات سے  
عیب ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ ددڑی سے غیر معمولی محبت کرنے لگا ہے!  
اسی ملاقات میں ددڑی نے اپنی بابت یہ بتایا کہ وہ اپنے چچا کے لڑکے کرنل  
اس سے محبت کرتی ہے اور اسی سے بچپن سے منسوب ہے!“

داگیہ نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“  
ددڑی نے جواب دیا۔ ”سرنکا پٹم میں ہوگا کیونکہ سلطان نے اسے بلایا تھا!“  
داگیہ نے پوچھا۔ ”کیا تمہارا کرنل پامران لوگوں میں موجود تھا جنہیں میں نے حکم  
دے کر چلتا کر دیا تھا؟“

”ہاں ان میں وہ بھی موجود تھا وہ زخمی تھا اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو میری مدد  
کو ضرور دیتا تھا!“

داگیہ ہنسنا کہنے لگا۔ ”اچھا میں ہوا کہ وہ ہمارے مقابلے پر نہیں آیا اگر غلطی  
اور نادانی سے اچھا تو یقیناً قتل کر دیا جاتا۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا پامران بھی تم سے محبت

کرتا ہے؟

دزدی نے گردن جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ ”ہاں وہ بھی مجھے بہت چاہتا تھا“  
 جاگہ ایک دم گرم ہو گیا۔ چیخ کر بولا۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم سادہ لوح اور  
 بھولی بھالی لڑکی ہو اگر پامر کو تم سے محبت ہوتی تو تمہیں میرے حوالے کر کے ہرگز نہ جاتا“  
 دزدی نے پامر کی دکالت کی، بولی۔ ”اس نے ایسا مجبوری کی حالت میں کیا تھا۔“  
 ”عاشق اور مجبوری دو متضاد چیزیں ہیں جو عاشق ہو، وہ مجبور نہیں ہوتا!“  
 داگیہ کی دزدی باتوں نے دزدی کو چونکا دیا۔ وہ ترسے اب تک سیدھا سادہ لہزن  
 سمجھ رہی تھی سفاک انسان جو دلائل اور منطق کی جگہ بھی اپنے ہتھیار دل سے کام لیتا ہے!  
 دزدی چپ ہو رہی لیکن داگیہ نے جلے دل سے متنبہ کیا۔ بولا۔ ”اگر تم اب بھی پامر سے  
 محبت کرتی ہو تو شوق سے کوئی رہو۔ لیکن میری ایک بات ضرور یاد رکھو، منزل پامر تہا دی جیسی  
 دلیر اور مردانہ حوصلے کی لڑکی کی محبت کا اہل نہیں ہے!“  
 دزدی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

نیل گمری کی دلدی میں رہتے ہوئے تقریباً بارہ دن گزر چکے تھے داگیہ کی ناکامی اور  
 دزدی کی کاسبابی کا علم بھی کوہو چکا تھا انہیں حیرت تھی کہ ان کے سخت دل مردانہ داگیہ جی  
 کو آخر ہو کیا گیا ہے، داگیہ کے تمام ساتھی خوب خوب داد عیش دے چکے تھے ادب انہیں  
 کمائی کی فکر دانتی تھی، ان کے لئے ساتھی بھی داگیہ جی کے فرمان کو پچ کے منتظر تھے۔  
 داگیہ نے دلدی کو چھوڑنے سے پہلے اپنے آہٹ شناس کو چند آدمیوں کے ساتھ  
 گمری کی شمالی حدود کے اس پار بھیج دیا کہ پہلے وہ اس بات کا اطمینان کر آئے کہ مطلع سادہ  
 بھی ہے یا نہیں، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ فرانسسیسی کسی نہ کسی بڑی حادث کا سہارا لے  
 اس کو تلاش فرور کر رہے ہوں گے!

دوسرے دن ہی اس کا آہٹ شناس واپس آ گیا۔ اداس نے یہ تشویشناک خبر سنا  
 کہ اس نے میسور کی حدود سے نکل کر نیل گمری کی حدود میں داخل ہوتے ایک سلطانی دے  
 کو دیکھا ہے، ان کے ساتھ چند سفیر فام بھی ہیں جو یقیناً فرانسسیسی ہوں گے، اس دے  
 میں تقریباً دھائی تین سو آدمی ہوں گے!

داگیہ نے پوچھا۔ ”تو انہیں کہاں چھوڑ آیا؟“

آہٹ شناس نے جواب دیا۔ ”وہ کہیں قریب ہی جھٹک رہے ہوں گے!“

داگیہ نے اس ہنگامی مسئلے پر اپنے ساتھیوں سے راتے طلب کی تقریباً ہر ایک نے  
 مشورہ دیا کہ چھپ کر ان پر شب خون مارا جائے لیکن داگیہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بولا  
 "ٹیپو کی بہادری، تدبیر، فرسست اور حب الوطنی کا دل سے قائل ہوں، ہم دونوں کے  
 اصد بھی ایک ہیں پھر ہم آپس میں لڑ کر اپنی طاقت خواہ غزوہ کیوں ضائع کریں!"  
 ساتھیوں نے داگیہ کا ٹیپو کی طرف جھکاؤ محسوس کر کے، خود کو اس کی مرضی کا  
 بیع کر دیا اور اسی مجلس مشورہ میں داگیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ کسی بھی طرح سلطان  
 سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا!

سلطانی دستے کی آمد کی خبر فرانسیزی خواتین نے بھی سنی اور انہیں یہ سوچ کر  
 رشی ہوئی کہ جلد یا بدیر ان کے جبری آقا کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے لیکن روزی کے  
 سوچ ان سے مختلف تھی، اسے داگیہ میں ایک برکے آدمی کی خصوصیات دکھائی دے رہی  
 تھیں، ایک ہوشیار، صاحب فرسست باکردار انسان کی خصوصیات، اسے خوب اندازہ تھا کہ  
 داگیہ سلطانی دستے کے قابو میں باسانی نہیں آتے گا!

اس دن شام ہی کو داگیہ اپنے دو جن بھر دلیروں کو لے کر ادھر داند ہو گیا جہاں  
 سے سلطانی دستہ ان کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا، آہٹ شناس اس کے ساتھ تھا جو بار بار  
 زمین پر میرٹ کر اپنے کان زمین سے لگا کر غنیم کی آہٹ اور فاصلے کا اندازہ لگاتا رہتا۔ وہ  
 غنیم کی سمت تنگ کا تعین کرتا جا رہا تھا۔

دوبدار کے جنگل میں پہنچ کر وہ رک گیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شہی کرتا  
 ہوا بولا۔ "داگیہ جی! غنیم ہم سے اب زیادہ دیر نہیں ہے!"  
 داگیہ نے پوچھا۔ "کیا وہ ہماری طرف آ رہے ہیں؟"  
 "بالکل بالکل!"

داگیہ نے اپنے ساتھیوں کو ادھر ادھر چھپاتے ہوئے حکم دیا۔ "سبب میں گولی چلاؤ"  
 اسی وقت تم سب بھی گولیاں چلا دینا!"  
 لوگوں نے داگیہ کی بات گروہ میں باندھ لی۔

شاید نصف گھنٹے بعد یہ دستہ نمودار ہوا۔ ان کے ساتھ پانچ چھ فرانسسی بھی تھے  
 داگیہ نے پوچھا۔ "ہم میں کوئی ایسا بہادر بھی ہے جو کسی نہ کسی طرح غنیم کے  
 شکر میں چلا پائے اور اسے میرا ایک رقعہ پہنچا دے!"  
 ایک پچیس چھیس سالہ منچلا لر جوان آگے بڑھا۔ بولا۔ "اس کام کو میں انتخاب

داگہیہ ہوا۔ ”دھنیہ ہے تیری سوامی بہرہ خوب!“

اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سلطانی دستہ ہاتھوں میں مشعلیں لئے بڑھا چلا آ رہا تھا۔  
ایک ایک کسی طرف سے بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ بس پھر کیا تھا۔ داگہیہ کے ساتھیوں نے  
تاثر توڑ دئے شرور کر دیے، پوری دادی میں بندوقوں کی آواز اور چیخ و کار سے میدان حشر  
جیسا سماں بندھ گیا تھا۔

سلطانی دستے کو یہ شبہ گزرا کہ ان کے حریف بھی تو راد میں شاید بہت زیادہ ہیں  
وہ موقع کی تلاش میں ادھر ادھر چھینے لگے۔ داگہیہ نے بھی ان کا تعاقب نہیں کیا کیونکہ وہ  
ان سے چند محلے کی بائیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کی پوری رات نگرانی اور چوکسی میں گزر گئی۔  
سلطانی دستے نے اپنی مشعلیں بھی بجھا دی تھیں۔

صبح جب فجر کے بعد اپنے آہٹ شناس کی اطلاع پر داگہیہ ذرا آگے بڑھا تو راستے  
میں اسے کئی لاشیں پڑی دکھائی دیں، داگہیہ چھپتا چھپتا ناد خٹوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا چلتے  
سیالاک اور عقاب جیسی تیز نگاہوں کے سہارے ایک چشمے تک پہنچ گیا وہاں اس نے منہ ہاتھ  
دھوئے اور چند گھونٹ پانی پیا بھی، ایک ایک پہاڑی کے نشیب سے کسی نے بندوق چلائی  
لوگ لیٹ گئے۔ گولی ایک سیاہ چٹان سے ٹکرائی مگر سنگ مرمرے اڑائی غائب ہو گئی داگہیہ نے لیٹ  
کر ادھر دیکھا، جادھر سے گولی کی آواز آئی تھی۔ پھر سیال پھتر اسی گمنیچے دو بھاری پھتر و  
کے درمیان بندوق کی متحرک نال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ داگہیہ دیر تک خاموش بیٹھا ناں پر نظر  
جھانٹ رہا۔ بیس بیس منٹ بعد پھتر وں کے درمیان سے ایک مرد نمودار ہوا اور بھاگ کر ایک  
درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ داگہیہ کی بندوق کی نال اس شخص کی حرکات کے ساتھ ساتھ حرکت کر  
لگی اور پھر ایک زوردار کڑک کے ساتھ بندوق کی نال سے شعلہ نکلا اور داگہیہ کا شکار ڈھیر ہو  
داگہیہ اپنے ساتھیوں کو لے کر نہایت ہوشیاری سے نیچے اترا اور گرد و پیش کا جائزہ لیتا اپنے  
شکار تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی غیر ملکی نوجوان تھا جو اندھے منہ چٹا ہوا تھا۔ گولی اس کے داہنے  
شانے کو چھید گئی تھی اور پھتر پر گرنے کی وجہ سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا۔ اس کی بندوق آدھ  
اس کے جسم کے نیچے تھی اور آدھی باہر، داگہیہ نے اس کے ہتھکڑیوں پر پھیلی رکھ دی۔ ابھی سا  
آج رہی تھی داگہیہ کے جی میں آئی کہ اس کے سفید خام کے سینے میں خنجر اتار دے لیکن ذ  
دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس نے سگری ہوئی بھونڈے سے آنکھیں کھولی دیں، اور داگہیہ کہ  
خشم آلود نظروں سے گھورا۔ اس نے داگہیہ کو پہچان لیا تھا۔ لڑکھرائی آواز میں پوچھا۔ ”تم دہ“

دنا جس نے ہم سے ہماری عورتیں چھین کر ہمیں بھگادیا تھا؟

”ہاں؟“ داگیہ نے جواب دیا۔ اسے اس نوجوان پر کسی بات کا شک ہو گیا تھا، اس نے

دچھا کیا تھا، انا نام پامر ہے؟“  
 زنجی نوجوان داگیہ کی زبان سے اپنا نام سن کر ذرا حیران ہو گیا۔ پوچھا: ”تم مجھے کس

ارج جانتے ہو؟“

داگیہ نے جواب دیا: ”مدی کے ذریعے، اس سے تمہارا ذکر کیا تھا!“  
 پامر نے کمر بند سے کمرٹ بدل لی، چاہی لیکن طاقت جبراب دے گئی، لڑکھڑائی آواز

میں سوال کیا: ”وہ کہاں ہے؟“

داگیہ نے جواب دیا: ”میرے پاس!“

پامر نے ”اف“ کو کے آنکھیں بند کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے

گوشوں سے آنسو بہہ نکلے۔

داگیہ اسے سسکتا چھوڑ کر واپس چلا جانا چاہتا تھا، اتفاقاً کہ پامر نے پھر آنکھیں کھول  
 دیں اور اپنی کمر بین ہاتھ ڈال کر کچھ تلاشن کرنے لگا، داگیہ نے کہا: ”پامر! مجھے تم سے کوئی ہمدردی  
 نہیں، کیونکہ جب تم سفید فام تاجر و لا کا ہم پر زبرد چلتا ہے تو تم بھی پتھر ہو جاتے ہو، میں تمہیں  
 سسکتا چھوڑ کر واپس جانا چاہتا ہوں“ پھر پامر کی بے بسی اور رازیت سے لطف اندوز ہو کر  
 مسکراتے لگا۔ پوچھا: ”مدی کے نام کوئی پیغام؟“

”کوئی پیغام نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے کمر کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا، اس میں

خنجر تھا، ہاتھ اور پراٹھا اور پامر نے یہ کہتے ہوئے اسے اپنے پیٹ میں گھونپ لیا: ”مدی سے

کہہ دینا پامر مر گیا۔ تیرا عاشق اس جہان سے کپڑ کر گیا؟“

پیٹ سے خون کا لہارہ پھوٹ نکلا اور خدا دیر بعد پامر کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

داگیہ یہ یقین کئے بغیر کہ پامر مر یا زندہ ہے، وہاں سے ہٹ گیا۔

ابھی یہ لوگ آئندہ کے افلام کا کوئی فیصلہ بھی نہ کر سکے تھے کہ سلنے کی چھوٹی ٹی

خمدار سڑک پر ایک گھر سوار سفید پھر بڑا اڑتا ہوا آگزا۔ یہ صلح کی علامت تھی، داگیہ نہایت

ہوشیار رہی اور احتیاط سے اس شخص کے سامنے آگیا اور اسے پہچان لیا کہ یہ اسی کا اپنا ہی آدمی ہے

وہ شخص جو سلطانی دستے میں داگیہ کا پیغام لے کر گیا تھا۔ داگیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے

دک لیا اور بے حسنی سے پوچھا: ”کیا خبر لاتے؟“

اس نے جواب دیا: ”خوش خبری، بہت بڑی خوش خبری!“

داگیر کے تمام ساتھی ادھر ادھر سے نکل کر وہاں جمع ہونے لگے۔

داگیر نے اپنے قاصد سے سوال کیا: ”کیسی خوش خبری، صاف صاف بتاؤ!“

قاصد نے جواب دیا: ”ہیں سلطانی دستے کے امیر کے پاس سے چلا آ رہا ہوں اس کے پاس داگیر جی کے لئے کوئی خاص پیغام ہے جسے وہاں چلا کر آپ خود وصولی کر سکتے ہیں!“

داگیر نے پوچھا: ”کس قسم کا پیغام ہے؟“

قاصد نے جواب دیا: ”سلطان چاہتے ہیں کہ داگیر جی اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم پہنچ جائیں وہاں انہیں سامان جنگ سپاہی اور قلعے مل جائیں گے داگیر جی وہاں اپنی صلاحیتوں کو اچھی طرح آزماسکیں گے۔“

داگیر نے آدمیوں کے ساتھ قاصد کی رہنمائی میں، سلطانی دستے میں پہنچ گیا دستے کے امیر نے اس کا گرم خوشی سے استقبال کیا اور مصافحہ کر کے بغل گیر ہو گیا۔

داگیر نے بے تکلفی سے پوچھا: ”تم میرے لئے سلطان کا کیا پیغام لاتے ہو؟“

سلطانی امیر نے، سلطان کا واقعہ داگیر کی طرف بڑھا دیا۔ داگیر نے اعتراضات سے اس کا غرور کو چھوڑا اور انکھوں سے لگا لیا۔ پھر کھول کر پڑھنے لگا۔ سلطان نے داگیر سے کہا: ”کی تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سرنگا پٹم آجائے وہاں اسے ہر قسم کی سہولت دی جائے گی اور سلطان اس سے شایان شان سلوک کرے گا۔“

داگیر نے سلطانی امیر سے کہا: ”دوست بہنم بہنیں شہر و دیں ڈوڑا بٹا کے دامن سے اپنے ساتھیوں کو بلا لاؤں!“

سلطانی دستہ وہیں ٹہر گیا۔ داگیر جلتے جلتے پامر کی لاش پر گیا اور سر ہانے پھرتے ہو کر کہا: ”بد نصیب پر دسی! قوتے مر کر میرے لئے بڑی انکھیں پیدا کر دی ہے اور بد قسمتی سے موت سے پہلے میری ہی آخری گرتی تیرے شانے کو چھب کر اپنا کام کر گئی اگر تو خود کشتی نہ کرتا تب بھی مرجاتا!“

اس کے بعد اس نے پامر کے چہرے کا خوب اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی راہنی پٹنی بھی زخمی تھی اور یہ زخم پرانا تھا۔ یہاں تک کہ کسی گہری چوٹ کا چکنا نشان تھا اور ہاتھ کی چھوٹی چھوٹی انگلیاں خاصی گرہ دار تھیں، جس سے پامر کے حقائق پسند اور عملی ہونے کا ثبوت ہم پہنچتا تھا۔ اسے ہاتھ کی چھنگلیاں کی برابر والی انگلی میں صوٹے کی انگوٹھی تھی جس پر آکر کھدا ہوا تھا۔ جس سے داگیر نے رفتی کے پہلے حرف کا اندازہ لگایا۔ داگیر نے انگوٹھی اتار کر دھوئی کے پھینٹے میں رکھ ل اور واپسی کے لئے مڑا۔ بولا: ”اچھا دوست! رخصت!“



تم معلوم نہیں کب تک یہاں پر رہے رہو گے اور روزی بھگوان جانے کب تک تمہارا انتظار کرتے گی۔ شاید زندگی بھر کیونکہ یہ بات میں اسے کس طرح بتا سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں ادھوا کر دیا تھا۔ اس کے بعد تم نے خود کشی کر لی۔

واگبہ کے پیچھے آنے والے ساتھی اسے تلاش کرتے ہوئے پامر کی لاش تک پہنچ گئے۔ کسی ایک نے پوچھا: "واگبہ جی! اس کے پاس سے کوئی کام کی چیز نکلی؟" واگبہ نے اپنی دھوئی کے پھینٹے میں سے چند بگڑے نکال کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیے۔ واگبہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نیل گہری کی دادی میں چلا گیا اور سب کو تیار کر دیا اور روانگی کا حکم سنایا۔ ذرا سی دیر میں سلطانی پیش کش اور طلبی کا سبھی کو علم ہو گیا۔ دوسو مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

فرانسیسی خواتین خوش تھیں کہ فرانسیسیوں کا حلیف سلطان شاید دھوکا دے کر واگبہ اور اس کے ساتھیوں کو مرنگا پٹم طلب کر رہا ہے اور یہ مارے کے مارے دریائے کا دیرری کے شاپو میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لئے جائیں گے اور فرانسیسی خواتین ان سے جبراً چھین کر فرانسیسیوں کے حوالے کر دی جائیں گی۔

روزی نے اپنے خانے پر بکھرے ہوئے سنہری بالوں کو گھوڑے کی دم کی طرح باندھ لیا اس وقت اسے ایک گونا گوناٹ حاصل ہو گئی تھی اسے یہ یقین تھا اگر وہ واقعی مرنگا پٹم پہنچ گئی تو یہ محکومی کی حالت نہیں باقی رہے گی کیونکہ میرو فرانسیزیوں کا ہمدرد اور حلیف تھا۔ وہاں اس کے ہم وطن پہلے سے موجود ہوں گے ادا نامی میں پامر بھی ہو گا۔ واگبہ کے لئے اس کے دل میں جلدیہ احترام ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس سے قرآن اور جنگی چھاپہ مار ہونے کے باوجود روزی کو شایا نہیں تھا۔ اس نے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ اگر میرو نے اسے واقعی دھوکے سے ہلا کر گرفتار کر لیا تو وہ اپنے ہم وطنوں کے اثرات استعمال کر کے تم از کم واگبہ کو رہائی ضرور دلائے گی۔ واگبہ نے روزی سے بطور خاص کہا: "روزی! ہم لوگ مرنگا پٹم چل رہے ہیں!"

صحیح معلوم ہے! "روزی نے بے تیزی سے جواب دیا۔ واگبہ کچھ کہنے کے لئے الفاظ اور اسلوب تلاش کرتے لگا۔ کچھ تامل سے پوچھا: کیا تم

پامر کو بھلا نہیں سکتیں؟

"نہیں! "روزی نے جواب دیا: "اس کا سوالی ہی نہیں پیدا ہوتا؟"

"اگر وہ فرانس واپس چلا ملتے تمہیں چھوڑ کر، تب تم کیا کر دو گی؟"

روزی نے جواب دیا: "میں بھی فرانس چلی جاؤں گی!"  
 "اگر وہ یہیں ہندوستان میں رہ کر تمہیں بھلا دے تو؟"  
 "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!"

"اگر وہ مرحلتے تو؟"

"تو میں بھی مر جاؤں گی!" پھر آند دگی سے داگیہ کو دیکھ کر کہنے لگی: "لیکن تمہیں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

داگیہ پھر کسی فکر میں ڈوب گیا۔ پھر بوجھا: "پامر کی عمر کیا ہوگی؟"  
 روزی نے جواب دیا: "یہی جو بیس پچیس سال!"

"کیا اس کی باتیں کپنی کے نیچے کسی گہری چوٹ کا پسنا نشان بھی پایا جاتا ہے؟"

"ہاں!" روزی چونک کر بول: "کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے؟"

"تمہیں!" داگیہ نے کہا: "کیا اس کی انگلیاں چھوٹی چھوٹی اور گہرے دار ہیں؟"

روزی چونکے انداز میں: "حشت زدگی سے داگیہ کو گھورتے لگی، بولی: "بات کیا ہے داگیہ

جی! تم مجھے کبھی صاف صاف کہو کہ میں کیسا ہوں؟"

داگیہ نے فسوس سے جواب دیا: "مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس جلیے کا اذیت نام کا ایک غیر ملکی سرنگاٹیم جاتے ہوئے کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاکا ہو گیا اس کی انگلی میں جو انگوٹھی تھی، اس پر حرف اڑکھدا ہوا تھا؟"

روزی چیخ مار کر روئے لگی: "تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو اس لئے کہ میں پامر کو بھلا کر تم سے محبت کرنے لگوں، لیکن داگیہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں، میں تمہارے اسی جھوٹ پر کسی قیمت پر بھی یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں!"

داگیہ نے دھوٹی کے پھینٹے سے پامر کی انگوٹھی نکال کر روزی کے آگے پھینک دی۔ بولا: "میں جھوٹ نہیں بول رہا، روزی۔ اس انگوٹھی کو پہچانو کہ یہ کس کی ہے؟"

روزی نے پھرتی سے انگوٹھی اٹھائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی اور یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ وہی انگوٹھی ہے جو پامر اپنے باتیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنے رہتا تھا۔

روزی نے مذہب لہجے میں بوجھا: "یہ تمہیں کہاں ملی؟"

داگیہ نے جواب دیا: "میں اس شخص کو پہچانتا نہیں لیکن وہ ہمارے پاس یہ پہنچا۔  
 کہ منور آیا تھا کہ چامرنای فرانسیزی کسی پہاڑی سے پھسل کر ہلاک ہو گیا، پھر اس نے پامر کا وہ حلیہ بیان کیا۔ جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا۔ وہ دراصل تم سے ملنا چاہتا تھا، تمہاری تلاش

ہاں تک آگیا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو تمہارے نام ایک امداد لکھو بھی دے کر واپس چلا گیا!

ردی نے شک و شبہ سے دریافت کیا: ”وہ پیغام کیا تھا؟“  
 داگیہ نے جواب دیا: ”پارہ نے مرتے وقت تمہارے نام یہ پیغام چھوڑا ہے کہ اس کے بعد زادہ جو جس سے چاہو شادی کر لو!“

ردی نے غصے میں کہا: ”تم اپنے مقصد کے لئے جھوٹ بول رہے ہو، میں تمہاری کالیں نہیں کر سکتی!“

داگیہ نے کہا: ”تمہاری مرضی یقین کر دیا نہ کرو، مجھے جو پیغام ملا تھا تمہیں پہنچا دیا!“  
 ردی نے کہا: ”تم مجھے کسی بھی طرح سرنگا پٹم تک پہنچا دو، اس خبر کی میں خود تصدیق دل گی اس کے بعد کوئی فیصلہ کر دوں گی!“

اسے اپنی طرف مائل کرنے کا اس تدبیر کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔  
 دھونڈو جی داگیہ کا شہرہ اس سے پہلے ہی سرنگا پٹم میں پہنچ چکا تھا۔ یہ لوگ جب جنوبی ہندوستان کے سرنگا پٹم میں داخل ہوئے تو انہیں دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ جمع چکے تھے۔ بیویوں نے انہیں یہ عزت بخش کر چند امرا ان کے استقبال کو آئے۔ اس وقت سلطان نے ایوانِ عام دریا درخت باغ کی بالائی منزل میں موجود تھا۔ سلطان کے امرا داگیہ کے آدمیوں کے پیچھے چھوڑ کر اسے سلطان کے دربار میں گئے، داگیہ نے سلطان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے بھلا۔ ایک آئینہ تخت پر سرخ ریشمی گاؤں کے مہارے گندی رنگ اور نقرہ چا پٹنٹ تھا۔ پرنس قاضی کا پر رعب انسان بیٹھا ہے، اس کی ناک خم دہی اور آنکھیں بڑی بڑی پتھر آب ہیں، چہرے کے خط وخال نازک تھے اور ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے، داہی منڈی ہوتی تھی اور گردن پر بیس پٹری ہوئی تھیں، جاگیہ فرط عقیدت سے سلطان کے دربار میں جھک گیا۔ سلطان نے داگیہ کو دیکھتے ہی معمولی سی حرکت کی اور چہرے سے خوشی کا اظہار کیا۔  
 داگیہ کو سلطان کے دربار میں بیٹھنے کی عزت بخشی گئی۔

اسی وقت وزیر اعظم سلطنت خداداد میر صادق اور دیوان پورنیا سلطان کے دربار میں ہوتے، پورنیا بھاری جسم کا بنیا تھا۔ اس کے لئے کاندرے پر پاد سے کچھ چھٹا کپڑا چڑھا ہوا تھا اور سر پر مارا دیوں جیسی ٹوپی رکھی تھی، میر صادق کی سرچھیں، بانجھوں کے اس پاس نیچے منڈی کی طرف جھک گئی تھیں، اور اس کی آنکھوں سے بنے خیال اور خود غرضی مترشح تھی۔  
 داہی منڈی تھی۔

سلطان کی اس پراس کے معتمد نے داگیہ کا میر صادق اور پورنیلا سے تعارف کر لیا۔  
صادق بظاہر خوش ہوا۔ اس نے سلطان سے کہا: ”حضور والا! یہ وہی بدنام زمانہ دھندہ  
داگیہ ہے نا جس کی رہنری کا دور دورہ شہر ہے؟“

داگیہ کو میر صادق کا یہ انداز گفتگو ناگوار گزرا۔ سلطان نے بھی اسے محسوس کر لیا۔  
”ہیں اس کی انگریز دشمنی اور حب الوطنی پسند ہے دو مہرے یہ ایک غیر معمولی صلاحیت کا  
ہے اور ہماری خواہش پر عمر نگاہیم آیا ہے؟“

میر صادق نے دو مہرے ادا کر کے بولا: ”اس نے ایک آدھ بار سلطنت خداداد کا  
پر بھی توجہ کر کے لوٹ مار کی ہے؟“

”درست، لیکن اب داگیہ ہمارا دوست اور مہمان ہے!“  
پورنیلا بھی تنک خاموش تھا۔ اب اس نے بھی زبان کھولی لیکن میر صادق کی سزا  
اور داگیہ کی مخالفت میں بولا۔

”اعلیٰ حضرت! تقریباً دو ہفتے پہلے اسی شخص نے سلطان کے حلیف فرانسیس  
ایک قافلے پر حملہ کر کے ان کی عورتوں کو چھین لیا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک اعلیٰ حضرت کے  
اور ان کی عورتیں آج اور اس وقت بھی دریا دولت باغ کے باہر داگیہ کے ساتھیوں نے  
موجود ہیں؟“

سلطان نے شاکی نظروں سے داگیہ کو دیکھا اور پوچھا: ”کیا یہ درست ہے؟“  
”ہاں حضور والا!“ داگیہ نے جواب دیا: ”مگر حضور والا کو فرانسیسیوں پر اعتماد ہے  
یہ ناچیز بھی ان پر اعتماد ان کی عزت کرے گا۔ ان کی جو عورتیں ہمارے پاس ہیں ہم  
کمدیں گے؟“

پورنیلا نے دلیری اختیار کی، بولا: ”لیکن تم اعلیٰ حضرت کو پہلے یہ یاد کرو کہ ان  
حلیف فرانسیسیوں کے ساتھ تم اور تمہارے ساتھیوں نے جو انتہائی ناشائستہ حرکت کی  
کے لئے تم لوگ سلطان کی مزا کے مستحق نہیں ہو!“

داگیہ کا غصے سے چہرہ تہما گیا۔ بولا: ”اس الزوان وام میں سلطان کے رد یہ دعا  
ادب مانع ہے اگر مجھ سے یہی سوال جواب باہر کیے جاتیں تو میں ان کے منہ توڑ جواب د  
سکوں گا؟“

میر صادق نے سلطان کو مخاطب کیا: ”حضور والا! اس کی کمرشی اور بغیانہ سرشت  
فراموش، اسے آداب سلطانی تک کا خیال نہیں، پھر حضور والا اس پر کس طرح اعتماد کریں گے

داگیہ نے اپنی فطری دلیری سے جواب دیا: ”یہاں میں اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں آیا، مجھے سلطان نے بلایا ہے اب جبکہ میں اپنے ساتھیوں کو لے کر مرنگاپٹم میں داخل ہو چکا ہوں، تم سب کو اپنے سلطان کے ہاتھوں کی اس طرح اہانت اور بے عزتی نہیں کرنی چاہیے۔“ سلطان ان کی تلخ باتیں ناگوار سے سن رہا تھا اس نے پورنیا اور میرصادق کو ڈانٹا: ”یہاں اس لئے نہیں طلب کیا گیا ہے کہ تم داگیہ کو اس کی فرد جرم خلاف داگیہ کیا ہے اور یہ سے کس سلوک کا مستحق ہے؟ میں خوب معلوم ہے!“

میرصادق نے جھک کر سلطان کو تعظیم دی اور ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ”حضور والا! یہ ام قرآن پاک کی قسم کھا کر جناب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ناچیز نے داگیہ کی بابت جو کچھ بھی اسنا ہے اس میں خلوص اور دیانت کا جذبہ کارفرما ہے، یہ غلام اس مملکت عظیم کا درمیر ہے اور نا منصب کی ذمہ داریوں کے پیش نظر داگیہ سے صفائی طلب کر رہا تھا!“

پورنیا نے عرض کیا: ”اگر اعلیٰ حضرت اپنے حلیفوں کے دشمنوں پر اسی طرح کرم فرماتے ہیں تو پھر وہ دن دور نہیں کہ اعلیٰ حضرت اپنے دوستوں کے اعتماد سے محروم ہو جائیں گے!“ سلطان ان شاطوں کی چرب زبانی سے مات کھا گیا۔ اس نے داگیہ سے سوال کیا: ”تم

ہمارے حلیف غرائسیوں پر تاخت کدوں کی؟ اور ان کی عورتوں کو ان سے کیوں چھین لیا؟“ داگیہ نے جواب دیا: ”سلطان خوب اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم حق پرست لوگ نہ

دکوئی؟ فائدہ مند رکھتے ہیں نہ کوئی گھرنہ وراؤکن کی حکومت ہماری دشمن ہے۔ مرنے ہمارے خلاف ہیں انگریز ہمارے خون کے پیاسے ہیں، کچھ عرصے پہلے تک خود سلطان کا دل بھی ہماری طرف سے صاف نہ تھا ان حالات میں ہمیں ہمیں مرنے کی جگہ تک نہیں مل سکتی۔ ہمارے

سپاہیوں کو سو دین دو کارڈیفیں، ایک مردار کی حیثیت سے میرا عرض تھا کہ یہ ان کی یہ ضرورت پوری پوری کرتا۔ اب ہم ان عورتوں کو ان کے دربار کے حوالے کر دیں گے اور اتنے اس قسم کے کچھ نہیں کریں گے۔“ سلطان نے پورنیا کو حکم دیا: ”داگیہ کے ساتھی آج سے ہمارے قیام میں آئیں تین

ماہ کی تنخواہیں پیشگی ادا کر دی جائیں!“ پھر میرصادق کو حکم دیا: ”مرنگاپٹم کے مشرقی حصے گنجام میں تم ان سب کی رہائش کا انتظام کرو!“ پھر اپنے معتمد سے کہا: ”اور تم ان فرانسیسیوں کو طلب کرو جن کی عورتیں داگیہ کے قبضے میں ہیں!“

پورنیا، میرصادق اور سلطان کا معتد زبیبوں سلطان کے حکم کی تعمیل کے لئے باہر چلے گئے۔

سلطان نے داگیہ سے کہا: ”داگیہ! تم ان کی باتوں سے بد دل نہ ہونا۔ یہ دونوں ہمارے

بہترین تیر خواہ ہیں اور تمہیں چاہئے کہ ہم کسی طرح اور کسی وجہ سے کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں انہوں نے تم سے جس قسم کی باتیں کیں اس میں بدینتی کو کوئی دخل نہیں !

صاف گواگئے تھے اپنی آزدانہ سرشت کے ماتحت جواب دیا: اگر سلطان انہیں اپنا خیر خواہ اور مخلص تصور فرماتے ہیں تو انہیں کوئی تکس طرح ٹوک سکتا ہے لیکن اس ناچیز کی راستے میں یہ دونوں ٹک حرام اور غدار ہیں ان سے وفاداری کی امید رکھنا ایسا ہے جیسے بولنے آسم کی توقع رکھنا۔

سلطان نے ناگوارہی سے واگئے کو دیکھا: اپنے خدمت گاروں کو ہم بہتر سمجھیں گے وہ لوگ جنہوں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہو !

واگئے نے سلطان کی ناراضگی کی پردہ کے بغیر بول دیا: پورینا اور میر صادق کی بابت اس ناچیز نے یہ عام شہرہ سن رکھا ہے کہ سلطان کے والد نواب حیدر علی خاں نے اس کو یہ حکم دیا تھا کہ ان دونوں کو فوراً قتل کر دیا جائے !

سلطان نے کہا: ہاں والد مرحوم نے ان دونوں کے خلاف یہ حکم دیا تھا لیکن ہم انہیں اپنا خیر خواہ اور دیکھ سکھکا ساقی تصور فرماتے ہیں۔ یہ سزاوری نہیں ہے کہ والد مرحوم کی رائے کو یہ درست ہی ہو !

واگئے نے بے بسی سے حیرت کیا: سلطان اپنے خدمت گاروں سے اچھی طرح واقف نہ ہیں کیا کہہ سکتے ہیں !

اسی دوران سلطان کے دو مرد شہر کو توڑی اس جرم میں پیش کیا گیا کہ شہر میں کسی جگہ چوری ہو گئی تھی اور شہر کو توڑی چوروں کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا جس کا پانی چوری ہوا تھا اس دن کو بتایا کہ تقریباً دو ہزار پکڑیوں کا سامان چوری ہو گیا ہے سلطان نے جسم زون میں یہ فیہ سنا دیا کہ وہ ہزار پکڑیوں کے شہر کو توڑی اپنے پاس لے آ کر دے کیونکہ یہ چوری یا چوروں کا پتہ لگا اور ان سے مال برآمد کر کے صاحب سامان کے حوالے کرنا۔ چونکہ شہر کو توڑی اس میں ناکام رہا تھا اس لئے سلطان نے تو انہیں کی رو سے یہ رقم شہر کو توڑی کو آدا کر لی چاہیے۔

واگئے کو سلطان کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔

فرانسیسی عورتیں ان کے مردوں کو واپس کوڑی گیتی، واگئے کے ساقی سلطان کی لڑکی میں شامل کر دیئے گئے خود واگئے کوئی ہمراہ بھی نہ حاصل کر سکا۔ روزی اپنے ہم وطنوں میں پہنچ کر پار کو تلاش کرتی رہی جہاں سے اسے اسنا علم ہر سکا کہ یا مرفاہ و نصحت ہو جاتے کے ہی

بتے کے ہمراہ تیل گری گیا تھا جو داگیہ کو سلطان کے پاس لایا ہے داگیہ نے اس کی ہلاکت کا واقعہ بیان کیا تھا اس کی تصدیق کوئی بھی نہ کر سکا۔

داگیہ کو آہستہ آہستہ یہ محسوس ہونے لگا کہ اس نے مرزا کاٹم آکر قتل مندری نہیں کی اور سلطان کی سرور مہر کی شکار تھا اس سے مدد بھی جبراً ہو گئی، علامہ گجام کے ایک مکان ہسپتالی اور بے بسی کی زندگی گزار رہا تھا اسے سلطان سے شکایت تھی کہ وہ یہاں سلطنت کی خواہش پر اس کی مدد کرنے آیا تھا اور وہ مسلمان ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن سلطان مکرار امر میں گھرا ہوا اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ اس نے سلطان کو ایک خط لکھا:-

”قبلہ عالم! بندہ تو حضور والا کی خواہش پر اس خیال سے مرزا کاٹم آیا تھا کہ اس سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کوئی خدمت لی جلتے گی لیکن یہ ناپویرتاب تک حضور کی عدم التفاتی کا شکار ہے۔ خادم نے حضور کی تائید اور مہم روئی ماحصل کرنے کے لئے یہاں تک فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے آبیانی دھرم کو چھوڑ کر حضور والا کا مذہب اختیار کرے لیکن حضور کی بے لوجہی کی وجہ سے یہ خاکسار اب تک لوک پر لوک کی یہ نعمت بھی حاصل نہ کر سکا یہ عاجز چاہتا ہے کہ حضور کو اس کی بابت جو فیصلہ بھی کو نسلے جلد از جلد اس کا انکشاف فرمادیں۔ بندہ حد درجہ شکر گزار ہو گا“

سلطان نے یہ خط اپنے امراء کے سامنے دکھ دیا اور ان سے مشورہ لیا کہ اسے کیا کرنا

چاہیے؟

میر صادق نے جواب دیا: ”حضور والا! یہ غلام قرآن پاک کی قسم کھا کر یقین دلاتے نام ہے کہ حضور مدحی داگیہ فریبی ہے اور اس کی بیٹھی بیٹھی یا توں میں بھی کوئی مکر ہے، قرآن کا کسی قسم جب تک آپ کا یہ غلام وزارت کے عہدے پر فائز ہے کسی دھرم کے حضور والا کے حراج اور قیل نہ ہونے دے گا!“

پوریتانے دے نظروں میں کہا: ”حضور خود ہی فیصلہ فرمالیں کہ جو شخص اتنی آسانی سے تفرغیب کے بغیر اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑنے پر آمادہ ہے وہ حضور کا یا اسلام کا کتنا وفادار گا۔ داگیہ پیدائشی رہبر ہے ایک رہبر کا اسلام قبول کر لینا اس پر تو دھرم کے لئے قوت و تہجد بات تو نہیں!“

سلطان نے کہا: ”ہم چاہتے ہیں کہ داگیہ کو کسی نہ کسی منصب سے سرفراز ضرور کریں، ہم نے ایک دم کوئی بڑا منصب نہیں دینا چاہتے اگر وہ مسلمان ہونا چاہتا ہے تو اسے پہلے مسلمان ہو

جائے دیں گے اس کے بعد ایک عالم دینی اس کی تعلیم پر متعین کر دیا جائے گا اور جب وہ مذہب اسلام اور شعاثر اسلامی سے واقف ہو کر ان پر کاربند ہو جائے گا تو اسے کوئی اچھا سا منصب عطا فرما دیں گے۔“

میر صادق نے سلطان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا تو ضرور چاہتا ہے پورنیا وغیرہ کی موجودگی میں کہنا نہیں چاہتا، سلطان نے موضوع بدل دیا اور بعض دوسرے امور زیر بحث آگئے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ سلطان فرانسیسیوں کی تعریف، انگریزوں کی مذمت کر رہا تھا لیکن میر صادق نے دونوں کی مخالفت کی کہنے لگا: ”حضور دالاء! قرآن پاک کی دونوں ہی تائیدیں اختیار ہیں، وہ انگریز ہو یا فرانسیسی دونوں تاجر ہیں، دونوں ہی زراعت پر لگے ہیں، نہ انگریزوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے نہ فرانسیسیوں پر حضور دالاء! مجھے تو اے دونوں ہی سے نفرت ہے۔“

پورنیا نے دست بستہ ہو کر سلطان سے جانے کی اجازت چاہی جو دے دی گئی۔ جب پورنیا پہلا گیا تو سلطان نے میر صادق سے کہا:

”تمہیں میر صاحب! تم اس وقت داگیہ کے بادے میں کچھ کہنا چاہتے تھے؟“  
مصلحتاً نہ کہہ سکے تھے بولوا وہ کیا بات تھی جو تمہاری زبان پر گئے آتے رہ گئی؟“  
میر صادق نے جواب دیا: ”حضور دالاء! داگیہ کے سلسلے میں آپ کے غلام کے ذہن میں تجویز آتی ہے اگر حضرت اس کو عمل کی بھیجی سے گزر لیں تو داگیہ کی خیمت کا کھرا کھڑا پین فو سامنے آجائے گا۔“

سلطان نے حکم دیا: ”بیان کرو!“  
میر صادق نے عرض کیا: ”حضور دالاء! یہ غلام جو کچھ عرض کرے گا وہ سلطان کی محبت اور خلوص میں شائبہ نہ ہوگا۔“

سلطان نے کہا: ”میر صاحب! میں تمہاری محبت اور خلوص پر اعتماد ہے جو کچھ کہنا صاف صاف کہہ دینا۔“

میر صادق نے کہا: ”حضور دالاء! جیسا کہ داگیہ نے اپنے خط میں اسلام سے اپنی محبت ذکر کیا ہے، حضور نے فرما دیا مسلمان کر لیں، حضور دالاء! اسے شرف ملاقات بخشنے کے لئے طلب نہ پھر جیسے ہی داگیہ یہاں آئے حضور دالاء کے خدام حیرا اپنے قابو میں لاکرا اس کی سنت کر دیں، یہ کلمے کے ساتھ ہی ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری رسم ہے۔“

سلطان نے میر صادق کی اس تجویز کو اچھے سے سنا۔ میر صادق جلدی جلدی بولا:



ہم حضور والا! سنت کے بعد داگیہ کی یہ مجال نہ ہوگی کہ اسلام یا حضور سے انحراف کرے  
 حضور والا کا یہ فعل گمراہان گمراہان تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتے گی کہ داگیہ موقع پرست ہے  
 لام یا حضور سے کوئی محبت نہیں!“  
 سلطان نے میر صادق کو کوئی جواب تو نہ دیا لیکن کسی سوچ میں ضرور پڑ گیا۔ اسے میر  
 کے خلد میں پراقتدار تھا اس لئے اس کی تجویز سے اختلاف نہ کر سکا۔

دزدی اپنے ایک ادھیڑ عمر ہم وطن کے جائیداد داگیہ کے دد دانہ سے پرہیز کر اس کے  
 ایسی سے پوچھنے لگی ”کیوں جناب! کیا داگیہ ہی اس مکان میں رہتے ہیں؟“  
 داگیہ ایسی بیٹھک کا باہری دد دانہ بند کیے کسی سوچ میں گم تھا دزدی کی آواز سن  
 دانہ کھول دیا اور سر باہر نکالتا ہوا بولا ”کون؟ دزدی! اندر آ جاؤ میں یہاں موجود ہوں“  
 دزدی اپنے ادھیڑ عمر ساتھی کے ساتھ اندر داخل ہو گئی۔ داگیہ نے انہیں نیلے رنگ  
 دٹے گدے کے فرش پر اسرار سے بٹھا دیا اور خود بڑھ کر ٹیک لگانے کے لئے دو گار  
 بش کر دیے۔

دزدی کچھ بولے بغیر اپنے ساتھی کے ساتھ خاموشی سے لیٹ بیٹھ گئی جیسے اس میں کوئی  
 لوفان پھٹ پڑنے کے لئے اندر اندر مچل رہا ہو۔  
 داگیہ بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا بولا ”یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں تمہیں یاد آ گیا  
 تم میرے پاس بن بلائے آ گیتیں“

مقدی نے ٹمکین آواز میں کہا ”داگیہ! اس وقت میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں  
 نہیں پامر کی بابت جو کچھ بھی معلوم ہے مجھے سچ سچ بتا دو“  
 داگیہ کے چہرے کی خوشی کا نور ہو گئی۔ ہونٹ یوں ایٹھنے لگے جیسے اس سے کوئی تلخ شے  
 رگتی ہو بولا ”دزدی! پامر مر چکا ہے، تم اس پر یقین کیوں نہیں کرتیں؟“  
 دزدی حیرت مانی ہو گئی اذنانہ سے بولی ”میں اس کی صحت کا کس طرح یقین کر لوں،

اگہ! اس کی لاش کہاں ہے؟“  
 داگیہ نے جواب دیا ”لاش کا مجھے خود بھی کوئی علم نہیں، کیونکہ اس کی موت میرے  
 سامنے نہیں واقع ہوئی؟“

مقدی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا ”دوٹی ہوئی ہوئی“ داگیہ اٹم جھوٹ بولی  
 ہے ہو، میرا دل مجھے یہ بار بار یقین دلا رہا ہے کہ تم سچ نہیں بول رہے کم از کم۔ پامر کے معاملے

میں تم صرغہ جھوٹے ہو!"

واگہ نے بد مزگی سے کہا: "اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرو میں تو نہ کرو تمہیں اس کا اثر ہے ادا اگر تم مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہو تو مجھ سے سچ بلو الو کسی طرح!"

روزی نے دندھی ہوئی آواز میں کہا: "اگر تمہیں سچ بولنے پر مجبور کر دینا میرے اختیار میں ہوتا تو واگہ تم سب ہرگز اس طرح جھوٹ نہ بول سکتے!"

واگہ نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ عجیب نظروں سے روزی کو دیکھنے لگا۔ اب اس کے ادھر دھرم ساتھی نے بولنے کے لئے کندھے اچکائے، بالوں پر ہاتھ پھرتا ہوا بولا: "سٹر واگہ! جیسا کہ مجھے اپنی بھتیجی روزی کے ذریعے معلوم ہوا کہ آپ ایک ہمدرد و باکرم دار انسان ہیں کچھ دنوں پہلے روزی مکمل آپ کے اختیار میں تھی لیکن آپ نے اس سے کوئی ناشائستہ سلوک نہیں کیا یہ بڑے ظرف اور کردار کی بات ہے۔ سٹر پام روزی کا سنگتر ہے اگر اس کی بابت آپ کچھ جانتے ہیں تو بتادیں!"

واگہ نے جواب دیا: "میں پام کی بابت جو کچھ جانتا تھا، روزی کو بتا چکا ہوں، اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی کے چلنے کہا: "لیکن سٹر واگہ! پام تو سلطانی دستے کے ساتھ تمہارے پاس کیا تھا پھر وہاں سے وہ واپس نہ آیا۔ اور تم نے روزی کو یہ بتایا ہے کہ اس کی موت کی اطلاع تمہیں کس شخص نے دی تھی، ہم دونوں یہ جانتا چاہتے ہیں کہ آخر وہ کون تھا جس نے تمہیں پام کی موت کی خبر ادا اس کی انگوٹھی دی تھی، تم نے روزی سے پام کا حلیہ جس طرح بیان کیا تھا اس سے بھی یہی شبہ گزرتا ہے کہ تم خود پام سے ملے ہو اور وہ جہاں بھی ہے تم اس سے واقف ہو!"

واگہ نے مختصر جواب دیا: "میں کچھ بھی نہیں جانتا!"

روزی نے دندھی ہوئے کہا: "واگہ! حیران دل کہتا ہے کہ پام زندہ ہے اور تم نے اس پر قابو پا کر کہیں قید کر دیا ہے۔ تم میری وجہ سے اسے قید میں رکھنا چاہتے ہو ادا اس کی موت کا یقین دلا اگر تم مجھے اپنی طرف مٹھت کرنا چاہتے ہو!"

واگہ نے ددشت نہ کیے میں کہا: "بکواس بند کرو! میرا دماغ نہ خراب کرو!"

روزی کے چپانے مانوس سے کہا: "روزی! ہمیں واگہ کی بات پر یقین کر لینا چاہیے!"

روزی نے جھنجھلا کر کہا: "میں ہرگز یقین نہ کروں گی ادا ایک نہ ایک دن واگہ کو سچ بولنے پر مجبور کر دوں گی!"

واگہ نے اندرونی کمر بے اپنے آنکھیں بند کر لیں، جیسے وہ کسی بہت بڑے بوجھ

اشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

ماحول پر کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ ایسا سکوت جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو۔  
پھر اشکبار آنکھیں اٹھیں اور ردی نے واگیہ کو مخاطب کیا۔ ”واگیہ! بس چند باتیں  
باد رکھ دوں گی اس کے بعد چلی جاؤں گی۔“

واگیہ نے اسے رحم آمیز نظر سے دیکھا اور لا۔ ”کہو۔“  
ردی نے پوچھا۔ ”تم نے چند دن پہلے جس بلند کواری کا ثبوت دیا تھا کیا تم حقیقتاً  
ہی ہو کیونکہ وہ تمہارے پیشے کی نفی کرتا ہے؟“

واگیہ نے جواب دیا۔ ”ردی! میں ناٹک کا اداکار نہیں، سپاہی ہوں۔“

ردی نے کہا۔ ”تب میں تم سے ایک درخواست کروں گی۔“

واگیہ اس کی صورت دیکھنے لگا۔

ردی لمحے بھر کے سکوت کے بعد بولی۔ ”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں واگیہ!“

”میرے ساتھ؟! تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟ آخر کیوں؟“ ”ذاتی حیرت اندہ نہ گیا۔“

”ہاں میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں لیکن ایک یقین دہانی پر، ایک شرط پر۔“

ی غیر یقینی انداز میں واگیہ کی صورت دیکھ رہی تھی۔

ردی کا چچا بھی حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

واگیہ نے نرمی سے پوچھا۔ ”لیکن تم میرے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہو؟“

ردی نے جواب دیا۔ ”اپنے رشتے داروں میں رہنے سے پامریا مانتا ہے، میں اسے

نا جانا چاہتی ہوں!“

واگیہ کو کچھ امید بندھی، اہستہ سے بولا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں جب سے چاہو

مے ساتھ رہنا شروع کر دو۔“

ردی کے چچا نے ناگواری سے کہا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم صوبہ کے ہوتے ہوئے

یہاں مسٹر واگیہ کے پاس رہو؟“

ردی نے جواب دیا۔ ”یہ اس طرح ممکن ہے کہ یہاں میں رہنا چاہتی ہوں!“

واگیہ نے خوشی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ”میں دقت سے پہلے ہی تمہیں خوش آمدید کہنے

تیار ہوں!“

ردی نے کہا۔ ”لیکن پہلے مجھے یہ یقین دلادو کہ تم مجھے اسی طرح رکھو گے جس طرح

دن پہلے بھی مجھے رکھ چکے ہو۔“

”وعدہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں روزی!“ واگیہ کہنے لگا۔ ”تم یقین رکھو کہ کوئی بھی وہ کام جس کا تمہاری ذات سے کسی بھی قسم کا تعلق ہو گا تمہاری مرضی کے خلاف یا غماہش کے بغیر نہ ہو گا!“

”مجھے تم پر اطمینان ہے!“ روزی نے جواب دیا۔

روزی کا چچا باریادہ پہلو بدل رہا تھا۔

روزی نے واگیہ سے کہا: ”کیا تھوڑا سا پانی بلاؤ گے؟“

واگیہ اندر جاتا ہوا بولا: ”تھوڑا کیا بہت ہیو۔ انوس کہ میں شراب نہیں پیش کر سکتا

کیونکہ مملکتِ خدا دلو کی حدود میں شراب قائلو نامنوع ہے!“

روزی نے تلخی سے ہنس کر کہا: ”اسی لئے تو پانی مانگ رہی ہوں!“

واگیہ بولا: ”ابھی آیا چند منٹ میں!“ وہ اندر چلا گیا۔

روزی جلدی جلدی چچا کو سمجھاتی ہوئی بولی: ”میرے یہاں بہنے کے فیصلے سے آپ

خدا بھی پریشان نہ ہوں، یہاں بہنے میں ایک مصلحت ہے میرے خیال کے مطابق اگر پامراہتی

کہیں قدر میں نہیں ہے تو پامراہ کے بارے میں جو کچھ بھی واگیہ کو معلوم ہو گا ایک سنا ایک دوسرے

انگواروں کی بس تہی ایک دھڑ ہے یہاں بہنے کی!“

چچا نے بالہ می سے سر ہلا دیا۔ ”روزی۔ تم ایک لڑھے کے عہد پر کب تک یقین کرو گی؟

”اس طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیں!“ روزی اتنا کہہ کر چپ ہو رہی کیونکہ سامنے

سے واگیہ آ رہا تھا پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں تھا کٹوے ٹالیکن اس سے خدا بڑا۔

روزی نے پانی پیا اور اچھے کو کھڑی ہو گئی، بولی: ”واگیہ جی! میں اپنا سامان لے کر

آ رہی ہوں، اسی وقت!“

واگیہ نے خوشی کو دباتے ہوئے کہا: ”روزی! میں تمہارا انتظار کروں گا۔ کیا ایسا ممکن

نہیں ہے کہ تم اپنا سامان لے کر آج ہی یہاں آ جاؤ؟“

”کوئی شش کروں گی!“ یہ کہتے ہوئے روزی نے چچا کا ہاتھ پکڑا اور سیٹھک لے

باہر آ گئی۔

رات کی تاریکی میں ایک دو گھوڑوں والی گاڑی واگیہ کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو

گئی۔ واگیہ روزی کا بے جیتی سے انتظار کر رہا تھا، گاڑی کے دکنے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر

گیا اور روزی کے استقبالی کو آگے بڑھا۔

یہاں گاڑی میں سے ایک گھٹے جسم کا ہندو اتر ادا اور اس نے اترتے ہی ایک دوسرے بھاری  
 بھر کم شخص کو اترنے میں مدد دی۔ اجنبی ہندو دے پوچھا۔ ”کیا واگبے ہیں؟“  
 ”ہاں!“ واگبے نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ ”یہ ہی دھونڈی واگبے ہوں!“  
 بھاری بھر کم شخص بولا۔ ”تم یہیں اندر لے چلو۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں!“  
 اس نے یہ آواز کہیں اندر بھی سنی تھی، وہ ان دونوں کو اندر پیشہ گدس لئے چلا گیا۔  
 وہاں ایک حداد پر موقوف موم بتی جل رہی تھی، واگبے نے اس بھاری بھر کم شخص کو خود ہی پہچان لیا  
 ”یوں جی آپ! رہے نصیب جو خود نیا جی ہمارے گھر تشریف لائے!“  
 ”چپ وہ!“ خود نیا نے شفقت سے ڈالنا۔ ”پہلے یہ بتا کہ اس گھر میں تیرے سوا اور کون  
 کون رہتا ہے؟“

واگبے نے جواب دیا۔ ”یہاں میں تنہا رہتا ہوں۔ کیونکہ کیا کوئی خاص بات ہے؟“  
 ”ہاں ہمیں تجھ سے کچھ خاص باتیں کرنا ہیں۔“  
 ”تو کیجئے۔“ واگبے نے اجازت دے دی۔  
 خود نیا نے اپنے آؤسی کو حکم دیا۔ ”جاؤ، باہر جا کر کھڑے رہو، اور اس بات کی نگرانی  
 کوئے رہو کہ وہاں کوئی ایسا دیسا آدمی تو نہیں آ رہا!“  
 خود نیا کا آدمی باہر چلا گیا۔ تب خود نیا نے راز داری سے اپنی زبان کھولی۔ ”کیوں شری  
 دھونڈی واگبے! کیا میں چند ذاتی نوعیت کی باتیں تم سے کر سکتا ہوں؟“  
 ”تمہاریت شوق سے!“ واگبے نے کہا۔  
 خود نیا، کم سے کم نرم لہجے میں بولا۔ ”حق تو اپنے آقاؤں کا انتخاب اس طرح کرتا  
 ہے؟ مجھے بھی تو بتا دے!“  
 واگبے اس کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ بولا۔ ”خود نیا جی جو کہنا ہے اساق صاف  
 جانتے ہیں زیادہ وقت برباد کرنے سے ڈانڈہ!“  
 خود نیا نے کہا۔ ”یہ تحریر جی ہے کہ تم اسلام قبول کرنے والے ہو؟“

”یہاں یہ غیر درست ہے!“  
 خود نیا کے چہرے پر شکیں بڑھ گئیں، بولا۔ ”تو ہندو قوم کا دھرم ہے اگر تو کہے گا تو ہم  
 تجھے میسور کے اصل راجا کے دربار میں کوئی منصب ملا دیں گے!“  
 واگبے اس کا مطلب نہ سمجھنے کے انداز میں بولا۔ ”میسور کا اصل راجا کہاں ہے؟“  
 خود نیا نے جواب دیا۔ ”مجھے جب کبھی غریب معلوم ہو جاتے گا، یہ بات اپنے

تک رکھنا کہ مملکت خدا داد عنقریب ہر دست سے نیست میں جانے والی ہے۔  
 داگیہ نے حیرت سے سوال کیا۔ ”وہ کس طرح پورنیا جی؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟“  
 پورنیا نے کہا۔ ”میسور پر پہلے ہندوؤں کا راج تھا لیکن بعد میں اس پر سلطان کے  
 باپ حیدر علی نے زبردستی قبضہ کر لیا اب حیدر علی کے بعد سلطان حکومت کر رہا ہے لیکن  
 میرے اندر بیٹھا کوئی کہہ رہا ہے کہ یہ حکومت پھر اپنا اصل حکمرانوں کے ہاتھ میں جانے والی ہے  
 اور ہم محب ہندو مملکت کی بڑی طاقتوں سے مل کر قابضوں کو ہٹانے کی کوششوں میں مصروف  
 ہیں۔“

داگیہ کا تیرہ دن پورنیا کی بات کا مطلب سمجھ گیا، بولا۔ ”تو تم سلطان کا نمک کھا کر  
 اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہو؟ تھوہے تم پر پورنیا جی! تم غدار ہو!“  
 پورنیا نے جواب دیا۔ ”شری داگیہ جی! میں پہلے ہندو ہوں اس کے بعد کچھ اور اور  
 تمہیں بھی یہی ہونا چاہیے، میں نے جیسے یہ سلسلے کہ تم ہندو دھرم چھوڑ کر سلطان کی خاطر  
 مسلمان ہونے والے ہو، پریشان ہو گیا ہوں، خیر دار تو تم نے ہندو دھرم چھوڑا!“  
 داگیہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنی مرضی کا نمک ہوں پورنیا جی! آپ ناحق پریشان  
 ہوتے ہیں!“

پورنیا نے اپنے حیدر سے ہاتھ کی اتھیلی داگیہ کے سامنے کر دی، بولا۔ ”داگیہ جی!  
 اس ہاتھ پر اپنا سپردھا ہاتھ رکھ کر تم مجھ سے یہ عہد کر دو کہ تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک  
 ہندو ہی رہو گے۔“

داگیہ نے جواب دیا۔ ”میں ایسا کوئی عہد نہیں کروں گا جس پر میرا دل آمادہ نہیں کرتا  
 پورنیا نے کہا۔ ”اچھا، میں چلتا ہوں لیکن میری یہ بات نہ بھولنا کہ اب تم دربار میں  
 برگزند بنانا اگر غلطی سے تم وہاں چلے بھی گئے تو جلتے ہو اس کا کیا انجام ہوگا؟“  
 ”نہیں جانا؟“ داگیہ بولا۔ ”کچھ تمہی ہمدی رہنمائی کر دو کہ آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“  
 پورنیا بولا۔ ”سلطان تمہیں جبراً مسلمان بنانے کی فکر میں ہے تم جس دن بھی وہاں  
 گئے سلطان کے متعین آدمی تمہیں زبردستی مسلمان کر لیں گے!“

”جھوٹ؟“ داگیہ بولا۔ ”بھلا یہ کس طرح ممکن ہے؟“  
 پورنیا بولا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی سچائی کا تجھے بہت جلد ثبوت ملے  
 جلتے گا!“

داگیہ نے جواب دیا۔ ”مجھے تو کچھ دیکھ بغیر ہی اللہ پر بھروسہ ہے!“

پورنیا عاجز آکر یہ کہتا ہوا چلا گیا۔ ”ہمیں اپنے ساتھیوں کو سخت مزاحمت دیوانا کیب  
پسند ہے پھر اس کے لئے تو.....“ بات ناسکھ رہ گئی اور دالیک اس عجیب و غریب غلام انسان  
کی بابت سوچتا ہی رہ گیا۔

روز ہی اپنا قیمتی سامان لے کر دالیک کے گھر پہنچ گئی دالیک نے اسے ایک ہال کمرہ اس  
لئے دے دیا کہ وہ اس میں اپنا زیادہ سے زیادہ سامان رکھ کر اطمینان سے رہ سکے۔  
ان دنوں سلطنت غدارانہ آتش فشاں کے دہانے پر اپنی زندگی کی آخری سانسیں  
لے رہی تھی، تقریباً اڑتیس سال قبل ۱۷۱۱ء میں نواب حیدر علی نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا  
تھا۔ یہاں پہلے ایک بندہ رہا تھا اور اسی راجا کے تصرف و اقتدار میں صرف تیس گارڈ تھے۔  
جس کے مجموعہ کو ریاست میسور کہا جاتا تھا۔ لیکن جب یہ ریاست، سلطنت خداداد میں کمر  
ابھری تو اس کی حدود ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت اختیار کر گئیں جس کا اپنا ایک نظام  
تھا۔ اپنی ایک طاقتور فوج تھی، اپنی ایک آزاد خارجہ پالیسی تھی، ان دنوں امریکہ اپنے انگریز  
آقاؤں کے خلاف جنگ آزادی میں مشغول تھا۔ خارجہ دانشنگش نے اپنے ملک سے انگلستانی  
اقتدار کو نکال باہر کیا اور کارلوس امریکہ کی تمام حکومت وہاں کی تیرہ مہیا سٹوں کے حوالے کر کے  
احساس شکست خوردگی اور تلامت لئے جب وطن واپس گیا تو انگلستان کی وزارت عظمیٰ پوری دنیا  
کا نقشہ پھیل کر بیٹھ گئی اور ان خطوں کی جستجو کوئے لگی جن کو اپنی نر آبادیات میں لاکھ لاکھ کا نعم  
البدن فراہم کیا جاسکتا ان کی نگاہیں ہندوستان پر جم گئیں، انہوں نے کارلوس کو سیاسی گناہ  
کے کفارے کے لئے ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا یہ ہندوستان آیا اور تھوڑی سی مدت میں  
سازش اور سیاست کے وہ بیج بوی گیا کہ جب یہ پودے بڑھے ہو کر پھلے پھولے تو ہندوستان کی  
چھوٹی چھوٹی ریاستیں نفاق و نا اتفاقی کا شکار ہو گئیں، اودھ، بنگال، اڑیسہ، گوالیار، حیدر آباد،  
ارکات اور پیشوائے پونا بھی اس کے زیر دام آچکے تھے لیکن ان میں تنہا ٹیپو کی نظری ہندوستان  
کے مستقبل پر رہی ہوئی تھیں، خواہ وہ لوں، غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہندوستان۔

کہتے ہیں کہ انسانی آنکھ کی پتلی کے پیچھے ایک لچکدار محبت عدسہ ہوتا ہے خدا نے  
یہ عدسہ شیشے کے بجائے ایک مخصوص قسم کی جھلی میں بھری ہوئی شفاف رطوبت سے بنایا ہے  
جو لوگوں کی آنکھ کا یہ عدسہ ضرورت سے کم محبت ہوتا ہے وہ دور کی چیزیں تو ساف دیکھ سکتے  
ہیں مگر قریب کی چیزیں نہیں دیکھ سکتے۔ سلطان ٹیپو کو جس نوع کی سیاسی اور ملکی نظم و نسق کے  
بصیرت عطا ہوئی تھی اس میں اسے دور دراز کی چیزیں تو ساف نظر آتھیں لیکن جو کچھ ملک

کے اندر یا اس کے آس پاس ہو رہا تھا وہ اس کی سیاسی بصیرت سے اوجھل تھا۔ اس کی سیاسی بصیرت نے یہ تو دیکھ لیا کہ یورپ میں انگلستان اور فرانس آپس میں برسرِ پیکار ہیں اور فرانس نے تعلقات استوار کر کے انگریزوں کو ڈک پہنچائی جا سکتی ہے لیکن اندرون ملک جو سازشیں ہو رہی تھیں انہیں نہ دیکھ سکا۔ اس کی سیاسی بصیرت اسے یہ تو دکھا رہی تھی کہ ترکی 'افغانستان' ایران اور بعض دوسری مسلم حکومت قائم کی جا سکتی ہے لیکن اسے برصاوتِ قدیرا عظیم مملکتِ خداداد، میر قمر الدین سپہ سالار اور میر غلام علی شاہ امیر البحر اور اسپیکرِ جنرل قلعہ جات کی حادِ شین اور خدادادیاں نہیں نظر آ رہی تھیں، وہ میر میرزا پوریا کو نہیں پہچان سکا تھا جو میسور کی سابقہ رانی اور ہندو ریاست کی بحالی کی سرگرم کوششوں میں مشغول تھا۔

انگریزوں نے سلطنتِ خداداد کے خلاف حیدر آباد، انکاٹ اور مرہٹوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔ کارنٹاں اپنے حصے کا کام ختم کر کے انگلستان واپس چلا گیا۔ اس کے بعد سر جان شور آیا اور پانچ سال کے عرصے میں اس نے شمالی ہند کی حکومت اور ہند کو سیاسی حیثیت سے مغلوں کے رکھ دیا۔ اسی دورانِ بتکال کے انگریز نوچی افسروں نے بغاوت کی اور وہاں کی حکومت پر قبضہ کر لینا چاہا۔ سر جان شور نے سختی کے بجائے نرم رویہ اختیار کیا اور یاغیوں کی جہت میں ٹھٹھکا کر انہیں، اسی دورانِ سلطانِ شیو یورپ کے فرانسیسی فاتحِ پولین سے انگلستان کے خلاف تعلقات استوار کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ انگلستان کے حکمران ان حالات میں سر جان شور جیسے مصلحت اندیش اور نرم سیاستدان کو کس طرح برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے سر جان شور کو انگلستان واپس بلا لیا اور اس کی جگہ لارڈ ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنادیا گیا۔ لارڈ ولزلی کی فرانسیسی بیوی تھے ہندوستان جہان سے انکاٹ اور شہر سے علیحدگی اختیار کر لی اور اس کا آخری ہوا کہ زخمِ خوردہ ولزلی فرانس اور اس کے دوستوں سے سخت نفرت ہو گئی۔

جب وہ جنوبی افریقہ کے راستے ہندوستان آ رہا تھا تو اس امید میں اس کی انگریز جنرلوں سے ملاقاتیں ہوتیں جو میپو کی انواح سے کسی جگہ شکستیں اٹھا چکے تھے، یہیں اس کی حیدر آباد کے انگریز رینڈرڈ ٹھٹھکا کرک پھاڑ کر دے بھی ملاقات ہوئی، جس نے ولزلی کو یہ شکست کی بات بتائی کہ جب تک ہندوستان میں فرانسیسی موجود ہیں، انگریز ناکام رہیں گے۔ یہیں اس نے سر جان شور کے وہ خطوط دیکھے جن میں اس نے اپنے انگلستانی آقاؤں کو دکھا تھا۔ انہوں نے کہ میں شیو کی پڑھتی ہوئی طاقت کو نہیں روک سکا۔

ہندوستان پہنچے پہنچے ولزلی، یہاں کی ساری تفصیلات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ سلطان نے فرانسیسی حکومت کو ماریشس میں سفارت بھیج کر جو عہد و پیمان



لے تھے، پورنیل نے اس کی ایک نقل لے کر گورنر جنرل ولزلی کو بھیجوا دی، دوسری طرف میر غلام علی  
 لڑاکے ذریعے سلطان ترکی سے جو خط و کتابت ہوئی تھی اس کی نقلیں بھی انگریزوں کو پہنچ چکی  
 تھیں، لارڈ ولزلی کی آمد کی اطلاع سلطان کو بھی ہو چکی تھی۔ وہ انگریزی حدود میں ہونے والے  
 بددیول کو تشویش سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار اپنے امراء پر بھی کیا۔ میر  
 صادق نے سلطان کی تشویش کو ہنسی میں اڑا دیا۔ لولا "اللہ پاک کی قسم حضور دالاء فرنگی  
 کئی ہزار میل کا سفر کر کے یہ ہزار پریشانی دخیل ہی ہندوستان تک پہنچتے ہیں، یہ بھکی باری قوم  
 حضور دالاء کی بہادر افواج کا کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے بھلا، آپ بے فکر رہیں آپ کے غلام ہیں  
 وہ مزہ چکھائیں گے کہ بھاگ کر اپنے وطن ہی میں دم لیں گے جا کر!"

سلطان نے کہا: "اگر یہ قوم بہادر ہوتی تو ہم ہرگز فکر مند نہ ہوتے، یہ ایک عسکر قوم  
 ہے جو میدان جنگ کے سواتے سارشی تلے نصیر کر کے عیاری اور مکاری کے ہتھیاروں سے لڑتا ہے  
 "یہ اور بھی اچھا ہے! میر صادق نے جواب دیا: "قسم کلام پاک کی حضور دالاء کا بھکی  
 ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی، ان کی سازش اور سیاست بار بار تو کامیاب ہونے سے رہی، جب ان  
 کا یہ طرز ہمارے پیچھے کے کو معلوم ہو جاتے گا تو گویا ان کا یہ حربہ بالکل بے کار ہو جائے گا اور  
 اس دقت کو کیا کریں گے؟"

سلطان نے میر غلام علی نگار بھی مانگیں پھیلانے آداب سلطانی کا خیال کرتے بغیر بڑھا تھا۔  
 سلطان اس سے مخاطب ہوا: "پرچھاؤ کیوں میر صاحب! تمہارا کیا خیال ہے کیا ہم انگریزوں کو ان  
 کے ناپاک منصوبوں میں ناکام چا دیں گے؟"

غلام علی نے جواب دیا: "حضور دالاء، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب انگریز ناپسند  
 ثبات میں آئے گا تو ممکن ہے اسے خوشامد چاہا پلوسی میں شمار کیا جائے اور اگر غنی میں دے گا  
 تو یہ مدد ملے گی ہوگی۔ اس لئے سنا سب یہی ہے کہ میر صادق نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تائید  
 کر دی جاتے!"

پورنیل نے کچھ کہنے کے لئے مراٹھا کیا۔ سلطان نے اسے بھی بولنے کی اجازت دی کہا  
 "پورنیل! کیا تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں خداوند! پورنیل آداب سے گویا ہوا: "اس تلخ مزہ کی تو یہ بات ہے کہ خداوند  
 انگریزوں سے خواہ مخواہ خائف ہیں، یہ جو نظام دکن ادائی آرکٹ اور پیشوائے پونا اندا انگریزوں  
 میں اتحاد اور یگانگت کی غمیری گرم ہو رہی ہیں، سب انوا ہیں، معلوم نہیں یہ انوا ہیں کون  
 چھوڑنا ہے اس غلام کا تو یہ خیال ہے کہ فرنگی خور یہ انوا ہیں پھیلا ہے ہیں تاکہ حضور دالاء ان سے

خونخروہ ہو جائیں اور اپنے چڑوسوں کی دشمنی مول لے لیں !

سلطان نے جواب دیا : ”خدا کرے تم جو کہہ رہے ہو وہی درست ہو لیکن ہمیں اس کی طرف سے فائل نہیں رہنا چاہیے“ پھر وہ میر قمر الدین سپہ سالار سلطنتِ خدا داد کی طرف رجوع ہوا اسے حکم دیا : ”قمر الدین ! زوجوں کو ہر وقت تیار رکھو معلوم نہیں کس وقت نفاق جنگ بچ سکتے !“

آزموہ کا قمر الدین نے جواب دیا : ”حضور بالکل بے فکر ہیں“ اب جو جنگ ہوگی وہ ہماری آخری جنگ ہوگی !“

میر صادق نے آہستہ سے نیاز مندانہ عرض کیا : ”حضور والا ! واگاہ کا کیا بتاؤ“ سلطان نے حکم دیا : ”اسے کل مابعدِ ملت کے بعد مردِ جاغری کا حکم دیا جائے !“ میر صادق نے نیاز مندی سے کہا : ”بہت تمہیں حضور والا ادا اس غلام کی مرلت میں“ کلا ہی اسے نعمتِ اسلام سے بھی نوازا دیا جائے۔ قرآن پاک کی قسم بڑا نیک کام ہو گا۔ پھر نیاز نے ناگواری سے منہ بنایا لیکن میر صادق کے علاوہ کوئی اور اسے محسوس نہ کر سکا۔

روزی، بیکار واگاہ کے پاس بیٹھتی گھنٹوں بائیں کمری رہتی۔ وہ فرانس کے شمالی صوبے نار منڈری کے دون نامی شہر سے تعلق رکھتی تھی جہاں جون آف آرک کے جادوگر قرار دے کر زندہ چلا دینے کے ایک عرصے بعد ولی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے وطن میں سپوں سے بڑا پیار کیا جاتا تھا۔ وہ وہاں کی ہر شے کا نہایت عقیدت اور محبت سے ذکر کرتی، وہ دہریاتے میں کی پر لطف درانی کا ذکر اس طرح کرتی جیسے وہ کسی بہشتی دنیا کا ذکر کر رہی ہو جب اسے چاہیچہن یا دکانی دودھ پھوٹ پھوٹ کر روٹنے لگتی کہو کہ اس تصویر میں اس کے ساتھ پامر موجود ہو یا جو معلوم نہیں کہاں لاپتہ ہو گیا تھا۔

روزی اپنے پامر کی کچھ یادگاریں سلنے رکھ کر اس کا دالہانہ ذکر کر رہی تھی اس نے ایک نازکی رنگ کے دالہ کو اٹھا کر پیشانی سے لگا لیا۔ بولی : ”جب پامر کے سر میں دودھ اٹھاتا تھا تو وہ ہمیشہ اسے اپنی پیشانی کے گرد پیٹ لیا کرتا تھا“

واگاہ نے سنی ان سنی کے انداز میں روزی کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ روزی نے ایک چوٹے کناروں والا ہیٹ اٹھایا۔ بولی : ”وہ یہاں کی دھوپ سے بہت پریشان ہو جاتا تھا، جب باہر نکلتا تو اسے سرد ہونے لگتا تھا“

”داگیہ نے بے توجہی سے کہا۔ ”اب انا باتوں سے فائدہ؟ مرے ہوئے انسان کو بلا کرنے سے فائدہ!“

مددزی اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگی، بولی۔ ”داگیہ! تم مجھ سے کچھ چھپاتے ہو، معلوم نہیں کیوں، تم مجھ سے پامر کی بابت جو کچھ کہتے ہو اس پر مجھے یقین نہیں آتا!“  
 ”یہ اس لئے کہ تم پامر کی محبت میں پاگل ہو گئی ہو، ایک معمولی نا تجربے کار نوجوان سے اتنی محبت! حماقت نہیں تو ادا کیا ہے!“

مددزی نے پس منہ سے غیر متوقع سوال کیا۔ ”اگر میں تم سے یہ وعدہ کر لوں کہ اپنے دل سے پامر کا خیال نکال کر تمہارے دل میں بسالوں گی تو کیا تم میری چند باتیں مان لو گے؟“  
 داگیہ نے غیر یقینی انداز میں مددزی کو دیکھا اور کہنے لگا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ تم پامر کی جگہ مجھے کس طرح دے دو گی!“

”لیکن تم میری بات کا یقین کر لو!“ مددزی کہنے لگی۔ ”میں ہندوستان چھوڑ دینا چاہتی ہوں مجھے یہاں کچھا چھا کہیں لگتا۔ کیا تم میرے ساتھ فرانس چلو گے، وہاں ہم دونوں دریاے سین کے کنارے اپنی زندگیاں گزار دیں گے!“  
 ”نہ ناممکن!“ داگیہ نے جواب دیا۔ ”میں اپنے وطن کرڈ شمعوں کے حوالے کر کے کس طرح

جاسکتا ہوں!“

مددزی نے کہا۔ ”تم اپنے وطن کو انگریزوں سے کس طرح بچا لو گے؟“  
 داگیہ نے جواب دیا۔ ”کل کا حال کسے معلوم ہے، میں تو کبیں ایک بات جانتا ہوں وہ یہ کہ اگر میں بد قسمتی سے انگریزوں ادا مان کے حلیفوں کو شکست نہ دے سکا تو انہیں تنگ حریف کر تار ہوں گا۔ میرے پاس نہ تو خطہ نہ زمین ہے نہ کوئی قلعہ، میں شب و روز اپنے ساتھیوں کے ساتھ وطن دشمنوں پر تاخت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ ایک دن شاید میں خود بھی اپنے وطن پر قربان ہو جاؤں۔“

مددزی حیرت سے اس سر پر ہرے جیالے کی باتیں سنتی رہی، بولی۔ ”داگیہ! تم اپنے کمدار اور باتوں سے میرے دل میں گھر کرتے جا رہے ہو اگر تم جاؤ تو میں تمہاری خاطر اسی ملک میں رہ سکتی ہوں لیکن میں اس زندگی جتنے میں نہیں رہنا چاہتی تم مجھے شمالی ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں لے چلو، ہمالیائی بستیوں میں، میں اپنی یقینہ زندگی گم نامی میں گزار دینا چاہتی ہوں!“

”مددزی! میرے سامنے ایک عظیم الشان مقصد ہے، اس مقصد کو نظر انداز کر کے

تہیں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں!!

”تب پھر تم ایسا کمروا گئیے کہ مجھے کسی طرح پام سے ملا دو، میں اس سے کہہ دوں گی کہ اب میں تم جیسے معمولی انسان سے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ مجھے واگہ جیسا ہمارا دروازہ کمروا مل گیا ہے، میں پام کے عہد دیوان اسے واپس کر دینا چاہتی ہوں!“

واگہ نے مددی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، بولا: ”میں سمجھا تھا ارم طلب! خوب!“ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ واگہ پام نکلا تو پتہ چلا ”قبلہ سے الم سلطان ٹیپو سے یاد فرما رہے ہیں!“

واگہ اندر گیا اور مددی سے بولا: ”مجھے سلطان نے یاد کیا ہے اب شاید میں کچھ کارآمد ہو جاؤں، اگر موقع ملا تو پام کی بابت کچھ اور باتیں ہو جائیں گی!“ اس کے بعد واگہ جلنے کی تیاری کرنے لگا۔ مددی اسے بے چینی سے دیکھتی رہی جب کہانی رنگ پر آئی تو داستان کو محفل سے اٹھ گیا۔

واگہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا جب شاہی ڈیوڑھی پر مینچا تو اچانک اس پر کسی لٹکا ٹوٹ پڑے، یہ جب بھاری پھر کم اور تن و توش کے لوگ تھے انہوں نے واگہ کو قلابوں کے زنجیر سے عکڑھایا۔ شاہی جراح ان کے ہمراہ تھا یہ واگہ کو لے کر شاہی ڈیوڑھی کے ایک بندر حصے میں چلے گئے وہاں شاہی جراح اپنا ستر لے کر بے بس واگہ کی طرف بڑھا۔

واگہ نے حیرت سے پوچھا: ”کیا تم لوگ مجھے ہلاک کر دینا چاہتے ہو؟“ ”نہیں!“ شاہی جراح نے جواب دیا: ”مجھے دندیر اعظم میر صادق نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہاری اسلام پسندی کے پیش نظر سنت کر کے مسلمان بنالوں، میرا خیال ہے میرا یہ فعل تمہیں گناہ نہیں گنرے گا۔“

یہ بے بس واگہ نے آنکھیں بند کر لیں، پوچھا: ”کیا اس میں سلطان کی مرضی بھی شامل ہے؟“ ”ہاں!“ شاہی جراح نے جواب دیا: ”سلطان نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں میر صادق کے حکم کی تعمیل کروں!“

واگہ نے آہستہ سے کہا: ”تم سلطان کا حکم پورا کرو!“ اور خدا پر بیعت کر لیا، واگہ نے دھونڈی واگہ کے بچنے والے شیخ احمد ہو جکا تھا۔ سنت کے بعد ایک عالم دین نے اس سے کلمہ پڑھوایا اور اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا۔ واگہ نے عالم دین سے کہا: ”حضرت! آپ سلطان سے اس غلام کا سلام عرض کر دیں

میں کہ مجھے اپنا اسلامی نام شیخ احمد پسند تو ہے لیکن میں چاہتا ہوں مجھے ملک جہاں خان کے  
اب سے بھی سرفراز کیا جائے!“

تھوڑی دیر بعد سلطان نے اسے اس کا پسندیدہ خطاب بھی عطا فرمادیا۔  
چند دنوں بعد جب ملک جہاں خان کی سالٹ سنبھلی تو سلطان کی طرف سے ایک عالم  
پاپا بندی سے حاضر ہونے لگا اور ملک جہاں خان کو اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے لگا۔  
روزی کو بھی اس واقعے کا علم ہو گیا وہ کانپ گئی اور اس نے ملک جہاں خان سے پوچھا  
کیہ می ایکیا تم اب بھی سلطان کے وفادار ہو؟“

ملک جہاں خان نے جواب دیا: ”براہ کرم تم مجھے انب داگیر جی نہ کہو۔ اب میں مسلمان ہو  
ہوں اور میرا اسلامی نام ملک جہاں خان ہے!“

دعویٰ کرنے پوچھا: ”کیا تم مسلمان ہو جانے پر خوش ہو؟“  
”بالکل خوش ہوں، میں ہمیشہ سے اسلام کو پسند کرتا ہوں ایسے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے  
میں سلطان سے زیادہ حیرت و حیرت کا اعتراف کرتا ہوں اور میں اسے کسی طرح بھی کامیاب نہ ہونے  
کا گواہ“

جب وہ بالکل اچھا ہو گیا اور تعلیمات اسلامی سے بھی بہرہ ور ہو گیا تو سلطان کو اس  
بڑا دم آیا اس نے میر صادق کو حکم دیا: ”میر صاحب! ملک جہاں خان ہر طرح یہ ثابت کر چکا ہے  
وہ ہملا فداوار ہے، اب ہمیں اسے کسی قلعے کی سرکاری موٹپ دینی چاہیے تم اسے کل ہی کسی  
لئے پروردگار کو رو!“

میر صادق نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے بولا: ”قبلہ راجہ اگر آپ اسے کوئی  
نئے داری دے رہے ہیں تو بشوق دیں لیکن اگر اس غلام کی مدت معلوم کریں گے تو اللہ پاک کی قسم  
یہ تاج پرتہ ہی کہے گا کہ اس جیسے راہزن کو کوئی خدمت داری کا منصب عطا فرمانا سخت غلطی ہو گی وہ  
ایک ڈاکو ہے جو اپنے چند دبا شوں کے ساتھ حیدر آباد، پونا اور خود حضور والا کے قدامتوں پر  
چھاپے مار کر گزرتا دہا ہے ایسے داعی اور تابلو اعتبار شخص کو مطلق العنان بنادینا حصار  
ملک کے خلاف ہے کیونکہ اس کا اندیشہ ہے کہ آگے چل کر وہ ایسا قوتہ برپا کرے گا کہ اس کا انداز  
دشوار ہو جائے گا!“

میر صادق کی باتیں اثر کر گئیں اور سلطان نے ملک جہاں خان کو کوئی منصب بھی نہ دیا۔  
ملک جہاں خان جب بالکل مایوس ہو گیا تو اس نے ایک دن سلطان سے درخواست  
کی کہ اسے سلطان کے برسرے بیٹے فتح حیدر سلطان کی ملازمت میں چلا جانے دیا جائے پھر جب

سلطان کو ضرورت ہوگی ملک جہاں خان آجاتے گا؟

سلطان نے اس بات کی اجازت دے دی۔

ملک جہاں خان نے دوزی سے کہا: "دوزی! میں سرنگاپٹم کے باہر شہزادے فر حیدر کی ملازمت میں جا رہا ہوں، ظاہر ہے تم میرے ساتھ نہیں چل سکو گی، بولو، کہاں پسند کرو گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی!" دوزی نے جواب دیا۔ "شہزادے کی نوا میں؟" فرانسسی موجود ہیں، ان دنوں میرے چچا بھی وہیں گئے ہوتے ہیں!"

دوزی ملک جہاں خان کے ساتھ سرنگاپٹم کے باہر کمری گڑھ کے یہاڑی علاقے چلی گئی۔

سلطان نے فرانس کے لئے ہوسفارت مارشس بھیجی تھی حالیں اسچکی تھی اس دو ہفتے پہلے دوزی نے سلطان کو لکھا تھا۔

"آپ یہ خبر سن کر خوشی محسوس کریں گے کہ یورپ میں انگلستان نے فرانس کو شکست دے دی ہے!"

سلطان کو خوب معلوم تھا کہ یہ خبریں اسے جلانے کے لئے بھیجی جا رہی ہیں۔

سلطان کو ۱۸ نومبر ۱۷۹۸ء کو ایک خط اور حصول ہوا۔ لارڈ دوزی نے لکھا: "یہ ناممکن ہے کہ آپ یہ سمجھ رہے ہوں مجھے اس خبر کی اطلاع نہیں ہے کہ آپ کتنی دشمن فرانس سے کس قسم کی خطر دکانا بت کر رہے ہیں۔ معاملے کی تحقیق کے لئے میرے طور پر جا رہا ہے اور اسے یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کپٹی کے تحفظ کے لئے سلطان سے جو علاقہ چاہے طلب کر لے۔"

سلطان، دوزی کے مقصد سے آگاہ ہو گیا اور اس نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ سلطان فرانس سے کہہ رہا تھا کہ انگریزی فوجوں سے نبرد آزما ہو گیا۔ وہیں اس نے یہ تشویشناک خبر سنی کہ انگریزی افواج سرنگاپٹم کی طرف بڑھ رہی ہیں، سلطان اپنی افواج کے ساتھ سرنگاپٹم آ گیا۔

فرمیرالڈرین جیسے انگریزوں کی سرکوبی کے لئے ایک دوسرے محاذ پر متعین کیا گیا تھا وہ انگریزی فوج کے پیچھے پیچھے جنگ کئے بغیر اس طرح آیا گویا وہ انگریزی فوج کا بار بار حملہ

حفظ ہو۔

انگریزی فوجیں کس مدافعت یہ انکاؤٹ کے بغیر سرنگاپٹم کے چاروں طرف پھیل

کے ساتھ، ان کے حلیف بھی تھے، سلطان کے ایک منصب دار میر قاسم علی نے انگریزوں کے قلعے کے جنوب مغربی گوشے کے اس حصے میں رہنمائی کی جو قلعے کا صوبہ سے مکڑیوں پر بڑی لوجھیں قلعے کے گرد موبچے مضبوط کر کے گولہ باری کرنے لگیں، اب سلطان محصور ہوا اور اس بات پر حیران تھا کہ اس کے جرنیل توڑ مار فوجت کیوں نہیں کر رہے اس موقع پر مسلم ملک جہاں خان یا دایا جو اس سے دل برداشتہ ہو کر اس کے بڑے بیٹے فتح حیدر (میری گٹھ کے پہاڑی علاقے میں علا گیا تھا اس نازک موقع پر سلطان نے فرانسیسیوں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ چاہا۔ فرانسیسی جرنیل موسیو سپیو کو مخاطب کرتے ہوتے

نے کہا۔  
 ”میرے غیر ملکی دوستو! تم دیکھ رہے ہو کہ ہم اس دلت جن حالات سے رد جا رہے ہیں لبنان نہیں کیا جاسکتا جنہیں ہم لب تک اپنا معتاد ریاء قرار جانتے تھے ان کی دشمنی بڑی حیرت سے دیکھ رہے ہیں، غنیم کا زور رفتہ رفتہ ساعت بساعت بڑھتا جا رہا ہے ت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

موسیو سپیو نے شدت جذبات سے جواب دیا۔ ”حضور والا! ہم نے آپ کا نمک کھایا حضور والا نے ہمیشہ ہی ہم پر بھروسہ کیا ہے ہم ہر رمت اپنا خون بہانے کو تیار ہیں، ان حالات میں ہم یہی دانتے دے سکتے ہیں کہ حضور والا جواہرات کی پیتیاں، اشرفیاں اور گوشک قیمتی سامان لے کر خواتین حرم مرا کے ساتھ، نصف رات کے بعد شمال صوبے مرا یا چتل چلے جائیں، باہر دس ہزار حمار اور پانچ ہزار پیادہ فوج جاں نشاری کو موجود ہے وہ آپ کو مرا یا چتل و رنگ تک پہنچا دے گی!“

سلطان نے پوچھا۔ ”اور سرنگا پٹم کس پر چھوڑ جائیگا؟“  
 موسیو سپیو نے جواب دیا۔ ”سرنگا پٹم اور قلعے کو فرو دی اور فرو دی کے ہم دھن سپہ سالار لالی کے سپرد فرما جائیں، ہم اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ جب تک ہم مین سے ایک بھی زندہ رہے اس کے ادا تے حتیٰ تک میں کو تھلائی نہ کرے گا۔“

موسیو سپیو اتنا کہہ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ سلطان نے کہا۔ ”ہاں ہاں، اور تم چپ ہو گئے؟“  
 ”ہاں، تو تم اند کیا کہنا چاہتے ہو؟“

موسیو سپیو نے سر جھکا دکھا تھا۔ سلطان سے نظریں ملاتے بیٹھ بولا۔ ”اگر حضور والا دی کی اس تجویز سے اختلاف ہو تو انگریزوں کو دوست بنالینے کی ایک اور تجویز بھی مذکور اس موجود ہے!“

سلطان نے کہا: ”بیان کرو!“

موسیو سیسیون نے عرض کیا: ”انگریزوں کو ہم فرانسسیوں کے ساتھ کینت و پرخاش زیادہ ہے، حضور والا ہم فرانسسیوں کو انگریزوں کے حوالے فرما دیں ہمیں یقین ہے کہ ہماری گرفتاری کے انگریز مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے!“

سلطان، موسیو سیسیون کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ نہایت دھک سے کہنے لگا: ”تم غریب الوطن، ہماری طلبی پر یہاں آئے ہو اور ہمیشہ ہمارے وفادار اور رفیق رہے ہو۔ پھر طرح ممکن ہے کہ تم جیسا شریف، ہمارے نمک حلال اور وفادار دوست دشمنوں کے حوالے کر دیا، انگریزوں کی پوری سلطنت تلف و تاراج ہو جائے تو بھی ہمیں افسوس نہ ہوگا لیکن یہ ناممکن ہے تمہیں انگریزوں کے حوالے کر دیں!“

سلطان نے اندر جا کر جوہرات، خزانہ اور نو شک خزانے کا قیمتی سامان ایک جاں ان کے لئے ہاتھیوں اور مادہ تھوں کا انتظام بھی کر لیا گیا۔ مستورات کے لئے تیز رفتاریوں اور کا انتظام بھی ہو گیا۔

اس کے بعد سلطان نے پورے تیار اور ہر صادق سے فرانسسیوں کی تجویز کا ذکر کیا اور مشورہ طلب کیا کہ ان حالات میں سلطان کو کیا کرنا چاہیئے؟  
ہر صادق نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ”اللہ پاک کی قسم حضور والا ہم نمک خوراجہ زندہ ہیں حضور والا کے پسینے پر اپنا خون بہا دیں گے۔ ہا تو فرانس کی تجویز کا مسئلہ، توہ پاک کی قسم اس قوم نے کس سے وفا کی ہے جو آپ کے ساتھ کرے گی۔ یہ غلام پہلے ہی عرض ہے کہ فرانسسی اور انگریز ایک الگ نہیں ہیں، دونوں ایک ہیں“ ایک سگب زندہ ہے تو دوا برادر ششمال“

سلطان نے پورے تیار کی طرف دیکھا اس نے عرض کیا: ”حضور والا کو یہ یقین وہ چاہیئے کہ جیسے ہی حضرت نرننگا ہم کا قلعہ فرانسسیوں کے حوالے کریں گے یہ لے لے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے!“

سلطان نے کہا: ”تب پھر تم لوگ انگریزوں سے صلح کی بات کرو!“

پورے تیار نے جواب دیا: ”ہاں یہ آسان اور ممکن ہے!“

ہر صادق نے کہا: ”وہ صلح کی بات ہو یا نہ ہو لیکن حضور والا کو یہ یقین کر لینا چاہیئے انگریز قوم حضرت سے جنگ میں نہیں جیت سکتی، ہاں عیاری اور کٹاری میں البتہ لستے“  
وال پر تھوڑے حاصل ہے۔“



سلطان کا ایک وفد صلح کی درخواست لے کر انگریز جنرل ہارس کے پاس گیا اسے پہلے  
ی سے یہ خفیہ ہدایت ملی چکی تھی کہ سرنگا پٹم کے فتح ہونے تک صلح کی گفت و شنید نہ کی جائے۔ جنرل  
اِس سلطان کے مزاج سے واقف تھا۔ اس نے سلطان کے وفد کے سامنے صلح کے لئے اِس شرط پر  
کہ وہیں جہیں سلطان کسی قیمت پر بھی نہ مان سکتا تھا۔

جنرل ہارس نے کہا: "سلطان تمام فرانسسینوں کو ہر طرف کدے، تمام ساحلی علاقے ہمارے  
حولے کر دے اور غیر مشروط اطاعت کا اقرار کر دے تو صلح کی جا سکتی ہے اگر یہ تینوں شرطیں جو ہمیں  
گھنٹوں کے اندر مان لی گئیں تو صلح ہو سکتی ہے ورنہ نہیں؟"

جنرل ہارس کی شرائط صلح جب سلطان کے سامنے بیان کی گئیں تو اس نے حقارت سے  
انہیں مسترد کر دیا۔

توپوں کے چلنے کی آوازیں پورے سرنگا پٹم میں گونج رہی تھیں، مختلف سمتوں سے انگریز  
انواج کے گولے سرنگا پٹم میں تباہی مچا رہے تھے۔ اندر ملطانی انواج کے گولے فضا میں تھیں اور مٹی  
بکھیر رہے تھے کیونکہ ان گولوں میں بارود کی جگہ سن اور مٹی بھری ہوئی تھی۔

سلطان نے جواہرات، خزانے اور تو شک خزانے کے قیمتی سامان اور حرم سرا کے ساتھ جانے  
سے پہلے اپنے امراء کو فیصلے سے آگاہ کیا۔ کہا: "فرانسیسی دوستوں کی راتے مناسب بھی ہم سرا یا  
چھیل دگ دوڑا ہو رہے ہیں کیونکہ سرنگا پٹم کی جنگ میں اب کچھ نہیں بچا۔"

بدر النان نامی ایک فخر مند نے سلطان کو اس فرانسیسی تجویز پر عمل کرنے سے روکا۔ اس  
نے کہا: "قبلہ عالم! آپ یہ کیا غضب فرما رہے ہیں، حضور دالاکے جان نماؤں کو جیسے ہی یہ معلوم  
ہو گا کہ حضرت اپنی حرم اور خولنے کے ساتھ سرنگا پٹم سے بلر شریف لے گئے ہیں، ہمیں ہاتھ پھین  
گئے اور سدا شیرازہ منتشر ہو جاتے گا۔ ان حالات میں آپ کا یہ غلام، حضور دالاکے اس غیر شاہانہ  
شایانہ ہمت کے خلاف عمل کی تائید نہ کرے گا؟"

سلطان نے بدر النان کے جواب پر اپنے سامنے موجود امراء کی صورتیں دیکھیں وہ بھی  
سر جھٹکتے کھڑے تھے، اودان میں سلطان سے آنکھیں ملانے کی بھی ہمت نہ تھی۔

سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اداس آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "رضائے

مولا پر ہمہ اولیٰ!"

اور اس نے تمام بندھا ہوا سامان تو شک خانے میں رکھوا دیا۔

سر متی کی صبح دس بجے بخیر ہوئی نے حاضری دی اور سلطان کو بتایا کہ آج کا دن حضور

کے لئے بہت منحوس ہے، سلطان نے درخواست دہا کرتے کے لئے ایک ہاتھی کالے غلی جھول سمیت جس کی چھال میں کئی تیر مونی تھیں ہوتے تھے۔ فرائز میں تقسیم کر دیا۔ اسے خبر ملی تھی کہ قلعہ کی شمالی فصیل ٹوٹ چکی ہے، سلطان فصیل کے معلقے کر رہا تھا اور وہیں آہم کے سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر خاص طلب کیا اس کے اس پاس جو لہراء اور ذرا وجود تھے وہ سلطان سے نظر میں چرا ہے تھے کھانا آیا۔ سلطان نے پہلا لقمہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ کہ جنوب سے آہ ودا دیا کا شور بلند ہوا۔ سلطان نے کھاتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پوچھا: "معلوم کیا جلتے کہ یہ لوگ آہ ودا دیا کو میا ہے ہیں؟"

دا دیا کرنے والے جنوب مغربی محاذ کے سپاہی تھے۔ انہوں نے یہاں وہ ناک خبر سنائی کہ جنوب مغربی محاذ کا دقا دار جنرل سید فقار شہید ہو گیا سلطان نے ہاتھ کا لقمہ دکھ دیا اور اپنے امراء اور ذرا پر نظر ڈالی۔ یہی مصلحتیں اور بے فکر مہم جھکاتے کھڑے تھے سلطان نے انہیں شاید ملی بار ملاحظہ کی، کہا: "قدارہ ہمیں اپنی غدار کا جو صلہ ملے گا میں معلوم ہے ہندوستان غیر ملکیوں کی غلامی میں چلا جائے گا۔ یہاں کی صنعت و معیشت تباہ ہو جائے گی۔ تمہارے پسینے اور خون کی گرمی انگریزوں کے چہرے پر جھلے گی۔ تم اور تمہاری نسلیں اس ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز کی ایک ایک گانچ کو ترسیں گی؟"

سلطان کھڑا ہو گیا۔ تلوار پر تلے میں ڈالی اور دونوں ہتھوڑے پر مولے ہو گیا، اور ڈھکی نامی دروازے سے باہر نکلا۔ سلطان کے امراء اور ذرا ودا دیا صراحتاً منتشر ہو گئے۔ سلطان کے باہر نکلنے ہی میر صادق نے ڈھکی دروازے کو بند کر دیا اور ذرا عظم کی حیثیت سے پہرے دادوں کو حکم دیا: "خبردار جو یہ دروازہ اب کھولا گیا۔ وہ سلطان ہی کیونکہ نہ ہو یہ دروازہ اب کسی کے لئے بھی نہ کھلے گا کیونکہ کئی بھروسہ نہیں، سلطان کے پہلے کون یہاں داخل ہونے کی کوشش کرے؟"

ان ہدایات کے بعد میر صادق شہر کی مشرقی سمت روانہ ہو گیا۔ جہاں اس کی کوٹھی تھی، میر صادق فاتحین کو اپنی کوششیں آمید یہ کہنا چاہتا تھا۔

ڈھکی دروازے کا احمد خان نامی ایک دقا دار سپاہی میر صادق کے احکامات کو شک و شبہ سے سن کر اس کے تعاقب میں لگ گیا، پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ میر صادق، سلطان کے عقب میں محاذ جنگ پر جلتے گا لیکن جب اس نے اس غدار کو اپنی کوٹھی، علاقہ کو گھام کی طرف جاتے دیکھا تو گھوڑے کو راڑ لگا کر اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسے لٹکا کر: "ادقا دار کہاں جاتا ہے؟" میر صادق نے پلٹ کر دیکھا۔ احمد خان کی تلوار بجلی کی طرح کوٹھی اور میر

صادق کا سراٹھ کر دایس آگئی۔ میر صادق کا بے جان لاشہ گھوڑے سے گر کر پھڑکنے لگا۔ سلطان اپنے محافظ دستے کے ساتھ شہر کے شمال مغربی حصے میں دہلی دروازے پر پہنچا۔ یہاں اس کی ایک انگریزی دستے سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ اس کے امراء جنگ میں شریک نہ ہونے کی بجائے، دوسرے بحال ہلا ہلا کر انگریزوں کو یہ بتا رہے تھے کہ سلطان میدان میں آچکا ہے اسے فدا ہی محاصرے میں لے کر کھیل ختم کیا جاسکتا ہے۔ کسی دفتار نے اطلاع دی: "قبلہ عالم! انگریزی سپاہ جنوبی اور جنوب مغربی فصیل سے اندر داخل ہو چکی ہے۔"

سلطان نے غضب ناک ہو کر پوچھا: "میر معین الدین کیا کر رہا ہے۔ اور وہاں کی سپاہ کہاں چلی گئی؟" عجز سے عرض کیا: "میر معین الدین کا کچھ بہت نہیں امدان محاذوں کی سپاہ کو پورے نیلے تختیاب دینے کے پہلے مدد گھنٹے پہلے ہی اپنے پاس بلا لیا ہے۔"

انگریزوں کا دیوار بڑھتا جا رہا تھا۔ سلطان کے محافظ ایک ایک کر کے شہید ہوتے جا رہے تھے، جب اس محاذ کو باقو سے نکلنے دیکھا تو سلطان غصے سے دہوازے پر دایس آیا۔ لیکن یہ بہتر ہو چکا تھا۔ سلطان نے اسے کھولنے کا حکم دیا تو کسی غدار نے اندر سے کہا: "دردانہ نہیں کھل سکتا۔ حضور والا خود کو انگریزی سپاہ کے حوالے کر دیں!"

سلطان دانت پیستا، حقے میں شہر کے شرق میں بڑے دروازے کی طرف بڑھتا اس کے داتین طرف اس کا محل تھا جس کے ارد گرد بارود کی سرنگ بھی ہوئی تھی، سلطان اپنے محل کو اٹا دینا چاہتا تھا لیکن ان ہنگامی حالت میں اسے اس کا موقع نہ ملا سکا۔

جب وہ شہر کے بڑے دروازے پر پہنچا اس وقت مشرقی فصیل سے بھی انگریزی سپاہ اندر داخل ہو چکی تھی اب وہ تین طرف سے محصور ہو چکا تھا۔ مشرق، مغرب اور جنوب سے آتے والی انگریزی افواج نے اسے گھیرے ہوئے لیا۔ سلطان نے بھیڑ بندوق کشش کی کہ بڑے دروازے میں داخل ہو کر دوسری طرف نکل جلتے لیکن یہاں بڑا ہجوم تھا۔ سلطان گویاں چلاتا آگے بڑھتا ہوا ایک ایک گولی سلطان کے سپاہیے بازو میں پیوست ہو گئی۔ سلطان تین چار قدم آگے بڑھ گیا اور دوسری بازو کو دہانے کی کوشش کی لیکن دوسری گولی پھر وہیں پیوست ہو گئی اور گھوڑا بھی زخمی ہو گیا۔ راجا خان نامی ایک سردار اس کے ساتھ تھا۔ سلطان نے راجا خان سے کہا: "اہم زخمی ہو گئے ہیں، اس گھوڑے سے اتار لو اور حضور سے پانی کا انتظام کرو دو۔"

راجا خان نے کہا: "حضور والا! اب مقابلے کا وقت نہیں رہا۔ بہتر یہ ہے کہ حضرت

خود کو انگریزوں پر ظاہر کر دیں۔

سلطان نے حقارت سے کہا: ”کیا تم ویلوانے ہو گئے ہو، خاموش رہو! کیا تم نہیں جانتے کہ گیدڑ کی ضد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے!“

راجا خان نے سلطان کو گھوڑے سے اتارنا چاہا لیکن وزن برداشت نہ کر سکا اور وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر پڑھیر ہو گئے۔ سلطان کے دوسرے خاندانوں نے اسے ایک پالکی میں لٹا دیا۔ اس دوران انگریزی سپاہ چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ ایک انگریز سپاہی سلطان کی پالکی کے قریب پہنچا اور اس کی پیٹھی اور شمشیر پر قبضہ کرنا چاہا۔ سلطان نے تلوار کے بھر پور وار سے انگریز کو لنگھ کر دیا۔ انگریز سپاہی نے اسے گرتے گرتے اپنی بھری ہوئی ہندو سلطان پر خالی کر دی، اور شام مشرق کے بقول ملت اسلامیہ ہند کی ترکش کا خدنگ، آئینہ سر بھی غداروں کے ہاتھوں ضائع کیا۔ ٹیپو، جس نے کئی بار اپنے دشمنوں کی متحدہ قوتوں کو شکست دی تھی، اپنے دوستوں اور منصب داروں کے اعتبار اور اعتماد پر شہید ہو گیا۔ سیٹھ دالوں نے اپنے ناخدا کو طوفان کی ہلاکت خیز لہروں کے حملے کے، بخوشی غیر ملکیوں کی زنجیر غلامی اپنے گلے میں ڈال لی تھی۔ کوئی نہیں جانتا کہ انگریزوں کے دل اور حیثیت مذہبی کے پیکر ٹیپو کو اپنے منصوبے میں کیا بی حاصل ہو جاتی تو برصغیر کا کیا نقشہ کیسا ہوتا، جس انگریز سپاہی نے سلطان کو شہید کیا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ اس نے اپنی چند گولیوں سے طرہ کچھ سو سال کے تھے ہندوستان کی آزادی سلب کر لی ہے کیونکہ ٹیپو کے بعد پھر ایسا شجاع اور خیرت مند بیوت ہندوستان سے نہیں پیدا کیا۔

سلطان کی اور کھلی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی محسوس اور بے کسی زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ آہ میں وہ جلا ہوا کھنڈر ہوں جسے گھر والوں ایسے جلا کر تباہ و برباد کر دیا۔

ایک انگریز افسر چند سپاہیوں کے ساتھ محل کے دروازے پر پہنچا۔ ایک سفید جھنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے محل کے حفاظتی دستے سے کہا: ”اب جنگ ختم ہو چکی محل کا دروازہ کھول دو اور سلطان کو ہمارے حوالے کر دو۔“

حفاظتی دستے کے افسر نے کہا: ”سلطان کے حکم کے بغیر دروازہ نہیں کھل سکتا!“ انگریز افسر نے سفید جھنڈا اٹھاتے ہوئے کہا: ”یہ اس کا جھنڈا ہے، دروازہ کھول دو!“ انگریز افسر نے محافظ افسر کی یقین دہانی کے لئے اپنا تلوار نیام سے نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ محافظ اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد محل کا دروازہ کھل گیا اور انگریزوں نے سلطان کو سر کیس تلاش کر ڈالا لیکن سلطان نہیں ملا۔

قلعہ دار نے عرض کیا: ”جناب والا، سلطان محل میں نہیں ہے بلکہ یہ معلوم ہوا ہے کہ

وہ قلعہ کی اندرونی تفصیل کے بڑے مددگار بنے۔ پھر زخمی پڑا ہوا ہے۔  
انگریز افسر نے غصے میں کہا: ”اگر تیری یہ اطلاع غلط نکلی تو تجھے قتل کر دیا جائے گا۔“  
شام ہو چکی تھی اور پھر یہ شام رات کی سیاہی میں غائب ہو گئی۔ مشعلیں لٹے انگریز افسر  
قلعہ کے بڑے مددگار سے پرہیز نہیں کیا۔ انہوں نے ڈھیر لگا ہوا قتل گاہوں کو کھینچ کھینچ کر سلطان کو  
تلاش کیا جانے لگا۔ یہیں راجا خان بھی زخمی پڑا ہوا تھا۔ چپ سپاہیوں نے اسے ٹانگ پر بٹھا کر گھسیٹا  
تو وہ چلا یا۔ ”صاحبان! میں زندہ ہوں تم کسے تلاش کر رہے ہو؟“

قلعہ دار نے جواب دیا: ”قبلہ عالم کہاں ہیں؟“  
راجا خان نے جواب دیا: ”وہ تو جان بحق ہو چکے؟“  
انگریز افسر نے بے چینی سے پوچھا: ”سلطان کی لاش کہاں ہے؟“

راجا خان نے انہیں سلطان کی لاش کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا۔ قلعہ دار نے لاش کو  
بیچان لیا اور زاد و قطار دوڑنے لگا۔ اس وقت بھی سلطان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لاشوں کی  
کا بجائی کر لے کر لڑی بھی دہیں موجود تھا اسے شبہ نہ تھا کہ سلطان ابھی زندہ ہے۔ اس نے جلدی سے سلطان  
کی بعض دیکھی، ہاتھ کو گرم تھا لیکن بعض سالت تھی۔ سلطان کے جسم پر گولیوں کے چار زخم موجود تھے  
تین جسم کے مختلف حصوں پر ایک سیدھے کان کے نیچے اس وقت سلطان جسم پر سفید قمیض اور  
پھولدار پھینٹ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور ایک سرخ روشنی کپڑے سے کمر کس رکھی تھی۔

انوار انگریز کی جہز ہارس کے حکم پر سلطان کی لاش کی تجویز دیکھیں ہوئی تشریف آوروں اور  
ندیموں نے لاش کا آخری دیدار کیا۔ سلطان کے جنازے کے ساتھ مقامی لوگوں کے علاوہ انگریزوں  
کی چار کھینچاں بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھیں، نواب حیدر علی کی قبر کے پاس یہ عجم گھڑ گیا۔ یہیں خاتون  
جنازہ پڑھی گئی جہز ہارس بھی یہیں پہنچ گیا۔ سلطان کی لاش کو دیکھ کر فرط غم میں چلا یا۔ آج  
سے ہندوستان ہمارا ہے۔“

انگریز کھینچاں دودھ و صف بستہ کھڑی ہو گئیں، سلطان کا جنازہ ان کے درمیان سے  
گزار کر قریب تک پہنچا یا گیا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ کھڑی ویرانہ کی چمک  
اندھ لاک شروع ہو گئی۔

پھر فوج کو آخری سلامی کا حکم دیا گیا۔ چند دقیقے سر ہو تین، مانتی تو ہیں چھوٹے لیکن  
اور اس کے ساتھ ہی بادلوں اور بجلی کی چمک کر دک میں شدت پیدا ہو گئی، اس قدرتی توپ کے  
آواز میں اتنی شدید تھیں کہ انگریز توپوں کی آوازیں دب گئیں، سلطان کے دیوان خانے، محل سرا

اور سلطان کی تعمیر کردہ مسجد اعلیٰ پر بجلی گری۔ اس بجلی سے انگریزی کیمپ بھی نہ بچا، جس سے دونوں افراد چند سہاوی ہلاک ہو گئے۔

مرنگا پٹم پر پوری طرح قابض ہو جانے کے بعد انگریزوں نے میر قمر الدین اور پورنیا کو شہزادہ فتح حیدر کے پاس مدد مانگ لیا کہ وہ دونوں شہزادے کو سمجھا بھگا کر جنگ سے باز رکھیں۔

شہزادہ فتح حیدر اپنے باپ کی شہادت کی خبر سن چکا تھا۔ جب پورنیا اور قمر الدین اس کے پاس پہنچے تو اس نے دریافت کیا۔ ”اب تم لوگ دوسرے یا اس کیوں آتے ہو؟“  
پورنیا نے میر عجز چھکا کر عرض کیا۔ ”صاحب عالم! جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب جنگ فضول ہے اگر آپ انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ ہو سنا تو آپ کو حکومت مل سکتی ہے!“  
قمر الدین نے کہا۔ ”مجھ سے انگریز اسروں نے یہ وعدہ کیلے کہ اگر شہزادے نے جنگ نہ کی تو شہید سلطان کی حکومت آپ کے حوالے کر دی جائے گی!“

شہزادے نے جہاں خان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کیا کہتے ہو؟“  
ملک جہاں خان نے کہا۔ ”آپ چاہیں تو ان فکاردوں کی باتوں پر اعتبار کریں، دندنہ میری ناقص رشتہ تو یہ کہتی ہے کہ گمرنگا پٹم نکل گیلے تو پروا نہیں، ابھی سلطنتِ خدا باد کے دوسرے قلعوں سے جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے، اور میں شہزادے کو یہ یقین دلانے پر تیار ہوں کہ زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ دوں گا!“

لیکن شہزادہ انگریزوں سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شہزادہ اپنی فوج کو پورنیا اور قمر الدین کے ساتھ لے کر مرنگا پٹم انگریزوں کی اطاعت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

ملک جہاں خان باہر نکلا اور مدد کی کوساٹھ لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے جلتے جلتے شہزادے سے کہا۔ ”شہزادے! میں ان فکاردوں پر اعتماد نہیں کر سکتا اس لئے مجبوراً شہزادے کا ساتھ نہیں دے سکتا!“

کیشن کے سامنے جب یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ حقے بجزوں کے بعد بچا کھپا حقہ کس کے حوالے کیا جائے تو بعض انگریز اسروں نے سلطان کے کھوپڑیے کو تخت نشین کر دینے کی سازش کی اس موقع پر سلطان کے امیر البحر میر غلام علی نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ ”سانپ کو ہلاک کر کے اس کے کپڑوں کی پروا نہ کرنا کہاں کی عقل مندی ہے!“

لیکن پورنیا نے ادب سے عرض کیا۔ ”جناب دالا! ریاستِ میسور اڑتیس سال پہلے ایک چند ریاست تھی، اس ریاست کے حقیقی دولت ابھی موجود ہیں کیوں نہ یہ ریاست انہی کے

حوالے کنڈی جاتے!

انگریزوں نے پورنیا کی بات مان لی اور یہ ست قدیم ہندو راجا کے خاندان کے حوالے  
کنڈی گئی اور پورنیا کو اس ریاست کا دیوان مقرر کر دیا گیا۔  
نڈاری کے صلے میں میر غلام علی کی تین ہزار طلالی پگڑا مانا ہانہ پنشن مقرر ہوئی جسے  
دہ بارہ سال تک وصول کرنا ہوا۔

میر معین الدین اس رشتے کے ہنڈے ہی میں مارا گیا۔ میر قمر الدین سپہ سالار انوار سلطان  
کو گرم کنڈہ کی جاگیر عطا کی گئی جہاں وہ مرض جذام میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ میر صادق کی قبر پر لوگ جا جا  
کر ٹھوکنے اور غلاظت کے ڈھیر لگانے لگے۔

ملک جہاں خان اس موقع پر مری گئے سے نکلا تھا کہ وہ کچھ ساتھی فراہم کر کے انگریزوں  
کو تنگ کرنا ہے گا اور روزی اس امید پر اس کے ساتھ ہو گئی تھی کہ شاید ان تازک حالات میں  
یہ بہادر انسان قیدی پامر کو رہا کر دے کیونکہ اس کا خیالی تھا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن  
محببت زدہ ایکساں محبت کے ہاتھوں دو سمت ہو جاتے ہیں۔

وہ ادنیٰ جی بھی پہاڑیوں کی پرمیچ راہیں طے کرنا سسرور کی جنوبی حدود سے گزر کر نیلگری  
میں داخل ہوا تو روزی نے خوشخبرہ ہو کر دریافت کیا: ”ملک جہاں خان! یہ تم مجھے کہاں لے سنا  
رہے ہو؟“

فاموش اپنے سیاہوں میں کھوتے ہوئے جہاں خان نے مڑاٹھایا اور بے حسی انداز میں  
پہاڑی سلسلے پر نظر پڑا جاکر بولا: ”تمہارے محبوب پامر کے پاس!“  
روزی کا ماتے خوشی کے چہرے دھتے لگا بے تامل سے دریافت کیا: ”وہ کہاں ہے؟“  
”گھڑا نہیں، میں تمہیں وہیں لے چلا رہا ہوں!“

جب وہ کنڈی کو لے کر اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں پامر کی لاش چھوڑ گیا تھا تو  
وہ گھوڑے سے اتر پڑا اور ہاتھوں کا سہارا دے کر روزی کو بھی اتار دیا۔ روزی کو جہاں خان کی  
نیت پر شبہ نہ رہا۔ اس نے سمجھتے ہوئے لمبے میں پوچھا: ”تم یہاں کیوں رک گئے؟“  
جہاں خان نے کہا: ”میں پامر کو یہیں چھوڑ گیا تھا!“

روزی نے بے چینی سے کہا: ”یہاں کہاں، یہاں تو کوئی سر چھپانے کی جگہ تک  
ہنسیں؟“

”ہاں روزی تم صبح کہہ رہی ہو“ پھر ایک طرف جانا ہوا بولا: ”اُدھر آدھرتے ساتھ رہنا“  
مجھے یقین ہے کہ میں پامر کو مزید تلاش کر لیں گا تم مایوس نہ ہو!“

مردی اب بھی اس کی طرف سے مطمئن نہ تھی اس کے خیال میں آج جہاں خان گمراہ ہو گیا تھا اودہ اس کی عزت ابرو لوٹنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش میں تھا۔  
 وہ بھاگ کر ایک کھلی جگہ پر چلی گئی، بولی: "میں کہیں نہیں جاؤں گی، آخر تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

جہاں خان نے ہوتے بیچنے لئے، بولا: "ناراض لڑکی! مجھ پر شک نہ کر، میں یہاں پتھر پامر کی تلاش میں آیا ہوں؟"

مذی آہی ہوئی ارد گرد کھڑی رہی، ادھر جہاں خان تھا ادھر ادھر گھومتا پھر تارہا ایک دیو دار کے سلسلے میں پتھریوں کا ایک پیچر اس طرح بڑا تھا کہ اس کا سر ایک نیم مدد پر پتھر کے نیچے لٹک رہا تھا اوجیم کے دوسرے اعضا جنگلی دند سے نوج نوج کھٹکے تھے، اسی نے جھک کر پیچر کے شانے کی پٹری کے اس نشان کو تلاش کیا جو اس کی گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ وہاں کی پٹری چھڑی ہوئی تھی پھر اس نے زخمی پنڈلی کا نشان بھی تلاش کر لیا اور جیتنا ہوا درزی کے طرف دوڑا۔

مذی جلدی آؤں تمہارا پامر مل گیا۔ ادھر آؤں۔ یہاں دیکھو۔ دیکھو یہاں دیو دار کے نیچے تمہارا پامر پڑا ہوا ہے!"

مذی سہمی ہوئی دل نہ چاہنے کے یاد جو جہاں خان کے پاس چلی گئی۔ جہاں خان نے اسے پتھریوں کے پیچر کے سر ہلنے کھڑا کر دیا اور کہا: "یہ رہا تمہارا پامر، اگر وہاں سکتی ہو تو جیساں لو؟" مذی کو یہی بار اس بات کا احساس ہوا کہ شاید جہاں خان کا دماغی توازن جاتا رہا ہے، مدد سے تو کچھ بھی نہ بولی میں رحم آمیز نظروں سے جہاں خان کو دیکھنے لگی۔

جہاں خان نے تھڑے تھڑے غمزہ لہجے میں پامر سے مقابلے کی ساری مدد ادیان کر دی، اس کے بعد بولا: "میں اسے یہیں بے گورد کھنچوڑ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں سالوا بعد بھی یہاں آؤں گا تو اس کا پیچر میں کہیں مل ضرور ملے گا۔ کیونکہ یہاں کون ہے جو کسی کے پیچر کو تکفین کرے؟"

مذی نے یقین نہ کرتے کے انداز میں پوچھا: "لیکن تم ہمیشہ یہ بات چھیپاتے کیوں کہتے؟"

جہاں خان نے جواب دیا: "صرف اس لئے کہ مجھ سے غلطی میں جو سر نہ ہو گیا تھا۔ تم پر اس کا اظہار کر کے تمہیں دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا؟"

مذی نے کہا: "لیکن اب بھی میں یہ کس طرح یقین کر لوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو"



وہ بے رحم ہے! ” تمہاری مرضی؟ ” جہاں خان نے کہا۔ ” یقین نہ کرنے سے تم زندگی بھر باہر کا انتظار کرتی رہو گی اور کچھ نہیں ” اور میں تمہیں انتظار کی ان جان لیوا ساعتوں سے بچانا چاہتا ہوں! ”  
 روزی آہستہ آہستہ مدتی مدتی، سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا نیلگوں آسمان، اپنے بے کراں خلا اور لامتناہی وسعتوں سے روزی کی تنہائی اور دل کے خلا میں گھاؤ ڈال رہا تھا۔  
 جہاں خان نے اچانک بیچھا پھرتے والے انداز میں سوال کیا۔ ” اب تم سارا کیا

ابادہ ہے؟ ”  
 روزی ہلکا ہلکا اس کی صورت دیکھنے لگی، بولی: ” میں کیا بتاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا! ”  
 جہاں خان نے کہا۔ ” میں تمہیں کالی کٹ لئے چلتا ہوں، وہاں تمہیں کسی سحری جہاز میں بیٹھا کر فرانس روانہ کر دوں گا۔ تم اپنے وطن واپس جاؤ کیونکہ اب فرانس واپس آنے کے لئے اس ملک میں کوئی گنجائش نہیں رہی! ”  
 مدوزی کی نیت کچھ اور تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن نہیں کہہ سکی بولی۔ ” اگر میں نہیں اسی ملک میں رہتا چاہوں تو؟ ”

جہاں خان نے کہا۔ ” یہاں تم کس کے پاس رہو گی؟ ”  
 مدوزی نے پوچھا۔ ” تم کہاں جاؤ گے؟ ”  
 جہاں خان نے جواب دیا۔ ” کچھ پتہ نہیں، لیکن یہ طے ہے کہ ان حالات میں، میں سے خاندان نہیں بنا سکتا! ”

مدوزی نے کہا۔ ” پھر تم مجھے کالی کٹ پہنچا دو، میں وطن واپس جاؤں گی؟ ”  
 جہاں خان نے اسے کالی کٹ پہنچا دیا وہاں اس نے مدوزی کو ایک تجارتی جہاز پر سوار کر کے فرانسیسی مقبوضہ مڈوفا سکر بھیج دیا۔ مڈوفا سکر سے فرانسیسی حکومت نے اسے فرانس روانہ کر دیا۔ جہاں وہ نارمنڈی کے شہر رن چلی گئی وہاں اس کا آبائی مکان اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہندوستان سے چلتے وقت جہاں خان کو اپنا رن کا پتہ دے دیا تھا جسے اس نے بے دلی سے لے لیا تھا۔

کالی کٹ سے قاتیب ہو کر، کچھ عرصے بعد جہاں خان بیس بیس ہزار سواروں کے ساتھ مرہٹوں کی سرحد پر نمودار ہوا اعدان کے سردار کو کھلے اور پر سر مل کے سردن کو نیزے پر چڑھا کر سلطان شہید کے تختوں کو برباد کیا۔ انگریز اس کی تلاش میں اپنی فوجیں لے کر گرداں لہے لیکن جہاں خان کے پاس چونکہ کوئی قلعہ یا قطعہ زمین نہ تھا اس لئے یہ آوارہ گرد چھاپہ مار کوہستانی

سلسلوں اور جنگوں کی خاک چھانتا ہوا، لچانک یوں غائب ہوا کہ تاریخ اس کے انجام کی سچی نشان دہی سے آج تک قاصر ہے۔

دوسری طرف لدن میں، دریائے سین کے کنارے روزی یہ اس نگاہ سے جیتی رہی کہ ہو سکتا ہے کسی دن پائزل سے تلاش کرتا ہوا لدن پہنچ کر اسے ششدر کر دے اور اس کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جائیں، روزی کے دل میں کہیں جہاں خان بھی سر جوڑ تھا جیسے اس نے چلتے وقت اپنا پتہ دے دیا تھا۔ روزی کا خیال تھا کہ یہ آوارہ گرد، مایوس ترین انسان، ممکن ہے کسی دن انتہائے ناامیدی اور روزی کی محبت میں فرانس کا رخ کرے، اور اپنی بقیہ زندگی روزی کی قربت میں گزارنے پر آمادہ ہو جائے لیکن یہ دونوں ہی بے وقافتے انسانوں نے روزی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انتظار کی کشاکش میں مبتلا رکھا۔

(ختم شد)

